

محمد اختر مموز کا

# سفرتک درویشوں کا

**PDFBOOKSFREE.PK**



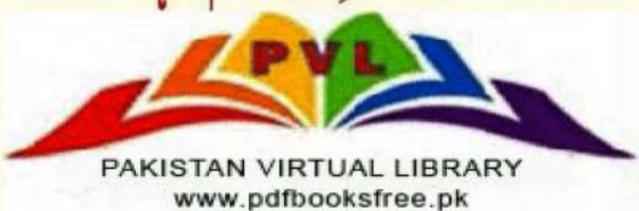
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## معزز قارئین توجہ فرمائیں!

پاکستان ورچوئل لائبریری پر موجود تمام کتابیں  
قارئین کے مطالعے اور دعویٰ و اصلاحی مقاصد کے  
لئے اپلوڈ کی جاتی ہیں۔

### تنبیہ

کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر  
استعمال کرنے کی سخت ممانعت ہے، اور ان کتب کو  
تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی  
، قانونی و شرعاً جرم ہے۔



## ترتیب

۷	-----	پہلی بات
۱۱	-----	تحالی لینڈ
۶۳	-----	سنگا پور
۸۷	-----	ملیشیاء
۱۰۷	-----	اندرونیشا
۱۳۷	-----	آسٹریلیا
۱۴۷	-----	چاپان
۲۱۷	-----	فلپائنز

## پہلی بات

۱۹۷۰ء کی بات ہے۔ میں گلبرگ مارکیٹ کے ایک موچی کے تھرے پر بیٹھا اپنے ”رک سیک“ کی مرمت کرو رہا تھا۔ تاکہ حسب معمول گرمیوں میں یورپ کے سفر پر نکل سکوں کہ ہمارے علاقے کے ڈاکٹے نے اپنی سائیکل کو بریک لگائی اور خاکی رنگ کے لفافے میں بند ایک رجڑو، خط مجھے تھا دیا۔ ہم ٹھہرے پینڈو پیچے، خاکی وردی اور خاکی لفافہ دیکھتے ہی خاک میں مل جاتے ہیں۔ اگر یہی خاکی لفافہ مجھے گاؤں میں وصول ہوتا تو یقیناً لفافہ کھولے بغیر ہی دہان کرام مجھے جالتے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ امتحان میں کامیابی کی خوشخبری سنانے کے لئے میں نے بہاول گور میں کسی صاحب کو فون کیا تاکہ وہ یہ اطلاع میرے گاؤں تک پہنچا دیں۔ بہاول گور سے پہنچنے میں دور جب گاؤں میں میرے فون کی خبر پہنچی تو کچھ یوں پہنچی —— ”لور اچ اختر خون کیتا اے“ یعنی لاہور میں اختر نے قتل کر دیا ہے۔ اور یوں میرا معصوم سا فون، خون بن گیا۔

ان وسوسوں کے باوجود ڈرتے ڈرتے خاکی لفافہ کھولا تو معلوم ہوا کہ ملک قاسم کی ایک سالہ پرانی سفارش نے رنگ دکھایا اور شاکر المدرانی نے مجھے پی۔ آئی۔ اے میں مارکینگ آفیسر مقرر کر لیا تھا۔ میری ٹینگنگ کلاس میں اور بھی سات لوگ شامل تھے۔ جن سے کہیں شرمندہ تھا کیونکہ میں سفارشی تھا۔ مگر بعد میں احساس ہوا کہ حمام میں سب ننگے ہیں۔ میری مراد سفارشی ننگوں سے ہے۔ دیسے تو ہماری کلاس میں

مگر نے لگے سختی اور دیانتدار کارکوں پر جلس طپارٹمنٹ کے نا اہل افروں نے اپنی گرفت مجبوط کر لی تھی۔ خود دار افسر مشکل میں تھے۔ پس آئی اے کا کام کرنے کی بجائے بڑے افروں کے گروں میں بزیار پہنچانے والے ترقی پانے لگے۔ ایم اسلم خان جیسے پروفیشنل گوشہ نشین کر دیے گئے۔ اسلم آر خان جیسے دبک افسر کہنی چھوڑ گئے۔ اور ارشد مسعود جیسے ذہن افروں کو پی آئی لے چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔ یہ پی آئی اے کا بد ترین دور تھا۔ لہذا تینوں درویشوں نے ”بھرا میلہ“ چھوڑنے کا یک لخت فصلہ کیا اور اپنے اپنے کاروبار شروع کر دیئے۔

درویش اول اپنی زمینوں پر ڈیرہ غازی خان لوٹ گیا۔ اور بھیڑ بکریوں کا فارم کھول لیا۔ جب دریش دوم نے درویش اول کے اس نئے پروفیشن کے بارے میں سنا تو اس نے کہا کہ ”خدا درویش اول جیسے بھیڑیے سے بھیڑوں کو محفوظ رکھے۔“

درویش دوم، کینیا میں قیام پذیر ہو گیا اور سنا ہے کہ ہاتھی پالنے اور ہاتھی دانت بینچے کاروبار شروع کر لیا ہے۔ درویش اول نے درویش دوم کے پروفیشن پر تبرہ کرتے ہوئے صدق دل سے دعا کی کہ ”خدا درویش دوم جیسے بھالو سے ہاتھیوں کو محفوظ رکھے۔“

میں نے انڈس گایڈز کے نام سے ایک سیاحتی ادارہ شروع کیا ہے جو غیر ملکی سیاحوں کو پاکستان کے چیزیں کی سیر کرتا ہے۔ میرے اس معصوم سے پروفیشن پر بھی دونوں درویشوں نے مجھے بد دعا دی اور کہا کہ ”خدا سیاحوں کو درویش سوم جیسے لیچر سے محفوظ رکھے۔“

کتاب کا نام میرا من دلوی کے ”قصہ چار درویش“ سے متاثر ہو کر، ”سفر تین درویشوں کا“ رکھا گیا ہے۔ ”مونو“ سفر نامے تو اردو ادب میں موجود ہیں اور سفر ناموں کو پاپولر ادب بنانے میں مستنصر حسین تارڑ کی بہت بڑی ”کنز پیوشن“ بھی ہے۔ مگر تین سیاحوں کا سفر، ان کے اپنے کارو، ہر کوار کا اپنا تجربہ، ایکش اور ری ایکش، یہ اردو ادب میں پہلی کوشش ہے۔ اگر پسند آجائے تو حوصلہ افزائی ہو گی اور

ایک لڑکی بھی تھی۔ درویش دوم، سید محمد غالب سے میری پہلی ملاقات پی آئی اے کی مارکینگ کلاس میں ہوئی جو بعد میں دوستی میں بدل گئی۔

ایف۔ سی۔ کالج کے سچ پر آغا سعیل کا لکھا، تاریخی ڈرامہ رگ سنگ پیش کیا جا رہا تھا۔ ملاح الدین لغاری، مغل شہنشاہ جہانگیر کے کوار میں دربار سجائے، تخت پر بیٹھا تھا۔ میں منگل سنگ کے روپ میں زنجیروں میں جکڑا اس کے دربار میں پیش تھا۔ ڈرامہ ”کلامکس“ پر تھا جب لغاری اپنے مکالے بھول گیا۔ اس نے زور دار تالی بھائی اور دربار برخاست کر دیا۔

ملاح الدین لغاری ڈیرہ غازی خان کا رہنے والا ہے۔ اور وہاں کے لغاریوں کی سیاسی پیغام چونکہ ہم لوگوں سے بہت زیادہ تھی۔ اسی لیے وہ پی آئی اے میں بھرتی تو ہمارے ساتھ ہی ہوا۔ مگر سید حاٹھیگنگ ڈائریکٹر کی سیکریٹریٹ میں جا پہنچا۔ ملاح الدین لغاری، ”سفر تین درویشوں کا“ درویش اول ہے۔

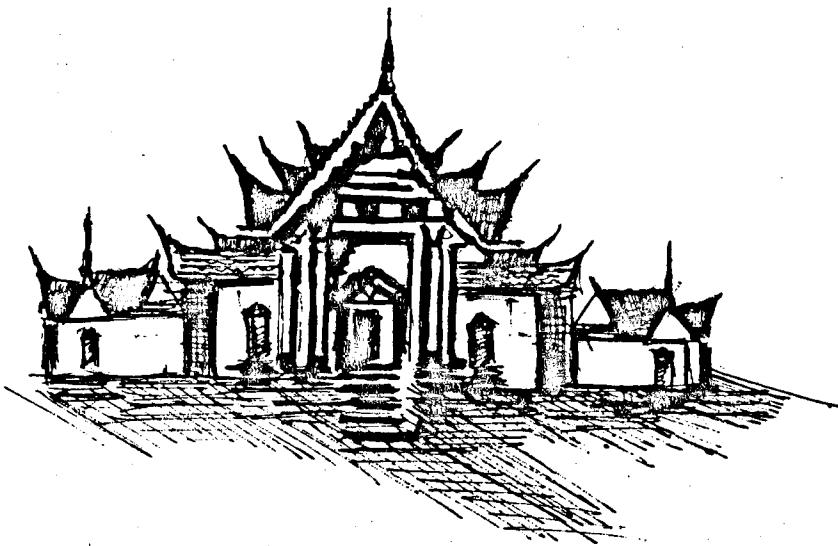
ہم تینوں دوستوں نے پی۔ آئی۔ اے میں ملازمت کے دوران بے شمار سفر کے اور ہمیشہ اکٹھے سفر کئے۔ یہ کتاب ان خوشنگوار یادوں کی یاد میں لکھی گئی ہے۔ ان سفروں میں جو کچھ ہوا، جیسے ہوا اور جس جس سے سرزد ہوا اسے دیبا ہی لکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب کا کوئی کدار فرضی نہیں۔ اور کوئی قصہ من گھرست نہیں۔ البتہ کداروں اور قصوں کو پیش کرنے کا انداز میرا اپنا ہے۔ میں لغاری اور غالب دونوں کا بے حد منون ہوں کہ انہوں نے اپنی بیویوں کے غیض و غصب کی پرواہ کئے بغیر، مجھے سب کچھ لکھنے کی اجازت دے دی۔ اور میں نے ان کی اجازت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کئی ایک ایسی بدنامیاں بھی ان کے نام منسوب کر دی ہیں۔ جن سے ان کا کوئی واسطہ نہیں۔

۱۹۸۳ء تک ہم تینوں درویشوں نے پی آئی اے کی مارکینگ ڈپارٹمنٹ میں کام کیا اور اپنے زور بازو سے خاطر خواہ ترقی بھی کی۔ درویش اول سکنڈی ندویا میں پی آئی اے کا میسٹر بنا دیا گیا۔ دریش دوم کینیا میں اور مجھے مصر میں میسٹر بنا دیا گیا۔ مگر پاکستان کے اس میں الاقوامی ادارے میں حالات تیزی سے

اگر ناپسند ہو تو فکر کی بات نہیں۔ اگلی ایڈیشن میں اپنے علاوہ دونوں درویشوں کو گول کر دیں گے۔

# تحانی لینڈ

محمد اختر موسوی  
لہور  
۱۹۹۳ء



## بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تین امرکی خلابازوں کا چاند کا سفر اس صدی کا پڑا کارنامہ ضرور سی مگر سفر تین درویشوں کا گرد نصف کہ ارض بھی اپنی نوعیت کا واحد کارنامہ ہے۔ خلابازوں کے سفر کے لیے امرکی سریا یہ اور درویشوں کے سفر کے لئے ان کی اپنی عی جیب بے مایہ۔ خلاباز تو چاند چکوری کے رشتے توڑ کر لوئے، مگر درویش چکوریوں سے رشتے جوڑ کر لوئے۔ ان کا مشرق سے مشرق بعید کا سفر ان گئ۔ کمانیوں اور لا تعداد حاتموں کا نجور ہے۔ تین یاری بے یارو مدد گائیں یا گئے لوگ انجانے شہر پرائے دلیں... اور درویش....

درویش اول عمر کا پختہ اور قد کا پست تھا۔ چنان تو ایسا گمان ہوتا جیسے جپانی کھلوٹے کو چابی دیکر چھوڑ دیا جائے۔ اسکا بلانگ پیچر نما چڑھو شروع ہوتا تو پیشانی کی حدود کو پار کرتا ہوا چوٹی تک چلا جاتا۔ درحقیقت اس کی پیشانی، چرسے اور سر کے درمیان تنازعہ علاقہ تھی۔ کبھی ہوا شرارت کرتی تو اس کی قلیل ہی زلفیں بکھر جاتیں اور چرسے سے سر تک ایک وسیع چیل میدان سا پیش نظر ہو جاتا۔ درویش اول فوراً ہوا پر لکھنی کا جوابی محلہ کرتے ہوئے اپنی خوش بخت پیشانی پر زلف کا جال سا بچا دھتا اور یوں مجنوا کملانے سے بال بال نجع جاتا۔

درویش دوم، قد میں سب سے چھوٹا اور جسم میں سب سے موٹا تھا۔ چکوئے کی

کو غور سے دیکھنے لگا۔ دراصل پاسپورٹ میں تصویر اس زمانے کی تھی جب موصوف شیر خوار تھے۔ اب خیر سے اچھے خاصے خونخوار بن گئے تھے، مگر تصویر وہی پرانی... پس والے نے قائد اعظم کا بھرم رکھتے ہوئے بس جانے ہی دیا... اور دردیشوں نے جہاز میں پہنچ کر سکھ کا سائنس لیا۔

اس سفر میں درویش سوم کا درجہ میرا تھا۔ دونوں دردیشوں کا سامان اٹھانا اور غصہ برداشت کرنا میری ڈیوٹی میں شامل تھا۔ چنانچہ درویش اول کا بریف کیس اور کیرو، درویش دوم کا تھرماں اور شیو کا بھدا ساتھیلا میرا، مسٹر تھا۔ اور میں سامان کی لڑیوں میں کٹرے کی طرح جکڑا جہاز میں داخل ہوا۔

درویش اول نے "آئیل" اور درویش دوم نے کمرکی والی سیٹ سنجالی اور الٹینان سے بیٹھے گئے۔ مگر میں ان کا سامان سنجالے بدھاں مسافروں سے پچتا چھاتا ابھی تک راستے ہی میں بھلک رہا تھا۔ درویش دوم کمرکی سے ناک چپکائے جذباتی ہو کر ہوائی اٹے کے عملے تک کو ہاتھ ہلا ہلا کر بار بار الوداع کئے جا رہا تھا۔ اور درویش اول ہر آئیوالی ایز ہوش کو دیکھ کر اخبار تان لیتا، مگر ہر جانیوالی کا بغور مطالعہ کرتا۔ ایسے ہوشوں کی اسی جامیع چوتال کی خاطر ہی اس نے "آئیل" سیٹ پر غاصبانہ بقہرہ جایا تھا، حالانکہ اس سیٹ پر میرا حق زیادہ تھا۔ کیونکہ میں بھی وہی کرنا چاہتا تھا جو وہ کر رہا تھا۔ جہاز کے اٹے ہی درویش دوم نے ایک عدد اگر واٹی اور دو عدد جہانیاں لے کر خوفناک خراںوں کا ساز چھیڑ دیا۔ درویش اول ہوائی لنگر کھلنے کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ جو نبی جہاز نے اپنی مخصوص بلندی پر پرواز شروع کی خفاہتی بند بھی کمل گئے اور میخانوں کے در بھی۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب پی۔ آئی۔ اے ابھی مشرف بے اسلام نہیں ہوئی تھی۔ لہذا اسکے میخانوں میں مشروب مشرق بھی ملتے تھے اور مشروب مغرب بھی۔ جو نبی ایک صحت مند ساقی مشروب کی ٹڑالی لئے ہمارے قریب پہنچی، درویش اول نے بے صبری سے ایک جام تھام، بڑا سا گھونٹ لیا، بُری سی ٹھلل بیانی اور کہنی مار کر مجھے کہا۔ "کچھ پیو گے؟"۔ گویا وہ نہ پوچھتا تو میں پیا سامنی رہ جاتا۔

چال اور جسم پر بھالو سے بال۔ جب کبھی قیس اتارتا تو محلے کے نادان اور جوان بسمی "بھالو انکل... بھالو انکل،" کے نعرے لگاتے اور تالیاں بجاتے... اس چلنے پر تے چڑیا مگر کارگنک اتنا گورا تھا کہ اکثر دوران سفر غیر مکمل سیاحوں کے گروہوں میں اسے ڈھونڈنے کے لئے باقاعدہ منادی کروانی پڑتی۔

درویش سوم کی چال بھی وہی اور چلنے بھی... چب زبان، بے لگام اور طوطا چشم... اپنی طوطا چشمی کو چھپانے کے لئے اکثر چشمہ لگائے رکھتا۔ درویش اول رنگین مزاج — درویش دوم کمپیوٹر دماغ اور درویش سوم زبان دراز — تینوں اپنے اپنے فن میں ماہر اور یکا۔

کراچی ائیر پورٹ میں داخل ہوتے ہی پسلے بکر منڈی سے گزرنما پڑا، جہاں سفید دردیشوں والے قصابوں نے ہمارے سوٹ کیسوں کو بھیز کر کیوں کی طرح نزع کر کے اکھیر بکھیر دیا۔ اور ہم سامان کی راںوں کو اکٹھا کر کے سوٹ کیسوں کی کھالوں میں بند کرتے رہ گئے۔

درویش اول نے قطار پھلانگتے ہوئے ہمارے پاسپورٹ اسیگریشن افسر کی میز پر جا پہنچائے۔ افسر آخر افسر ہوتا ہے بھلا دہ اس طرح کی بے تکلفی کیونکر برداشت کرتا۔ چنانچہ اس نے ہمارے پاسپورٹ واپس چھینگتے ہوئے حکم جاری کیا "قطار میں آؤ۔" کاؤنٹر کے ارد گرد کمیوں کی طرح چھنے ہوئے لوگوں کو قطار تو آپ کسی صورت نہیں کہ سکتے۔ اسی لئے درویش اول نے ہمت کر کے پھر پاسپورٹ آگے کھکاتے ہوئے کہا۔ "جناب ہمیں ذرا جلدی ہے مولیٰ کر کے ٹھپے لگا دیجئے۔"

موٹی توند والے افسر نے گرج کر کہا۔ "ارے کا ہے کی جلدی ہے۔" ٹھین چھوٹی جاری ہے کیا؟" اس پس (پولیس) مقابلے میں درویش اول کی چیل پیشانی پر سیالاب سا آگیا۔ جاندیدہ درویش دوم نے پاسپورٹوں میں قائد اعظم کی تصویر رکھی اور افسر کے سامنے کر دئے۔ بیانیے قوم کے فرمانبردار فرزند نے جھٹ سے پاسپورٹ پکڑے اور چھٹ سے ٹھپے لگادئے، مگر درویش اول کا پاسپورٹ کھول کر تصویر

پرہیز" اور "خانلئی بند پانڈھ لجئے" کے ساتھ ساتھ "جبیب کتروں سے ہوشیار" کا سائیں بھی جلانا چاہیے۔

جہاز سے باہر نکلتے ہی بارش کی بوچھاڑ، اور بوچھاڑ سے بچاؤ کے لئے چھتریاں تانے تھیں نہ تھائی لڑکیاں۔ اس گیلے گرم استقبال سے درویش دوم کا چہرہ سرخ اور ہونٹ نیلے ہو گئے۔ درویش اول ان تیلیوں میں بھوزا سا بنا پھرتا تھا۔ اسے ایک چھتری کے سامنے میں اتنا سکون ملا کہ اس نے بس اور چہاز کے درمیان کئی پھیرے لگائے۔

ایمگریشن ہال میں بھانت بھانت کے سیاحوں کے ہجوم تھے، جو تھائی لینڈ کی اس جنت ارضی کی حوروں کا ٹرائیکل لینے دور دور سے آئے تھے۔ پاسپورٹ پر ٹپہ لگوانے کے لئے درویش اول اک سرمنڈھے بدھ بھکشو کے پہلو میں جا کھڑا ہوا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اسے اپنی زلفوں کی بے ترقی پر کچھ ملاں نہ تھا۔ تھائی ایمگریشن افرانے بھی درویش اول کے چہرے اور پاسپورٹ کی تصویر کا بغور جائزہ لیا۔ اور پھر اپنے وانتوں پر چڑھے سنرے خول کی نمائش کرتے ہوئے "ویکلم ٹو تھائی لینڈ" کہا اور ٹپہ لگا دیا۔ جو پاکستانی کشم سے گزر جائے وہ تو پل صراط سے بھی وندنا تا ہوا گزر جائے گا۔ اب بھلا تھائی کشم والوں کی ہمیں کیا پرواق تھی۔ چنانچہ حسب ڈیوٹی میں نے دونوں درویشوں کے بھدے بھدے سوت کیس اٹھا کر کشم آفیسر کے سامنے پیش کئے اور اس نے دیکھنے کا تردود کئے بغیر ہی چاک کے نشان لگادئے۔

ارائیوں ہال میں نو واردوں کی سولت کی ہر شے موجود تھی۔ "گواچے" ہوئے سیاحوں کی راہنمائی کے لئے ٹورست آفس، زر مبادله کے لئے بنک، شرپنچے کے لئے ٹرانسپورٹ کے کاؤنٹر اور ہوٹل بک کوانے کی ایجنسیاں۔ درحقیقت ہوائی ائے ملک کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ جو حشر ہوائی اڈوں پر ہوتا ہے وہی نقشہ ملک کے اندر زندگی کے ہر شے میں دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً "کراچی کا ہوائی اڈہ" تصور کیجئے۔ سافروں کی آمد۔۔۔ پہلی رکاوٹ ملکہ صحت کے میلی کمپلی وردوں والے لاغر

مکر بے صبر ساتی نے مجھے کچھ کہنے سننے کا موقع ہی نہ دیا اور ٹرالی دوڑاتی ہوئی دوسرے سافروں تک جا پہنچی۔ میرے لپ آرزو گلے کے کھلے ہی رہ گئے اور ہم پیاسے کے پیاسے ہی رہ گئے۔

کوئی چار گھنٹے کی پرواز کے بعد ہم لوگ بنکاک کی فضائی حدود میں جا پہنچے۔ فضائی میزبانوں نے تکنے اور اخبار سینئے شروع کئے۔ میں نے کھڑکی سے پاہر جماعتکا، سزاہ زار کو چھرتی ہوئی گدلي نہریں اور نہریں کے کنارے سرخ چھتوں والے گمرا۔ بنکاک کی ڈون مانگ ایئر پورٹ پر تقریباً پینتالیس میں الاقوای ہوائی کمپنیوں کے جہاز بھی آتے ہیں اور یہ تھائی لینڈ کی ہوائی فوج کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ "رن ولے" کے قریب لڑاکا طیاروں کی قطاریں تھیں، جن کی حفاظت کے لئے پتہ قد تھائی فوجی متعین تھے۔

ایئر پورٹ کا کچھ حصہ زیر تعمیر تھا جہاں مرد اور عورتیں دنوں مل کر مزدوری کر رہے تھے۔ اکثر مزدور گلے سے ننگے (عورتیں شامل نہیں۔ اگرچہ ہمارے جذبے انتیار شوق کا شوخ تقاضہ یہی تھا) سرپر بڑے بڑے ہیئت پہنچنے کاں میں مصروف تھے۔ جو نہیں جہاز رکابوںے بونے تھائی فوجی جہاز کو گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے اور اپنی پلاسٹک کے کھلونا نما میں گئیں اس طرح تان لیں کویا جو نہیں سافر باہر نکلیں گے فائز کھول دیں گے۔ درویش دوم فوراً کھڑکی سے پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے کمپیوٹر دماغ میں نہ جانے کیا کیا دسوے جنم لینے لگے۔ اور جہاز میں سکھلی ہی بیج گئی۔ بیچ پاکار کرتے پہنچے، پنگلھاڑتی مائیں اور دہاڑتے باپ۔ ایسی بد نظری، افرا تفری اور نفسا نقشی کا عالم، جو ہماری زندگی کے ہر شے میں نظر آتا ہے۔ جہاز سے اترتے وقت تو کم از کم دنیا کی مہذب ترین قومیں بھی اسی مرض کا ہنکار ہوتی ہیں۔ ہمارا پیشوا درویش اول تو جنگیہری کی طرح گھومتا ہوا دروازے تک جا پہنچا۔ مگر درویش دوم اپنی جامت کے سبب اور میں سامان کے سبب ابھی تک دھمک پیل کا ہنکار تھے۔ اس طرح کے ہجوم میں ہر طرح کے حادثے ہو سکتے ہیں۔ پی۔ آل۔ اے والوں کو اصولاً "تمباکو نوشی سے

سمجھوہ کرنے میں وقت لگتا ہے۔ ملا ایرپورٹ سے شرپنچنے تک موسم نے کمی رکھ بدلے۔ پہلے بلا کی دھوپ اور کڑا کے کی گری تھی اور شاید اسی وجہ سے درویش اول نے آگے کی سیٹ سنبھالی تھی۔ کیونکہ ڈیش بورڈ پر چھوٹا سا پنچھا لگا ہوا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ہر سو کالی گھٹائیں چھا گئیں اور موسلہ دھار بارش سے بھیکتے تھے اور بند ہو گئیں۔ مگر گری بدستور تھی۔ گاڑی کے شیشے کھولیں تو بارش سے بھیکتے تھے اور بند کریں تو پینے سے۔ کچھ دیر بارش کی بوچھاڑ فساتھ دیا۔ پھر ہوا بادلوں کو ہائکتی ہوئی لے گئی اور دھوپ چھاؤں کی ایک عجب کھپڑی سی پکنے لگی۔ اس روپ بدلتے موسم کی بدولت ہی چھتری بیان کے لوگوں کے لباس کا حصہ بن گئی ہے جو دھوپ سے بھی بچاتی ہے اور برسات سے بھی۔

بیان کا موسم جتنا غیر یقینی ہے ممکن اتنی ہی یقینی ہے۔ بدبو سے کچھ کچھ ملتی جلتی یہ ممکن ہر سو پھیلی رہتی ہے۔ لگزوری ہوٹلوں کے ایرکنڈیشنڈ کرے ہوں یا شرکی گندی گھیاں، یہ ممکن ہر جا آپ کا ساتھ دیتی ہے اور تب تک ساتھ دیتی ہے جب تک آپ سانس لیتے ہیں اور بنکاک میں رہتے ہیں۔ ٹیکسی شاہراہ پر بنکاک کی جانب دوڑتی جا رہی تھی۔ بیس، ٹرک، رکشا اور پرائیوٹ گاڑیاں بھی بنکاک کی جانب دوڑتی جا رہی تھیں۔ اگر بنکاک نہ ہوتا تو نہ جانے ان سب کی منزل کیا ہوتی؟ —

ٹرک کے دونوں جانب چاول کے کھیت، جنگلی گھاس، کیلے کے باغات، پھولدار جھاڑیاں اور ناریل کے پیڑی... گندے پانی کے تالاب اور گدے پانی کی نہریں... گدے اور گندے پانی میں گمرے چھوٹے چھوٹے گمر، لکڑی کے گمر، نین کی چھوٹوں والے گمر، پھولدار جھاڑیوں اور کیلے کے باغات سے جھاٹکتے بڑے بڑے گمر، سرخ چھوٹوں والے گمر... ناریل کے پیڑوں سے بھی اوپھی طرز جدید کی عمارتیں... پھر لوگوں کے ہجوم.... نیلی جیزٹ اور شوخ رنگ بشرٹوں والے نوجوان... رنگ برنگ بلااؤز اور شوخ و شنک مسکراہٹوں والی نوجوان خواتین... بڑے بڑے بیٹوں کے سائے میں چھپی چھوٹی چھوٹی بوڑھی بوڑھی عورتیں... کپڑوں سے بے نیاز، دنیا سے بے نیاز... گندرا

کارندے... دوسری رکاوٹ اینگریش، جہاں آمد کی مر لگانے والے تو چند آنفری ہوئے مگر چل قدمی کرنے والے سینکڑوں... تیسرا رکاوٹ ٹالیوں کی چھینا چھٹی، پورٹوں سے نجات اور سامان حاصل کرنے کا طویل انتظار... اسی دوران مسافروں کو تمازتے ہوئے سادہ لباس والے کشم کے جہز بااؤٹیں... چو تھی رکاوٹ اور بت بڑی رکاوٹ، کشم کا قصاب خانہ... پانچھیں رکاوٹ تھوٹوں کی امید میں "جگراتہ" کاٹنے والے رشتہ داروں اور دوستوں کے ہجوم... چھٹی رکاوٹ ادھ موئے مسافر کے حصے بخیرے اور پر زے پر زے کرنے والے ٹیکسی ڈرائیور... مگر بنکاک میں ایسا کوئی مسئلہ درپیش نہ تھا۔ ہاں ٹیکسی ڈرائیور سے سودے بازی کرنا لازمی ہے۔ کیونکہ وہاں بھی ٹیکسیوں پر میز توہین مگر میز سے ٹیکسیاں نہیں چلتیں... باقاعدہ سودے بازی کرنی پڑتی ہے۔ یہ سودے بازی بھی اہل مشرق کو ورش میں ملی ہے، جس کا اپنا ایک خاص حسن اور انداز ہے۔ اب تو مغرب والے بھی مشرق میں آتے ہیں تو اس انداز کو اپنانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ ایرپورٹ سے شرکوئی باسیں کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور نے دو سو باٹھ کا مطالبا کیا۔ درویش دوم فوراً سودا بازی کے میدان میں کوڈ گیا۔ "سو" چاہے پیسے ہوں نام تو بڑا ہے۔ میں نے سوچا جس رفتار سے "سو" ہماری جیب سے نکلیں گے اسی رفتار سے ہم لوگ بنکاک سے نکلیں گے۔ اور بنکاک میں آنے کے بعد جلدی جانے کو کس کا جی چاہتا ہے۔ سودے بازی کے اس مقی میں ہمارے بھاری بھر کم درویش کا پلہ بھاری رہا اور ایک سو پینتیس باٹھ میں فیصلہ ہوا (ایک ڈالر کے تقریباً پیچتیں باٹھ ہوتے ہیں) سودا ملے ہوتے ہی دونوں درویش اس اطمینان سے ٹیکسی میں سوار ہو کر بیٹھ گئے گویا ان کے ساتھ سامان ہی نہ ہو۔ مجبوراً ٹیکسی ڈرائیور اور میں سامان سے سکھم گھٹا ہونے لگے۔ درویش اول زندگی میں پہلی مرتبہ گاڑی کی اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ جس میں یقیناً کوئی راز ہو گا جس کا مجھے ابھی اندازہ نہ ہوا۔

بنکاک کا ایک خاص موسم بھی ہے اور ایک خاص ممکن بھی۔ دونوں سے

پانی اچھاتے... گد لے پانی میں ناؤ بھاتے نگ دھنگ بچ... چل پل والا جیتا جاتا  
شہریں۔

لیکسی ڈرائیور نے چلتی گاڑی میں اپنا کار بار شروع کر دیا۔ موصوف نے ہلکا  
چھکا تعارف کرایا اور درویش اول کو ایک الہم پیش کی، جسے کھولتے ہی ہمارے رہنمیں  
مزاج پیشوں کی آنکھوں کی ہیڈ لاٹس روشن ہو گئیں۔ اس نے درویش دوم کو الہم دیکھنے  
کا اشارہ کیا، جسے دیکھتے ہی اس کے کان سرخ ہو گئے۔ بات یقیناً خطرے کی تھی...  
چنانچہ جو وہ دیکھ رہے تھے وہ دیکھنے کے لئے میں بھی الہم پر شکرے کی طرح جھپٹا۔  
بات واقعی خطرے کی تھی۔ ہر صفحہ پر ایک بی بی اور تین تصویریں۔ جبیں، جسم اور  
جوانی... تینوں زاویے... نام، ناپ اور عمر... تینوں کوائف... ہر زاویے اور ہر  
طرح کے کوائف پر بحث کرتے تینوں درویش۔ جب تک الہم ختم ہوا لیکسی  
ہوٹل کے سامنے کھڑی تھی۔ درویش اول نے اس جنسی سوداگر کا تعارفی کارڈ  
خاطرات سے اپنے بنوے میں رکھا اور شام کو بُرنس مینگ کا وعدہ کر کے ہوٹل کی لابی  
میں تھس گیا۔ درویش دوم نے اپنی چھوٹی سی گردن ٹیزیرھی کر کے ہوٹل کی جانب اور  
کو دیکھا۔ حد نظر تک منزلیں ہی منزلیں تھیں۔ اس ہوٹل کی چودہ منزلیں تھیں اور ہر  
منزل کا ایک ڈالر بھی لگائیں تو کمرے کا کرایہ چودہ ڈالر ہوتا چاہئے۔ دروش دوم کے  
کمپیوٹر مانگ نے اپنی مخصوص منطق سے یہ جواب نکلا۔

ہوٹل کے استقبالیہ پر ٹوٹھ پیٹ کی اشتخار نما مسکراہٹ سجائے کوئی آدمی  
درجن میساں کھڑی تھیں۔ جنہوں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام کرتے ہوئے کہا۔  
”سوات دی“ (صحیح بخیر)۔ درویش اول نے اسی طرح ہاتھ جوڑ کر فراہجھتے ہوئے کہا۔  
”سوات دی ناگ ساؤ“۔ (صحیح بخیر مس) ہم دونوں نے بھی جلدی جلدی درویش اول  
کی نقل کی اور اس فقرے کی جگہ منہ میں کچھ ایسے ہی بربادیے۔ درویش اول نے  
تحالی بول چال کے کتابچے سے صرف چند فقرے ہی رہے تھے۔ مگر ابھی تو ہم لوگوں پر  
اس نے اپنی قابلیت کی دھاک بخداوی تھی۔ ہمارے پیشوں نے نام لکھوائے

وقت لڑکی سے کہا۔ ”ہم مسٹر خان کے دوست ہیں۔ ہمیں کروں کے کرائے میں پچاس  
نی صدر عایت دیں“ اور وہ رعایت ہمیں مل گئی۔ اگر مسٹر خان سے دوستی پر پچاس فی  
صد رعایت مل سکتی ہے تو اس سے دشمنی پر جمانہ بھی تو ہو سکتا ہو گا۔

اس ہوٹل کے قیام پر سب سے زیادہ خوشی مجھے ہوئی۔ کیونکہ دونوں  
ورویشوں کا سامان میری بجائے ایک باوردی نوجوان نے اٹھایا۔ لفٹ میں سامان رکھتے  
ہی اس نے اپنا تعارف کروانا شروع کیا۔ ”میرا نام عمران ہے اور میں اس ہوٹل میں  
واحد مسلمان ہوں۔ ویسے تحالی لینڈ میں کوئی سازی ہے دس لاکھ مسلمان ہیں جو تحالی لینڈ  
کے جنوبی اضلاع میں رہتے ہیں...“ اور ہر بناک میں سو کے لگ بھگ چھوٹی بڑی  
مسجدیں ہیں۔ ”وہ ایک ہی روانی میں طوطے کی طرح رہی ہوئی باتیں ہمیں بتاتا گیا۔  
اس نہ ہی ناطے کے سبب ہمیں یقیناً اس سے کچھ انس سا ہو گیا۔ شاید اسی لئے  
ہمارے وزیر خزانہ درویش دوم نے دل کھول کر اسے ٹپ دیا۔ میرے خیال میں جب  
سے عرب بھائیوں نے بناک کو اپنی ٹکار کا گاہ بنایا ہے وہاں کے مسلمانوں نے بھی ہر ٹول  
والے اسلام سے گمراہ شہت جوڑ لیا ہے۔

تحالی کے معنی ہیں آزاد۔ تحالی لینڈ جنوب مشرقی ایشیا کا واحد ملک ہے جو پچھلے  
8 سال سے آزادی کی فضا میں پروان چڑھ رہا ہے۔ یعنی حکومت غیر ملکی غلامی سے  
آزاد اور عوام مادر پر آزاد۔ سیام، تحالی لینڈ کا قسم نام ہے جو ۱۹۳۹ کے فوئی  
انقلاب کے بعد بدلا گیا۔ اس انقلاب نے اس ملک پر تین گرے اثرات چھوڑے۔  
پہلا تو یہ کہ خادان چاکری کی دو سو سالہ شہنشاہیت کو آئینی طرز شہنشاہیت میں بدل  
دیا گیا۔ دوسرا ملک کا قسم نام بدل دیا گیا اور تیرے یہ کہ تحالی لینڈ سرکار برطانیہ  
کے اثر سے نکل کر انکل سامگھی یعنی امریکہ کے پہلو میں جا چکا۔

اس نسل در نسل آزادی نے تحالی عوام کو احساس کرتی سے آزاد کر دیا ہے۔  
اسی لیے وہاں ہر شخص مسکراتا دکھائی دیتا ہے تحالی لینڈ کو ”لینڈ آف سائیلز“ کہا جاتا  
ہے۔ اور ان کے بارے میں مشور ہے کہ وہ اس وقت بھی مسکراتے رہتے ہیں جب

سرکوں پر بہت زیادہ ٹریک تھی۔ فتحاً میں پہلی گول مٹول گزیوں جیسی لڑکیاں ادھر ادھر گھوم رہی تھیں۔ ڈرائیور شرکی خوبصورت شاہراہوں پر نیکی بھگاتا جا رہا تھا۔ ہم بے صبور کی طرح ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ سوراواںگ روڈ پر اکثر ہوائی کمپنیوں کے دفتر ہیں۔ پی آئی اے کے خوبصورت سے دفتر میں گئے۔ مسٹر اسلام خان بنکاک میں پی آئی اے کے میخیر ہیں۔ مگر نہ جانے اس شخص کے پاس کیا جادو ہے۔ اس کا نام بنکاک میں سکے کی طرح چلتا ہے۔ اگر اسی طرح کے تعلقات ہمارے سفارتخانوں کا عملہ بھی رکھئے تو پاکستان کے کئی مسائل ختم ہو جائیں۔ مگر پاکستانی سفارتخانوں کے عملے کا کیا روایہ ہوتا ہے۔ اس سے آپ واقف ہیں۔ اور اس عمل کے نتیجے میں پوری قوم کو خمیازہ بھکنا پڑتا ہے۔ اسلام خان اپنی سیکریٹری سے خط لکھوا رہے تھے۔ ہمارے جانے کی خوشی اسلام خان سے زیادہ ان کی سیکریٹری کو ہوئی۔ کیونکہ اسے فوراً چھٹی مل گئی۔ اسلام خان نے پاکستان کے متعلق طویل تھے چھیڑ دیئے۔ قصوں اور قصقوں میں ہم شیرش ہوئی ہنچ گئے۔ جہاں رنگین ماحول میں خان صاحب نے کھانے کی دعوت دی جو ہم نے حسب عادت فراخبدی سے قبول کر لی۔ درویش ادول نے اپنی رنگین مزاجی کی تکیئیں کے لئے خان صاحب سے بنکاک کے بارے مزید تفصیلات معلوم کرنا چاہیں۔ انہوں نے بنکاک کا کونہ کونہ حفظ کر رکھا تھا۔ ایسی ایسی باتیں سنائیں کہ درویشوں کی بھوک ختم اور پیاس بڑھ گئی۔ جس سیاحت کا سفرغان نے ذکر کیا وہ رات کو ۹ بجے کے بعد شروع ہوتی تھی۔ چنانچہ ہم ہوٹل میں جا کر آرام بھی کرنے لگے اور رات کا انتظار بھی۔

بنکاک کا شربراہ ہر جائی ہے۔ سورج نکلتا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے یہاں کبھی بارش ہوئی ہی نہ ہو اور اگر بادل آجائیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے برسوں سے سورج نہ دیکھا ہو۔ شاید یہی ہر جائی پن یہاں کی حیثیتوں میں ہو۔ شام کو ناگنوں کی طرح پھن پھیلائے گئنا تھیں آسمان پر چھا گئیں اور موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ بارش پڑتے ہی درویش ادول کی امیدوں پر بھی اوس پڑ گئی۔ اس نے سوچا کہ پورا پروگرام

انہیں سمجھیدہ ہونا چاہیے۔ اس کے بر عکس ہم لوگ اسوقت بھی سمجھیدہ رہتے ہیں جب ہمیں مسکراانا چاہیے۔

کراچی سے نجربہ تک مسکراہوں سے محروم چرے دکھائی دیتے ہیں۔ زندہ دلان لاہور تو خدا جبر کب سے مسکراانا بھول گئے ہیں۔ اگر کوئی تھائی نوجوان لاہور پہنچ تو یقینی آدمی گھٹٹے کے اندر اندر اسکے دانت نکال دئے جائیں۔ لیکن کوئی تھائی لڑکی ادھر پہنچ جائے تو آدمی گھٹٹے میں آدھا لاہور اسکے پیچے ہو گا۔ حالانکہ دونوں کی مسکراہوں کا مطلب انکی مخصوص مخصوصیت کے سوا کچھ نہیں ہو گا۔ تھائی لینڈ کے عوام اپنی زبان اپنے تمدن، اپنے مذہب اور اپنی روایتوں پر برا فخر کرتے ہیں۔ بنکاک جیسے بین الاقوامی شریمن پیشہ دکانوں پر بورڈ تھائی زبان میں نظر آئیں گے۔ اور اگر کوئی دکاندار سیاحوں کی سولت کے لئے کسی اور زبان میں بورڈ لٹکانا چاہے تو اسے اسکا مخصوص کرایہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ چینی اور سکھ دو ایسی قومیں ہیں جو جہاں بھی ہوں اپنی روایتوں اور زبان کو نہیں چھوڑتے۔ مگر تھائی لینڈ میں سب "اک مک" ہو گئے ہیں۔ اور ایسے "اک مک" ہوئے ہیں کہ سرداروں نے اپنے نام تک بدل ڈالے ہیں۔ مثلاً ہمارے ایک سردار جی دوست جو ہمارے لئے تو کلونت سنگھ ہی ہیں مگر وہاں "کلوات پینی وانگ سی" کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔

مسٹر خان کے پاس جانے کے لئے ہوٹل سے باہر لٹکنا تھا کہ رنگ بر گلی بشریوں والے نیکی ڈرائیوروں نے ہم پر بھرپور حملہ کر دیا۔ ہر ایک اپنی طرف سمجھیت رہا ہے۔ اگر ہمارے جسم کا غذہ کے ہوتے تو یقین پر زے پر زے ہو کر بنکاک کی گلیوں میں اڑ رہے ہوتے۔ ہر ایک یا تو سو انا باتھ کا ذکر کرتا یا پھر لڑکی کے حسن کی تعریف۔ مسٹر خان کے پاس جانے کے لئے گاڑی کی ضرورت تھی لڑکی کی تو نہیں۔ بیوی مشکل سے جان بچا کر ایک نیکی میں سوار ہوئے۔ اسے سوراواںگ روڈ پر پی آئی اے کے دفتر جانے کو کہا۔ اس نے پندرہ باتھ کا مطالبا کیا۔ ہم نے دوسرے نیکی ڈرائیوروں سے جان بچانے کی خاطر فوراً اسکا مطالبا مان لیا۔ اس وقت دوپر کے کھانے کا وقت تھا۔

کے پیپاری، یہ ڈالر، یہ جم، یہ زر، یہ ضورت۔ یہ ذکر ہے اس جوان رات کا جس کا ساتھ بھانے کی ہم نے قسم کھائی تھی۔ ہم نے جس ناٹ کلب میں بھی جھانکا وہیں آدم کے بیٹوں کی رگوں میں انگور کی بیٹی اور بانوں میں حوا کی بیٹی کو پایا۔ ایک طرف تو قدرت نے تھامی لڑکیوں کو بھرپور جسموں سے نوازا ہے جو قدرت کی اس فیاضی کو بڑی فراخدی سے استعمال کرتی ہیں۔ دوسری طرف اگلی اس فیاضی کے چھپے دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں، جن کو پھیلانے میں انگلی وزارت سیاحت کا بڑا ہاتھ ہے۔ چنانچہ دنیا بھر کے سیاح، زر کے حاتم طائی بن کر تھامی لینڈ آتے ہیں اور جس کی ان حاتم طائیوں سے طویل ملاقاتیں پاتے ہیں۔ ان ناٹ کلبوں میں ہر شام نہ جانے کتنی کلیاں چنک کر پھول بنتی ہیں اور نہ جانے کتنے پھول مر جھا جاتے ہیں۔ لکیوں پر بھونزوں کو بھکتے تو ہم نے دیکھا ہے، مگر جتنا لامبی بھوزا درویش اول تھا اسکی مثل نہیں ملتی۔ اسکا بس چلتا تو اس پورے چمن کے پھولوں کا رس نکال کر ایک ہی سانس میں پی جاتا۔ کہتے ہیں خدا گنجے کو ناخن نہیں دتا۔ شاید اسی لئے اس سفر میں درویش اول کو دولت تو محدود ملی تھی مگر جذبات کی فراوانی تھی۔ ناٹ کلبوں میں سکھنے والے یہ پھول تھامی لینڈ کے دور دراز علاقوں سے آتے ہیں۔ ہر ناٹ کلب میں کوئی دوسو کے قریب لڑکیاں ہوتی ہیں۔ شام کو جب مہمان آتے ہیں تو لڑکیاں رقص میں مشغول ہوتی ہیں۔ سیاح اپنی پسند کی لڑکی کے ساتھ رقص کرنے لگتے ہیں۔ اسی وقت سے وہ لڑکی اس مہمان کے لئے مخصوص ہو جاتی ہے۔ اور مہمان کے ساتھ ہی شراب بنتی ہے اور کھانا کھاتی ہے۔ جب مہمان رقص سے آتا جاتا ہے تو یہ لڑکی اس کے ساتھ چلی جاتی ہے۔ مگر جانے سے پہلے مہمان کو کاؤنٹر پر ٹول نکیں ادا کرنا پڑتا ہے۔ بنکاک کے شعلے رخوں سے دامن بچانا کس رو سیاہ کو معصود تھا، مگر مجھے تو پاس تھا ان وعدوں کا جن وعدوں کی آس لگائے دور دیس میں کوئی میرا انتظار کر رہا تھا۔ مگر دونوں درویشوں نے اس گلستان کے گھنیوں کا پورا پورا ساتھ دیا۔ سورج کی پہلی روشنی میں مندوں کے گپڑے اور سرخ چھتیں چک رہی

چھپت ہو گیا۔ بارش میں لوگ گھروں سے ہی نہ لکھیں گے۔ ہم ہوٹل کی کھڑکی سے باہر دیکھتے رہے۔ گھٹائیں حاتم طائی نہیں رہیں۔ سڑک پر گاڑیاں چیوٹیوں کی طرح ریکٹی رہیں۔ گزیاں رنگ برکتی چھتریاں لئے دوڑتی رہیں۔ آخر ہم نے بھی ہمت کی، ہوٹل سے پچھے آئے اور ٹیکسی میں سوار ہو گئے۔ گاڑیوں کے بپر سے بپر لگے ہوئے تھے۔ گاڑیاں کیا کشتیاں تھیں۔ جو پانی میں چلی جا رہی تھیں۔ وہاں گاڑیوں کے سانٹنر اس صورت سے لگائے جاتے ہیں تاکہ پانی میں نہ ڈوب سکیں۔ ایک ایک چوک کو پار کرنا عذاب بن گیا تھا۔ مگر ڈرائیوروں کے تھل کی داد دینا پڑتی ہے کہ وہ بڑے مبر کے ساتھ انتظار کرتے ہیں۔ کوئی ڈرائیور اگر دونوں دے ریلک میں میں روڑ پر گاڑی موزٹا چاہے تو دونوں جانب سے ریلک رک جاتا ہے۔ اور اسے گاڑی موزٹے دیتے ہیں۔ نہ تو ہارن مینڈ کوں کی طرح چلانے لگتے ہیں نہ گالیوں کی بوچھاڑ ہوتی ہے اور نہ ہی پولیس والا ڈرائیور کو ایک طرف لے جا کر چالان کی دھمکی سے اپنا غصہ ٹھنڈا اور جیب گرم کرتا ہے۔

پیٹ پانگ کی روشنیوں اور شعلے رخوں کے قتموں نے رات کا دامن چاک کیا۔ ہم بھی بنکاک کی اس حسین سڑک پر پچھے جس کے ناٹ کلبوں نے بنکاک کو مشرق کا بیرون بنا دیا ہے۔ ڈیڑھ سو گز لمبی سڑک پر سیکنڈوں چھوٹے بڑے ناٹ کلب ہیں جن کی روپ بدلتی روشنیوں سے کبھی چھرے سرخ اور جسم سیاہ اور کبھی جسم سرخ اور چھرے سیاہ ہونے لگے۔ بھیکی بھیگی فضا میں انگریزیاں لیتی رات کو دیکھ کر درویش اول نے کہا۔ ساتھیوں وعدہ کرو کہ اس جوان رات کا ساتھ دو گے۔ یہ رات پھرندے آئے گی۔ بنکاک میں ہر رات جوان ہوتی ہے صرف رات کے ساتھی بدلتے رہتے ہیں۔ اور پھر ہم ناٹ کلبوں کے طسم کدے میں کوئی گئے۔ یہ چکھاڑتی موسیقی، یہ ترپتی جوانیاں، یہ انگور کی بیٹی، یہ آدم کے بیٹے، یہ اکھڑی اکھڑی سانسیں، یہ بہکی بہکی باتیں، یہ بکھری بکھری زلفیں، یہ نکھری نکھری بانیں، یہ بڑھتے ہوئے ہاتھ، یہ سطھتے ہوئے جسم، یہ لبے لبے امریکن سیاح، یہ چھوٹی چھوٹی تھامی لڑکیاں، یہ مشرق کی بیٹیاں، یہ مغرب

سینک فارم میں ہزاروں قسم کے عجیب و غریب سانپ تھے۔ جنہیں مختلف سائنسی تجویزوں کی غرض سے پالا جاتا ہے اور ناگوں سے زہر بھی نکلا جاتا ہے۔ اس لیبارٹری کے ایک طالب علم نے ہمیں بتایا کہ سانپ کے دانت میں زہر نہیں ہوتا بلکہ حلق کے اندر زہر کی تھیلی لگی ہوتی ہے اور جب سانپ دانتوں سے زخمی کرتا ہے تو تھیلی سے زہر زخموں میں پھیل کر خون میں شامل ہو جاتا ہے۔ ناگوں کے اس زہر کو تھیلی میں شامل کر کے مختلف بیماریوں کا علاج کیا جاتا ہے۔ کیا بنکاک کی حیثیں ناگوں دواؤں میں شامل ہو جائے؟ یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب حاصل کرنے کے لئے زخم کھانا ضروری تھا۔

پاک نام گرفتہ فارم جانے لگے تو درویش اول گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور مجھ کو آگے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے فوراً اس کے حکم کی تھیل کی۔ اب فیضال کا بیچ ختم ہو چکا تھا اور ڈرائیور بھی بیٹھا شرافت سے گاڑی چلا رہا تھا۔ چنانچہ اس بیس میل کے سفر میں درویش اول گری میں جھلتا رہا اور میں مزے سے سینہ تان کر گپھے کے سامنے بیٹھا رہا۔ پاکنام فارم میں بہت بڑی مصنوعی جھیل ہے۔ جس میں تقریباً دس ہزار گرفتہ گپھے پالے گئے ہیں۔ جھیل کو اس طرح کئی حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے تاکہ نوجوان گرفتہ گپھوں کو بوزٹھے اور خزانہ گرفتہ گپھوں سے علیحدہ رکھا جائے۔ یہیں ایک حصے میں کوئی چھ سو کے قریب دس سال کی عمر کے گرفتہ چھوڑے گئے ہیں۔ یہ علاقہ گرفتہ گپھے کی افزائش نسل کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔ یہاں ہر ماہ کے مقابلے میں دو نر رکھے جاتے ہیں۔ جھیل کے ارد گرد تھنی جھاڑیوں میں مادہ کئی درجن انڈے دیتی ہے اور دو میینے تک ان انڈوں کی حفاظت کرتی ہے۔ جب بچے نکل آتے ہیں تو کچھ عرصے انہیں ایک اور جگہ منتقل کر دیا جاتا ہے۔ گرفتہ گپھے کے بچے جن تالابوں میں بند تھے ان کے اوپر پھر دانی کی طرح جالیاں لگی تھیں۔ جو گرفتہ گپھوں سے بچانے کے لئے لگائی گئی تھیں، کیونکہ پھر کے کائنے سے پہنچ انہا بھی ہو سکتا ہے اور لکڑا بھی۔ گرفتہ گپھے کو اتنا بڑا جانور ہے مگر دھماکے سے اس کا دل پھٹ

تھیں۔ زعفرانی لبادول والے بھکشو سیاہ کاسوں میں عقیدت مندوں سے خوارک کے نذرانے وصول کر کے مندوں کو لوٹ رہے تھے۔ ناریل کے سبز پتے ہوا میں جھومنتے تو عینہ کے موئی بکھرنے لگتے۔ رات کی خوابیدہ سڑکوں پر ریل ٹائل شروع ہو گئی۔ مندوں میں گھنیوں کے جل ترک ہجتے گے۔ مگر ہمارے کرے میں ابھی درویش دوم کے خوفناک خراںوں کا شور تھا۔ دروازہ کھلا۔ ملائی کڑھائی والے سفید کرتے شلوار، بہاول پوری سلام ستارے والے کھے اور تھائی ہیئت میں ملبوس درویش اول نمودار ہوا۔ میری سمجھ میں تو نہ آیا کہ آخر وہ لباس کی اقوام تھے کیوں بنا ہوا تھا۔ اس نے آتے ہی درویش دوم کو جھوڑا۔ درویش دوم نے ایک عدد انگریزی اور دو عدد جائیاں لے کر درویش اول سے کہا ”ہیئت پہن کر تم کیا پاسک شو کا اشتہار بنے ہوئے ہو۔“ درویش اول نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”تم زیادہ باتیں نہ بناو۔ جلدی سے تیار ہو جاؤ، ابھی ناگ اور گرفتہ گپھے دیکھنے جانا ہے۔“ ناگوں کی اس بستی میں ناگوں سے ملاقات کی منطق میری سمجھ میں نہ آئی۔ ”گرفتہ گپھے دیکھنے تھے تو مانقصوبہ چلے جاتے، بنکاک آئے کیا ضرورت تھی۔“ درویش دوم نے کوٹ بدلتے ہوئے کہا۔

ٹیکسی میں سوار ہوئے اور ڈرائیور سے ناگوں کے فارم چلنے کو کہا۔ بنکاک میں ہر ڈرائیور کو اپنا لائسنس گاڑی میں فریم کرا کر لگانا پڑتا ہے۔ چنانچہ اس ڈرائیور نے ایک طرف تو اپنا لائسنس لگایا ہوا تھا اور دوسرا جانب اپنی ایک (فیضال کھینے کی حالت میں) تصویر۔ ہماری بدقتی سے ان دونوں فیضال کا ثور نامٹ ہو رہا تھا۔ جس کی کنٹری ریڈیو پر نشر ہو رہی تھی۔ چنانچہ یہ ڈرائیور صاحب گاڑی سڑک پر چلا رہے تھے اور دھیان فیضال کے گراونڈ میں لگائے ہوئے تھے۔ کنٹری سٹنے کے ساتھ ساتھ وہ نفرے بھی لگا رہا تھا اور ہاتھ پاؤں بھی فری شاکل میں چلا رہا تھا۔ درویش اول، جو ڈرائیور کے قریب بیٹھا تھا، خوف سے زرد ہو رہا تھا اور اس کی خندان پیشانی پر رومال کا واپسہ متواتر مل رہا تھا۔ خدا خدا کر کے فارم آیا اور ہمیں اس خطرناک سفر سے بجاتی ملی۔

جاتا ہے۔ جب مگر مجھ کھال اتارنے کے قابل ہو جاتے ہیں تو انہیں قصاص خانے میں کاٹا جاتا ہے اور ماہر قصاص ان کی کھال اتارتے ہیں۔ دس برس کی عمر والے مگر مجھ کی کھال سے پانچ دستی بیگ کی تیار کئے جاسکتے ہیں۔ اس کا گوشت ہو ٹلوں میں فروخت کیا جاتا ہے۔ — مگر مجھ کا گوشت کھانے سے وہ کی ہماری ختم ہو جاتی ہے۔ یہ بات سننے کے بعد ہمیں اتنا وہم ہوا کہ بنکاک میں جب بھی کھانا کھاتے ہیں فکر رہتی کہ کہیں مگر مجھ کا گوشت تو نہیں۔ اس فارم سے سالانہ چار ہزار کے قریب کھالیں حاصل کی جاتی ہیں۔ فارم کے اندر ہی ایک سور ہے، جہاں سے مگر مجھ کی کھال کے دستی بیگ جوتے اور بٹوے وغیرہ سے دامون مل جاتے ہیں۔

بنکاک میں سڑکوں پر بھکاری نظر نہیں آتے۔ یہ بات ہمارے لئے باعث فکر تھی، کیونکہ بھکاریوں کے بغیر تو ہمارے ہاں کی سڑکیں سونی دکھائی دیتی ہیں۔ لوگ ہاں بھی غریب ہیں مگر پہہ حاصل کرنے کے لئے وہ محنت کرتے ہیں۔ بھیک نہیں ملتے۔ ہوٹل پنج کر درویش اول نے بنکاک کا نقشہ سامنے پھیلایا۔ ہماری کامینہ نے اپنے ہنگامی اجلاس میں دوسری صبح مندروں کی سیر کا پانچ گھنٹے کا منصوبہ تیار کیا اور ہم دوسری صبح کا انتظار کرتے کرتے رات کے پہلو میں سو گئے۔

تحالی لینڈ میں بدھ مت ایک طریقہ زندگی ہے اور مذہبی رنگ زندگی کے ہر شبے میں دکھائی دلتا ہے۔ ششماہ اشوک کے زمانے میں دو مشن ہندوستان سے تحالی لینڈ پنجھ جنوں نے بدھ مت کا پرچار کیا اور اسی زمانے سے تحالی لینڈ کی کثیر تعداد اس مذہب میں شامل ہو گئی۔ صبح سوریے بدھ بھکشو زعفرانی لبادوں میں لپٹے ہاتھوں میں سیاہ کاٹے لئے گلی گلی گھوٹتے ہیں۔ گوپرہتوں کو دنیاوی چیزوں سے دوچھپی نہیں ہوتی مگر وہ عقیدت مندوں کی تسلیکیں کے لئے گھوٹتے ہیں۔ اس طرح لوگ انہیں خوارک دے کر ثواب حاصل کرتے ہیں۔ یہ صدیوں پرانی رسم ہے جو بدستور چلی آرہی ہے۔ اگرچہ بنکاک میں اکثر بارش ہوتی رہتی ہے مگر اس کے باوجود ہم نے دیکھا کہ پروردہ بلا ناغہ ہر گلی کوچے میں جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہم نے انہیں چھوٹی چھوٹی کشیوں کے بعد ملا۔ اہل

میں سوار ہو کر ان جگہوں پر جاتے دیکھا ہے جہاں لوگ کشیوں کے گھوٹوں میں رہتے ہیں۔ پروردہ صبح کے ناشتے کے بعد صرف رات کو کھانا کھاتے ہیں۔ پورے تحالی لینڈ میں کوئی اخادرہ ہزار مندر ہیں اور ایک لاکھ پچاس ہزار کے قریب پروردہ ہیں۔ ایک سال کی عمر ہونے سے پہلے ہر مرد کچھ عرصہ کے لئے ضرور پروردہ بنتا ہے۔ اس مذہبی رسم سے پادشاہ بھی بالآخر نہیں۔ راما چہارم ۲۷ سال تک بدھ بھکشو ہنا رہا۔ اس زمانے میں اس نے انگریزی زبان بھی سیکھی اور مغربی طرز زندگی سے بھی آشنائی حاصل کی۔ مشہور فلم ”ہنگ اینڈ آئی“ اسی دور کی کمائی ہے۔ اگرچہ تحالی لینڈ کی اپنی فلموں کی کمائیاں امریکن فلموں سے بالکل مختلف ہوتی ہیں، مگر ان کی کمائیوں اور ہماری قلمی کمائیوں میں رتی بھر فرق نہیں ہوتا۔ صرف فرق ہوتا ہے تو لباس کا اور زبان کا۔ مگر آبکل تو ہمارے فلمازوں نے وہ فرق بھی قریباً ختم کر دیا ہے۔ کیونکہ زیادہ تر قلمیں بنکاک کے فنکاروں کے ساتھ تحالی لینڈ کے مناظر میں فلمائی جاتی ہیں۔ دیسے ایک اپنی فلموں میں وہی ایک بابہ شریف کو غریب نہیں سے محبت۔ پھر ظالم سماج راستے کی دیوار۔ ان گھنٹت مشکلات کے بعد دونوں کا مطابق اور بس اللہ خیر سلا۔ ہاں تو یہاں ذکر مذہبی رسومات کا ہو رہا تھا۔ موجودہ پادشاہ ۱۹۶۳ء میں تین ہفتے کے لئے پروردہ بننا رہا۔ اس نے بھی دوسرے پروردہوں کی طرح اپنا سرمذوایا اور دوسرے کام سرانجام دیے۔ کچھ عورتیں بھی صفاتا بدھ کے نام پر زندگی وقف کر دیتی ہیں۔ ان کی پچھان ان کے سفید لبادوں سے کی جاسکتی ہے۔

بنکاک کے تاریخی مقلات میں سب سے اہم بدھ منادر ہیں۔ درویش اول نے رات کو ان مقلات کے بارے میں تفصیلی مطالعہ کیا اور صبح ہم ان کی سیر کو نکلے۔ بنکاک میں پانچ سو کے قریب مندر ہیں۔ ان سب کو دیکھنا تو ناممکن ہے مگر ان میں چند ایسے ہیں جنہیں دیکھے بغیر مندوں کی سیرادھوری رہ جاتی ہے۔ سب سے پہلے ہم شاہی محل کے اس مندر میں گئے جس میں گوم بدھ کا اڑھائی فٹ اونچا ہرے رنگ کے قیمتی پتھر کا مجسمہ ہے۔ یہ بت ۹۷۴ء میں لاڈوں میں جنگی کامیابی کے بعد ملا۔ اہل

کے لیے بھکشو بنا ہوا تھا۔ اپنے بھکشو پن کے دوران اکثر نوجوان اپنی آئندہ زندگی کے راستے کا تعین کرتے ہیں۔ یہ اصلاح نفس کا بہترین طریقہ ہے۔

تحالیٰ لینڈ میں لازمی مذہبی سروس کے علاوہ لازمی فتحی سروس بھی ہے۔ جو ہر نوجوان کو دو سال کے لیے کرنی پڑتی ہے۔

فتحی ملازمت پچھے طبقے کے نوجوانوں کے لیے اونچے حلقوں میں داخلے کا شارٹ کٹ ہے اور وہ وردی پہننے ہی شودر سے برہمن بن جاتے ہیں۔ اگرچہ ہندو کاست سشم کے مطابق تو برہمن کے رتبے کو کوئی نہیں چھو سکتا مگر تیسی دنیا کے انقلابی فوجیوں نے ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے مذہب کو اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ چنانچہ مذہب اور "صلل" (مضبوطی) کے اس جوڑ توڑ نے آزادی کی کمر توڑ دی ہے۔

وہ نوجوان بھکشو ہمارے ہمراہ ہو گیا۔ اس نے اپنی انگریزی کی اصلاح کرنے کی سوچی اور ہم لوگوں کو مفت میں گائیڈ مل گیا۔ اس نے درویش اول کی خوش بخت پیشانی کو دیکھتے ہوئے جیران ہو کر پوچھا۔ "آپ کس مذہب کے بھکشو ہیں؟" اس کے نزدیک ہر سرمندا بدھ بھکشو ہوتا ہے۔ مگر اس نہیں سرمنڈے کو دیکھ کر وہ اس کے مذہب کا اندازہ نہ لگا سکا۔ درویش اول نے اس وقت تو کھانی ہنس کر بات مال دی مگر بعد میں اس نے تحالیٰ ہیئت کو اپنے لباس کا مستقل حصہ بھالیا۔ یہاں تک کہ ہوش میں ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جاتے وقت بھی ہیئت سر سے نہ آتا تھا۔ کوئی بعد نہیں کہ وہ غسل بھی ہیئت سمیت ہی کر ڈالتا ہو۔

اس نوجوان پروہت نے پہلے چھوٹے چھوٹے پگوڑے دکھائے۔ یہ پگوڑے امیر خاندان کے تھے اور ان میں ان کے مردوں کی خاک دفن تھی۔ جوں ہی کسی خاندان کا فرد فوت ہوتا ہے اور اس کی راکھ دفن کی جاتی ہے تو اس پگوڑے کو تھے سرے سے رنگ کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ پگوڑوں پر تازہ رنگ اس بات کی نشانی ہوتا ہے کہ اس خاندان میں کوئی موت ہوئی ہے۔ اسی طرح چار بڑے بڑے پگوڑے تھے جو تحالیٰ لینڈ کے چار بادشاہوں نے اپنے اپنے وتوں میں تغیر کروائے تھے۔ اس مندر

تحالیٰ لینڈ کا عقیدہ ہے کہ جب تک یہ بت سلامت ہے ملک آزاد و آباد رہے گا۔ مندروں کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ سرخ اور سبزے رنگ کا کام اس خوش اسلوبی سے کیا گیا ہے۔ کراکاریگروں کی مذہبی عقیدت ایک ایک نقش سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس مندر میں ہم نے بھی اگر تیاں جلا میں اور باہر رکھے ٹین کے بکس میں نذرانے کے پیے ڈالے۔ کچھ اور عقیدت مند مجتہد کے سامنے سجدے بھی کر رہے تھے اور دعائیں بھی مانگ رہے تھے۔ مندروں کے سامنے ثواب کے لئے لوگ قیدی پرندوں کو خرید کر آزاد بھی کرتے ہیں۔ ایک رسم نرالی تھی۔ وہ یہ کہ لوگ جوں پر سونے کے ورق لگاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ تمام بت سبزے ہوتے ہیں۔ واث پو مندر میں ۴۰ فٹ لمبا اور ۳۰ فٹ اونچا بست سونے کے ورقوں میں اس طرح چھپا ہوا ہے کہ ویکھنے والا سے سونے کا مجسمہ ہی سمجھتا ہے۔ مگر ایک مجسمہ اندر لا ویران مندر میں ایسا بھی ہے جس میں سونے کے ورق نہیں بلکہ وہ اصلی سونے کا ہے اور اس کا وزن ساڑھے پانچ شن ہے۔ شاہی محل کے جس احاطے میں اس ایمپریلہ بدھ کا مندر ہے وہیں شاہی ہتھیاروں اور سکوں کا عجائب گھر بھی ہے۔ موجودہ بادشاہ نے اپنی رہائش کے لئے شاہی محل کی بجائے چڑالا محل کو ترجیح دی اور اس طرح یہ محل اب صرف سرکاری تقریبات کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ دنیا کے ہر شاہی محل کی طرح یہاں بھی شاہی حرم موجود ہے، جہاں بادشاہوں کی ملکائیں شہزادیاں اور کنیزیں رہا کرتی تھیں۔ حرم کے گھٹ کے اس پار بادشاہ کے علاوہ کوئی مر نہیں جاسکتا تھا۔ ہاں "نیوٹل" تخلوق کو اندر جانے کی اجازت تھی۔ درویش اول نے گھٹ کے اندر جھانکنے کی کوشش کی تو درویش دوم نے اسے کہا۔ "تم تو اندر جا سکتے ہو.... تم لوگوں پر تو کوئی پابندی نہیں" صرف مردوں کو جانے کی اجازت نہیں" درویش اول نے اس فقرے کو سرے سے نظر انداز کیا اور متواتر اندر جھانکنے کی تک دو کرتا رہا۔ حالانکہ اندر ماضی رفتہ کی یادوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ واث پو (برگد والا مندر) گئے تو وہاں ایک نوجوان بھکشو سے ملاقات ہو گئی۔ جو بناک یونیورسٹی میں آنکھ کا طالب علم تھا اور اپنی مذہبی رسم کو پورا کرنے کے لیے چھ میں

ضوری ہے کہ وہ روحوں سے اپنے گھر کو پاک کرنے کے لیے گھر کے کسی کو نہ میں روحوں کے لیے بھی چھوٹا سا گھر تعمیر کرے۔ روحوں کے لیے فٹ یا دوفٹ کے بنے بنائے گھروندے مل جاتے ہیں جو کئی لوگ بیچنے کی خاطرف پا گھوں پر لیے پھرتے ہیں۔ صرف یہ گھروندے بنانا ہی کافی نہیں بلکہ ان میں روحوں کے لئے خوارک رکھی جاتی ہے، پھول چڑھائے جاتے ہیں اور اگر تیار جلائی جاتی ہیں۔ تھائی لوگوں کی زندگی میں نیک روحوں اور بد روحوں، دونوں کا بڑا دخل ہے۔ وہ تعمیز گندوں پر پورا یقین اور بھروسہ رکھتے ہیں۔ گومت بدھ کی شبیہیں اور دس آنکھ والی دیوبی کے چھوٹے چھوٹے مجتنے گلے میں لٹکانے سے ہر بلا دور ہو جاتی ہے۔ گازیوں کے حادثے نہیں ہوتے۔ دشمن کو کامیابی نہیں ہوتی۔ محبوب کو رام کرنا ہو تو منیش مانی جاتی ہیں۔ کسی چیل نما سے پچھا چھڑانا ہو تو منیش مانی جاتی ہیں۔ منیش پوری ہوں تو چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں۔ نہ پوری ہوں تو مزید منیش مانی جاتی ہیں۔ اپنا کاروبار جاری رکھنے کے لئے یہ تعمیز وینے والے بھی بڑی استاریاں دکھاتے ہیں۔ تعمیزوں کے ساتھ ایسی ایسی کڑی شریں رکھتے ہیں کہ جن کو پورا کرنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ اگر خوش قسمتی سے تکا لگ گیا تو ان کی کرامات کو کہیٹ پہنچتا ہے اور اگر نارادی ہو تو الزام کوئی نہ کوئی شرط نوٹھے پر دھر دیا جاتا ہے۔ مثلاً ہمارے گاؤں کے ایک نوجوان عطا ڈھنی کو ایک الحڑ بھیشاری سے پیار ہو گیا۔ برسات میں محبت اور لمبیا گاؤں میں شدت اختیار کر جاتے ہیں اور اکثر نوجوان ان کا شکار ہوتے ہیں۔ عطا ڈھنی نے مولوی شاہ الدین کا اکلوتا پاؤں پکڑ لیا۔ اکلوتا اس لئے کہ مولانا کا ایک پاؤں لاغر ہو گیا تھا اور وہ کھنوڑی سے چلتے تھے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ان کا پاؤں کسی عشقیہ واردات کا شکار ہو گیا تھا۔ شاید اسی لئے محبت کے مارے نوجوان ان کے عشقیہ تعمیزوں پر پورا یقین رکھتے تھے۔ چالیس دن کا چلہ کٹوانے کے بعد مولانا نے عطا ڈھنی کو تعمیز تو دیدیئے مگر کامیابی کے لئے دو شریں لگا دیں۔ پہلی یہ کہ ایک تعمیز کو پانی میں گھوول کر بھیشارن کو نمار منہ پلانا تھا۔ اور دوسرے تعمیز کو سیاہ ململ میں باندھ کر محبوب کے

میں سب سے دلچسپ جگہ وہ تھی جہاں ایک دیوار پر انسانی جسم کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ پروہت نے بتایا کہ یہ تصویریں طالب علموں کو انسانی جسم کی تعلیم دینے کے لئے بنائی گئی تھیں۔ اس ننانے میں تعلیم صرف مندرجہ میں دی جاتی تھی۔ گواب بھی ہم نے سینکنڈوں لڑکیوں اور لڑکوں کو ان تصویریوں کے سامنے کھرا پایا جو اپنی کاپوں پر ان کی نقشیں اتار رہے تھے۔ پروہت نے مزید بتایا کہ ان تصویریوں کے ذریعے لڑکیوں کو جسمانی ماش کی تربیت دی جاتی تھی۔ بدھ مذہب کی رو سے عورت مرد کو سکون پہنچانے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اس آرام میں جسمانی آرام بھی شامل ہے۔ چنانچہ عورتوں کو باقاعدہ ماش کی تعلیم دی جاتی تھی تاکہ وہ اپنے خاوندوں کی خدمت کر سکیں۔ آج بھی وہ تعلیم دی جاتی ہے مگر سب عورتوں کو نہیں۔ آج جو عورتیں یہ ہنر سیکھتی ہیں وہ اپنے مجازی خداوں کے لئے نہیں بلکہ ان سیاحوں کے لئے جن کی جیب میں ڈال رہتے ہیں۔

صبر و تحمل، بردباری اور مستقل مزاجی گومت بدھ کی تعلیم کا ایسا کرشمہ ہے جو ہر تھائی میں موجود ہے۔ ہم نے اپنے قیام کے دوران بھی کسی کو لڑتے نہیں دیکھا۔ ہر شخص کے چرے پر مسکراہٹ ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں تو ہر چوک پر زور آزمائی ہوتی ہے۔ مگر وہاں غصہ کرنے والے کو بہت بد تمیز سمجھا جاتا ہے۔ وہاں ایک دوست نے بتایا کہ اگر کوئی توکر پر غصہ ہو تو نوکر جھگڑا کرنے کے بجائے کام چھوڑ کر چلا جاتا ہے اور اپنی تنخواہ بھی نہیں لیتا۔ اسی قسم کا ایک واقعہ ہمارے ساتھ بھی ہوا۔ جس دن ہم نے مندرجہ کی سیر کی ایک نیکی والے کے ساتھ مقروہ وقت سے کچھ زیادہ دیر ہو گئی۔ اسے ملے شدہ پیسے دینے چاہے تو اس نے قبول نہ کئے مگر، جھگڑا کرنے کی بجائے وہ چپ سادھ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ اس کی خاموشی سے ننگ آکر درویش دوم نے اپنے اصولوں کو توڑ کر نیکی والے کو فالتو پیسے دے دیئے۔

تھائی لینڈ میں چند مذہبی رسمیں ایسی ہیں جو بہت دلچسپ ہیں اور لوگ ان رسومات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ اگر کوئی شخص نیا گھر بنانے تے تو اس کے لئے

دائیں زانو میں باندھنا تھا۔ کوئی چھہ سینے کی تگ و دو کے بعد پہلی شرط تو پوری ہو گئی  
مگر دوسرا شرط کون پوری کرتا، اور جو کوئی وہ شرط پوری کرنے کے قابل ہو جاتا تو پھر  
اس کو تعویذ باندھنے کی کیا ضرورت تھی۔ کچھ اسی طرح کے حالات بنکاک میں دکھائی  
دئے۔ درویش دوم نے ایک مندر میں درویش اول کو بڑی سنجیدگی سے مشورہ دیا کہ  
بده بجستے کے سہانے جلتی موم میں کا گرم موم اگر اپنے سر پر لگا لے تو یقیناً تیرا سر  
زرنیز ہو جائے گا۔ مگر درویش اول نے اس کی بات کا یقین نہیں کیا اور اب تک اس  
کا سر بخیر ہے۔

جس طرح تاج محل انسانی عظمت کا عجوبہ ہے اسی طرح دریائے کوائی کا خونی  
پل Bridge on the river Kwai بھی انسانی بربریت کا ایسا شاہکار ہے  
جس کی مثل ہیروشیما اور ناگا ساکی کے علاوہ شاید ہی کہیں ملتی ہو۔ چنانچہ ایک صبح  
اس پل کو دیکھنے کے لئے ہم نے رلوے شیشن کی راہ اختیار کی۔ اتوار اور دوسرا  
تعلیمات کے دنوں ٹرین صبح آٹھ بجے کے قریب روانہ ہوتی ہے اور تمن کھنے میں ایک  
سو تیس میل کا سفر طے کر کے کافی بوجی کے شیشن پر پہنچتی ہے۔ یہ پل اس شر  
کے قریب بنا یا گیا ہے۔ ٹرین کا ذکر آیا تو آپ کے ذہن میں عوامی ایکپریس کا خاک  
بیٹا ہو گا، جس میں سیٹ حاصل کرنے کے لئے سرخ پوش تخلوق کو دس روپے کا نذرانہ  
پیش کرنا پڑتا ہے۔

بنکاک کی ٹرین میں اس قسم کا ڈرامائی منظر دیکھنے میں نہیں آیا بلکہ صاف د  
شفاف ڈبوں میں لوگ آرام وہ سیٹوں پر بیٹھے تھے۔ اس ڈبے میں ہمارے علاوہ کوئے اور  
جاپانی سیاح تھے جو اپنے بزرگوں کے ہنائے ہوئے پل کو دیکھنے جا رہے تھے۔ ان میں ہر  
ایک پوری طرح کیروں سے لیس تھا۔ جونی کسی شیشن پر ٹرین رکتی پلیٹ فارم پر  
ہاکروں کا حملہ ہو جاتا اور ہمارے جاپانی ساتھی کیروں سے جواباً بھرپور حملہ کر دیتے۔  
اوھر لڑکیاں مسکرا کر چھوٹی پہنچیں اور اوھر جاپانی ووست مسکرا کر  
تصویریں اتارتے جاتے۔ ٹرین کا یہ سفر بڑا خوشگوار تھا۔ کیونکہ ہم لوگ تھائی لینڈ کے

ہرے بھرے میدانوں اور گھنے جنگلوں سے گزر رہے تھے۔  
دوسری جنگ عظیم میں جاپانیوں نے اس علاقہ پر قبضہ جمالیا تھا اور اتحادیوں  
نے یہاں ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ جاپانیوں نے براہ کے محاذ پر جانے کے لئے رلوے  
لائن بچانے کا منصوبہ بنایا۔ موت کی ان کڑیوں کو جوڑنے کے لئے اس خونی پل کی  
ضرورت تھی۔ چنانچہ اس کام کیلئے اتحادی جنگی قیدیوں کو اس مقام پر لا یا گیا۔ اس  
پل کی تعمیر کے دوران تقریباً نو ہزار اتحادی فوجی جاپانیوں کی بربریت کا نشانہ بنے۔ دوسرے  
کو ہم اس پل کے قریب پہنچے۔ جاپانیوں کے علاوہ اور بھی بہت سے ملکوں کے سیاح  
موجود تھے۔ چند لمحوں کے لئے تو میں اپنے آپ کو ان جاپانی سیاحوں کا قیدی تصور  
کرنے لگا اور ان کے کیرے شین گزنا کا روپ دھار گئے۔ دریائے کوائی، لبروں میں  
ظلم تم کی یاد چھاٹنے خاموشی سے بہہ رہا تھا۔ اس کے کناروں پر ہیلے ہوئے گھنے  
جنگلات کے قد آور درختوں کے سائے میں بھوکے، کمزور، یہار اور تھکے ماندہ قیدی  
ستانے کیلئے بیٹھے ہوں گے۔ پل کے قریب ہی قبرستان ہے جس کی ہر قبر انسانیت  
کے لیے ایک سوالیہ نشان تھی۔ جہاں خالی بھی انسان اور مظلوم بھی انسان تھے۔ جہاں  
جاہر بھی انسان اور مجبور بھی انسان تھے اور جہاں انسانیت بال کھولے نوحہ خواں تھی۔  
شام کو بنکاک پہنچے تو کافی تھک چکے تھے۔ دراصل تھکادٹ تو ایک بہانہ تھی۔  
اصل وجہ تو کچھ اور ہی تھی۔ بنکاک میں تھکادٹ دور کرنے کا توبت آسان طریقہ ہے  
غسل کے لیئے حمام جائیے جہاں ماش بھی کی جاتی ہے اور غسل بھی دیا جاتا ہے۔ یہ  
دونوں کام کرنے کے لیے خوبصورت تھائی لڑکیاں مامور ہیں۔ چنانچہ ہم لوگ تھکادٹ  
دور کرنے کے لیے فوراً سوانا باٹھ Swana Bath کے لئے چلے گئے۔  
سوانا باٹھ کی ابتداء قدیم دم یا یوٹن یا ترکیہ یا جاپان سے ہوئی اس سے ہمیں  
بجھ نہیں، مگر اتنا ضرور بنکاک میں ہو گئی ہے۔ جس سے ملے اسی نے سوانا باٹھ کا  
ذکر کیا۔ رہا درویش اول تو وہ انتا پسند قسم کا سیاح تھا۔ وہ ہر تجربہ ذاتی طور پر کرنے کی  
آرزو لے کر گھر سے نکلا تھا اور پچی بات تو یہ ہے کہ مجھے اس غسل کے بارے میں

سب باتیں جھوٹی لگتی تھیں۔ کیونکہ میں اتنبول میں ایک بار دھوکہ کھا چکا ہوں۔ طالب علمی کے زمانے میں بھی مجھے سیاحت کے دورے پڑتے تھے۔ اتنبول میں ٹرکش باتحہ کا برا نزکہ سنا تھا۔ چنانچہ میں بھی راجہ اندر بننے کی آرزو لے کر حمام میں داخل ہوا۔ میں نے قدم اندر رکھا ہی تھا کہ ایک ہاتھ میری جانب بڑھا۔ صنف نازک کا نہیں بلکہ ایک مرد ترک کا مفبوط اور خوفناک ہاتھ۔ اس نے مجھے کیلے کی طرح چھیل دیا۔ گردن سے دوچ کر بڑے سے ٹب میں غوطہ دیا۔ پھر ہاتھوں میں رہب کے دستانے پہنے مجھے گرم سگ مرمر کے فرش پر لٹایا اور زور زور سے ماش کرنے لگا۔ یہ ماش واقعی ماش تھی۔ میں اس اچاک حملے سے ذرا سنجلا تو ادھر ادھر نظر دوڑائی کہ شاید کہیں کوئی خاتون نظر آئے، جو اس سزا کے بعد دکھتے جسم کو سکون پہنچا سکے۔ مگر ادھر ادھر تو لاشیں تھیں، صحت مند لاشیں، جو گرم فرش پر لیٹی پیٹ کی چوبی پکھلانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ٹرکش باتحہ کے بعد چار دن بدن دکھتا رہا تھا۔ چنانچہ سوانا باتحہ سے خوف میرے لئے فطری تھا۔ مگر پاپک کے پر زور اصرار پر میں اس کے لیے راضی ہو گیا۔

وہاں پہنچے تو ایک بڑے شوکیں کے ہو رہے۔ اچھی صورت تو ایک بھی نظر آجائے تو خون کی گردش تیز ہو جاتی ہے اس شوکیں میں تو دو سو جوانیاں بھی ہوئی تھیں۔ ہمارے ہاں تو خواتین کا اتنا بڑا اجتماع کہیں بھی نہیں ہوتا۔ دل سرکش گھوڑا بن گیا۔ میں تو سمجھا کہ یہ میری شینیں سیل کی چھاتی کو توڑ کر باہر نکل جائے گا، مگر ایسا نہ ہوا۔ درویش دوم گرگٹ کی طرح رنگ بدل رہا تھا۔ درویش اول نے مجھے دھکیل کر کاؤنٹر کے قریب کر دیا۔ میزگر نے جھک کر نہیں فرشی سلام کیا اور کاروباری بات شروع ہوئی۔ شیخے کے اس کمرے میں ان گنت ماہرین ماش بیٹھی تھیں۔ گاہک تو لڑکیوں کو دیکھ کر کھلتے تھے۔ مگر لاکیاں قصابوں کو نہیں دیکھ پاتیں۔ ہر لڑکی کے کوت کے ساتھ ایک نمر لگا ہوتا ہے۔ میزگر گاہک کی پسند کے نمبر کو باہر بلوایا تھا۔ اس عسل کے لئے تقریباً بیس ڈالر ادا کرنے پڑتے چلا کہ وہ انگریزی سے پیدل ہیں اور

ہی اچھا ہو آخری عسل بھی ملائکی بجائے ان ہی کے جھرمٹ میں ہو۔ یہ بلڈنگ ہوئی کے مانند تھی۔ ہمیں عسل کے لیے تیسری منزل پر جانا تھا۔ تینوں درویشوں کو ایک ساتھ کر کے مل گئے۔ میں نے دل کڑا کیا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ پورے کمرے میں قالین بچھا تھا۔ ایک طرف تخت رکھا تھا۔ ایک کری کے سامنے ٹب تھا۔ ایک ٹیلیویژن اور ایک ٹیلیفون کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ اس عسل کی کئی منزلیں ہیں اور ہر منزل کی اپنی چیزیں گیاں ہیں۔ مگر سب چیزیں کے باوجود اس عسل کے بعد تھا کہ دوسرے ہوتے ہیں اور انسان پھر سے تازہ دم ہو جاتا ہے۔

عسل سے فارغ ہوئے تو درویش اول نے پیدل سیر کی ٹھانی۔ چنانچہ ہم انسانی جسموں کے ٹھانیں مارتے سمندر میں کوڈ گئے۔ شانوں سے شانے کلرانے لگے۔ یہ پہلا موقع تھا جب درویش اول اپنے ہنگر نما کندھوں کا شدت سے استعمال کر رہا تھا۔ ادھر درویش دوم موم سی گڑیوں کے جھرمٹ میں بینیے کی طرح ٹکس جاتا اور سب کو تتر ہتر کرتا آگے نکل جاتا۔ دونوں درویشوں نکلیں مارنے میں اتنے گم ہو گئے تھے کہ انہیں کسی چیز کا ہوش ہی نہ تھا۔ مگر میں بھوک سے بے ہوش ہو رہا تھا۔ میری سب سے بڑی کمزوری بھوک ہے۔ میں نے دونوں درویشوں سے الیگا کی کہ کچھ خوراک کے بارے میں بھی غور کرو۔ وہ تو بھوکی آنکھوں کو خوراک پہنچا رہے تھے میری بھوک کا کس کو احساس ہوتا۔ میں نے بھی اپنے بنیادی مطالبے کو منوانے کے لئے دمکی دی۔ بھوک ہڑتاں کرنے کی تو ضرورت نہ تھی کیونکہ میں پہلے ہی بھوکا تھا۔ اس دور میں شرافت سے زیادہ دمکی کام آتی ہے۔ اس لئے وہ فوراً رضامند ہو گئے اور مجھے کھانا کھلانے کے لئے ایک بڑے ہی پھیپھی قدم کے رستوان کا انتخاب کیا۔ پورے بنکاں میں شاید یہی ریستوراں تھا جس میں انگریزی زبان کا قحط تھا۔ ورنہ تو ہر جگہ لوگ انگریزی سمجھتے ہیں۔ میرے دونوں ساتھیوں نے ایک میز پر قبضہ جمایا اور میں کاؤنٹر پر بیٹھی بڑی بی کو کھانے کا آرڈر دینے لگا۔ بڑی بی چینی کے بڑے سے پیالے میں چاول ڈالے مزے سے کھا رہی تھی۔ بات کرنے پر پتہ چلا کہ وہ انگریزی سے پیدل ہیں اور

بہت سے پرائمری سکول کھوں دیئے ہیں۔ طلباء کی اس بڑی تعداد کے باوجود ہرگز اپنے کام کا نام نہ کہا جاتا تو یہی مروہ دل۔ ہمارے طلباء کو دیکھو۔ مجال ہے جو ان کی مرضی کے خلاف کوئی امتحان ہو سکے۔ کلاشن کوف کے زور پر اپنے مطالبے منوائے ہیں۔ اپنی مرضی سے ٹرینک بند کرتے ہیں اور کھو لتے ہیں۔ جب چاہتے ہیں بسیں جلاتے ہیں اور جب چاہتے ہیں بسیں چلاتے ہیں۔ ہوش باقاعدہ چھاؤنیاں بن گئے ہیں۔ مگر ان مخصوصوں کو ان قدروں کا ذمہ دار ٹھہرانا ناافسانی ہے۔ نئی نسل پرانی نسل سے توجہ چاہتی ہے اور حق مانگتی ہے، تعلیم کا حق، تربیت کا حق اور روزگار کا حق۔۔۔ یو نیتیں بند کرنا، آنسو گیس، گدیلے باندھے باور دی غنڈے اور جلدی منتشر کرنے والی بکتر بند گاڑیاں۔۔۔ کب تک؟ طلباء کو میں زندگی میں ایسی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ قوم کے معماروں پر مخصر ہے کہ اس قیمتی سرمائے کو تعمیری کاموں کے لئے استعمال کیا جائے یا تحریکی عمل کے واسطے۔

پاکستان اور انڈونیشیا میں طلباء کو صرف پولیس اور فوج کی نشانہ بازی کے لئے استعمال کیا گیا ہے اور کیا جا رہا ہے ہمارے طلباء سیاست دانوں کی یادوں میں اگر بے جگری سے خون بھاتے رہے ہیں، بھار رہے ہیں اور شاید بھاتے ہی رہیں گے۔ اس خون کا کچھ تو حساب ہو گا؟ کبھی تو حساب ہو گا؟

تحالی لینڈ میں عورت کو ہاتھی کی پچھلی نانکیں کما جاتا ہے۔ اس کماتوں میں بڑی صداقت ہے۔ کیونکہ ہاتھی تمام کام اپنی پچھلی نانگوں کی طاقت کے مل بوتے پر کرتا ہے۔ کچھ یہی مقام تحالی لینڈ میں عورت کا ہے۔ اصل طاقت اگرچہ عورت کی ہے مگر مردوں کی موچھیں اپنی (تحالی لینڈ میں ۹۵% نیصد لوگ کلینڈ شو ہیں) رکھنے کے لئے وہ ہمیشہ پس پردہ رہتی ہیں، بر قعے میں نہیں۔ بناک میں بیشتر سور اور دکانیں عورتیں چلاتی ہیں۔ جس دکان پر سب سے زیادہ خوبصورت لڑکیاں ہوں گی اسی جگہ سب سے زیادہ رش ہو گا اور زیادہ بکری بھی۔ ہمارے ہوش کے نزدیک ایک جzel سور پر بڑی

میں تحالی زبان سے۔ کھانے کا آرڈر دیتے تو کیسے؟ دوسری میزوں پر بیٹھے کھانے سے ستمحہ گھٹھا ہوتے لوگوں کی ملیٹوں پر ایک نظر درڑائی۔ کچھ سمجھنے آئی۔ پھر اللہ کا نام لے کر بنا سمجھے ہی کاؤنٹر پر بھی چیزوں کی طرف اشارہ کر کے آرڈر دیدیا۔ جب کھانا آیا تو ہم ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ چاول اور جھینگے کے علاوہ ہر خوارک معدود تھی۔ پھر درویش اول نے مزید وہم ڈال دیا کہ ہو سکتا ہے اس خوارک میں مگر مجھ کا گوشت شامل ہو۔ چنانچہ چاول اور جھینگے کے علاوہ ہر پلیٹ کو ایک طرف ہٹایا اور ان کی طرف رغبت کی۔ جھینگے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا جیسے یہ پکے نہ ہوں بلکہ پلیٹ میں آرام کر رہے ہوں اور ادھر ہم کھانے کے لیے ہاتھ بڑھائیں گے ادھر وہ پلیٹ سے بھاگ کھڑے ہوں گے۔ چنانچہ مابدلت نے چاول کھانے کی کوشش کی۔ پہلے نوالے کو گلے میں دھکلینے کے لیے پانی کا گھونٹ پیا تو معلوم ہوا جیسے پنچھر کا گھونٹ بھر لیا ہو۔ ان لوگوں نے جرا شم مارنے والی دو کچھ زیادہ ہی مقدار میں ڈال رکھی تھی۔ اس بدمنہ خوارک سے جان چھڑائی اور سیدھے ہوش کی راہ اختیار کی۔

بناک اور میلا دو ایسے شریں جنہیں نوجوانوں کے شر کرتا چاہئے۔ دونوں جگہ آبادی کا بست بڑا حصہ نوجوانوں پر مشتمل ہے اور ان میں اکثر تعداد طلباء اور طالبات کی ہے۔ بناک میں صبح، دوپر اور شام سڑکوں پر طلباء کی طبادکھائی دیتے ہیں، جو سفید قیص یا بلاوز، کالی نیکر یا سکرت، سفید جرابوں اور سیاہ یوٹوں والی وردی پنے اور ادھر اور اپنے جاتے دکھائی دیتے ہیں۔ طلباء کی اس بڑی تعداد کا سبب یہ ہے کہ تحالی حکومت عوام کی تعلیم پر بست نور دیتی ہے۔ چھ سے چودہ سال کی عمر کے بچوں کے لیے تعلیم لازمی ہے اور تعلیم کا تمام خرچ حکومت کے ذمے ہے۔ اسی لیے وہاں تعلیم اور دفاع کا بجٹ برابر ہے۔ تحالی لینڈ میں ستر فی صد لوگ تعلیم یافتہ ہیں۔ تعلیم کی یہ کثرت، ۱۹۷۱ کے بعد ہوئی جب چولاگ کوان Chulong Coan یونیورسٹی کی بنیاد رکھی گئی۔ اس سے پہلے تو تعلیم مندوں میں دی جاتی تھی۔ مندوں کی تعلیم کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ مگر صرف دیساتی علاقوں میں۔ اور وہاں بھی حکومت نے

یہ دونوں مکہ باز رنگ میں پہنچ تو کمودر مکہ باز نے اپنی آواز میں کہا۔ ”بیٹھ سے پہنچ مکہ مارنا فاؤں ہے“۔ اور ساتھ ہی کمر سے بیٹھ اتار کر سر پر باندھ لی۔ مجھے تھائی یینڈ کی یہ زالی باکنگ دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ مگر درویش اول کو تو مارکٹائی والی فلمیں دیکھنے کو لے جانا مشکل تھا جلا باکنگ کے لئے وہ کب تیار ہوتا۔ میں نے درویش دوم کی طرف رجوع کیا تو اس نے بھی کوئی خاص لفت نہ دی۔ درویش دوم کو سوانا باتھ کا بہت شوق تھا۔ لیکن اس کی غسل کی درخواست ہماری کا یہ نے روک دی تھی۔ میں نے کہا ”اگر تم باکنگ دیکھنے چلو تو پھر ہمیں دوبارہ سوانا باتھ کے لئے چلے جائیں گے“۔ اس لامبے میں آگر وہ راضی ہوا تو میں نے درویش اول کے خلاف بغاوت کر دی۔ درویش اول بادل ناخواستہ اس شرط پر مان گیا کہ ہم میں باکنگ رنگ سے دور رہیں گے۔

تحائی باکنگ کی ابتداء تو اس زمانے میں ہوئی جب تھائی یینڈ اور برا کے درمیان جنگیں ہوتی تھیں۔ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ نائی کوم نوم نای ایک جنگی قیدی نے برا کے بادشاہ کے سامنے باکنگ کے مقابلے میں مشورہ مکہ بازوں کو یکے بعد دیکھ کر شکست دی۔ بادشاہ اس قیدی سے اتنا خوش ہوا کہ اسے فوراً اس کے ساتھیوں سمیت آزاد کر کے تھائی یینڈ بھیج دیا۔

شینڈیم لوگوں سے کچھ بھرا ہوا تھا۔ ہم نے اپنی میٹھیں سنبھالیں اور بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔ دونوں مکہ باز رنگ میں پہنچے۔ ایک نے سرخ نیکر پن رکھی تھی اور دوسرے نے گھری نیلی۔ سب سے پہلے دونوں مکہ بازوں نے والی کرد کیا۔ یعنی تین مرتبہ رنگ میں سجدہ کیا۔ اس کے بعد ایک دوسرے کے ارد گرد ناچ کر تین تین چکر کاٹے۔ دونوں نے اپنے بازوؤں پر کچھ متبرک چیزیں (جیسے ہمارے ہاں تعویذ ہوتے ہیں) باندھ رکھی تھیں۔ مقابلہ شروع ہوا۔ دونوں مکہ بازوں کی جیت پر باقاعدہ شر میں گلی ہوئی تھیں۔ لوگ اپنے اپنے مکہ باز کو حوصلہ دینے کے لئے نفرے لگا رہے تھے۔ کھلیل بہت دلچسپ تھا۔ جوں جوں مکہ کی رفتار بڑھتی گئی لوگوں کا جوش و

خوبصورت سیلز گز تھیں۔ درویش اول ہر گھنٹے کے بعد کوئی نہ کوئی بمانہ تراش کر وہاں پہنچ جاتا۔ انہیں بمانوں کے دوران اس نے کوئی آدمی درجن مکنگیاں بھی خرید لیں۔ حالانکہ اس کی زلفوں کے لیے تو ایک سکھی بھی فضول خرچی تھی۔ سورتوں کا داخل صرف تجارت تک ہی محدود نہیں بلکہ رہنمائی علاقوں میں کھیتی باڑی کا کام بھی انہوں نے سنبھال رکھا ہے۔ تھائی یینڈ میں پچاسی فیصد لوگوں کے پاس اپنی زینیں ہیں۔ اوسٹا ”ہر شخص کے پاس چھ ایکڑ کے قریب زین ہے۔“ کھیتوں میں زیادہ تر چاول کی کاشت ہوتی ہے۔ چاول اتنے زیادہ پیدا ہوتے ہیں کہ تھائی یینڈ غیر ممالک کو چاول بھیجتا ہے۔ اسی طرح بے شمار مچھلی دریاؤں سے ملتی ہے۔ چنانچہ ملک خوراک کے معاملے میں خود کفیل ہے۔ جب سورتیں کھیتوں میں چاول کی کاشت کرتی ہیں تو مردگر میں بچوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں، جو اکھیتے ہیں، مرغے اور پالتو مچھلیاں لڑاتے ہیں۔

تحائی یینڈ کے باشندوں کو باکنگ کا بہت شوق ہے۔ اس شوق کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ بنکاک میں ہفتہ میں تین دن باقاعدہ باکنگ کے مقابلے ہوتے ہیں۔ اور ہر مقابلے کو دیکھنے کے لئے لوگوں کا بڑا ہجوم ہوتا ہے۔ وہ باکنگ کے مقابلے دیکھنے اسی طرح جاتے ہیں جیسے یہاں لوگ پنجابی فلمیں دیکھنے جاتے ہیں۔ تھائی یینڈ کی باکنگ بھی دنیا سے زالی ہے۔ اس عجیب و غریب باکنگ میں اگر محمد علی بھی حصہ لے تو مجھے لیکھن ہے کہ یہاں کے کسی معمولی سے باکسر کے ہاتھوں شکست کھا جائے۔ کیونکہ اس باکنگ میں صرف بال کھینچتا اور تھوکنا منع ہے۔ اس کے علاوہ کبھی گدوں کی طرح دولتیاں چلتی ہیں اور کبھی مینڈھوں کی طرح سر نکراتے ہیں۔ کبھی ہاتھوں سے حملہ ہوتا ہے اور کبھی پاؤں سے۔ باکنگ کے متعلق ایک لطیفہ مشورہ ہے۔ گھستے ہیں کہ ایک مرتبہ کسی سُنکل پلی کے آڈی نے کسی مشورہ باکسر کو مقابلہ کرنے کے لئے چینچ دے ڈالا۔ اس مقابلے کو دیکھنے کے لئے بت سے لوگ جمع ہوئے۔ باکنگ کے اصول کے مطابق بیٹ (پیٹ) کے بینچے مکہ لگانا فاؤں قرار دیا جاتا ہے۔ اور جو مکہ باز بار بار فاؤں کرے اس کو شکست کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ جب

کے تالاب میں گیندا۔ آخر ایک صبح ان سب دشواریوں کو ختم کر کے ہم نے دریا کا رخ کیا۔

دریائے مینام چاؤ فیا کو تھائی لینڈ کے لوگ پیار سے ”پانیوں کی حسین مامتا“ کہتے ہیں۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے اس عقیدت مندی کا سبب پوچھا تو اس نے بتایا کہ تھائی لینڈ کے لوگوں کی بنیادی خواک چاول ہے اور چاول کی پیدوار پر ۸۰ فیصد لوگوں کا انحصار ہے۔ چاول کی فصل کے لئے پانی کی شدید ضرورت ہوتی ہے اور اس ضرورت کو یہاں کے دریا پورا کرتے ہیں۔ چونکہ چاؤ فیا یہاں کا سب سے بڑا دریا ہے اسی نسبت سے اس کو مامتا کا درجہ دیا گیا ہے۔

اس مامتا کے ایک کنارے تھون بوری اور دوسرے کنارے بنک آباد ہے۔

شہنشاہ تاکسن Taksin نے ۱۷۶۷ء میں دریائے چاؤ فیا کے مغربی کنارے تھون بوری کا شہر آباد کیا اور اس کو اپنا دارالحکومت بنایا۔— یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب براہما کی فوجوں نے تھائی لینڈ کے پرانے دارالحکومت ایودھیا پر حملہ کر کے اسے تباہ کر دیا تھا۔ مگر تھون بوری کی قسم میں دارالحکومت کا شرف صرف پندرہ سال تک رہا۔ ۱۷۸۲ء میں بادشاہ راما اول نے موجودہ دارالحکومت بنک کو دریا کے مشق کنارے آباد کیا۔ شر کے تین جانب دریا تھا اور چوتھی جانب بست وسیع نصیل تعمیر کی کنارے آباد کیا۔ شر کے تین جانب دریا تھا اور چوتھی جانب بست وسیع نصیل تعمیر کی گئی تھی تاکہ براہما کے حملہ آوروں سے شر کو پچایا جائے۔ دونوں شروعوں میں صرف دریا کا پانی جدائی کا احساس دلاتا ہے۔ نوادرد کے لئے اس سے بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ ہم نے کمی مرتبہ دریا کے پل پار کئے اور تھون بوری میں گئے، مگر ہم نے عسوس نہ کیا کہ یہ کوئی دوسرا شر ہے۔ حالانکہ دونوں شر دو مختلف طلعوں میں واقع ہیں۔

سورج نکلتے ہی سڑکوں پر زندگی کی گھماگھی شروع ہو گئی تھی۔ مگر درویش دوم ٹیکسی کی چھپلی سیٹ پر بیٹھا اونٹھ رہا تھا۔ درویش اول اپنا مودی کیمرو سنبھالے بیٹھا تھا تاکہ جو نئی کوئی دلچسپ مظہر آئے اسے فوراً اپنے کیرے میں متین کر لے۔ ہم نے دریا

خوش بھی بڑھتا گیا۔ بست سے لوگ ہوا میں کے لمراہ ہے تھے۔ درویش اول کے بازو میں بیٹھا ہوا ایک پستہ قد آدمی تو کچھ زیادہ ہی جو شیلا تھا۔ اس کے لمراتے ہوئے بازو اکثر درویش اول کی ہوائی حددوں کی خلاف درزی کر دیتے تھے۔ درویش نے ایک آدھ مرتبہ دبی زبان میں احتجاج بھی کیا، مگر اس احتجاج پر اس وقت کون کان دھرتا تھا۔ مقابلے کے دوران ایک کے بازنے دوسرے کے بال نوچ لئے۔ اس پر ریفری نے دسل بجائی۔ باہر بیٹھے ہوئے لوگوں نے شور و ہنگامہ کیا۔ جب گڑ بڑ زیادہ ہوئی تو درویش دوم نے درویش اول کے چمکتے ہوئے سر کو دیکھ کر کہا ”اگر تم باکنگ کرو تو کم از کم بال نچنے کی نوبت تو نہ آئے“۔ گواب بھی یہ باکنگ خاصی وحشیانہ تھی۔ مگر سنا ہے کہ پہلے زانے میں تو کے بازاہ تھوں میں کانچ کے ٹکڑے رکھ کر لڑا کرتے تھے۔ تین مقابلوں کے بعد کھیل ختم ہو گیا۔ ہم ہوٹل میں اگر جلدی سو گئے۔ کیونکہ اگلی صبح سوریے ٹلوٹنگ مارکیٹ دیکھنے جانا تھا۔

ٹلوٹنگ مارکیٹ کو دیکھنے کا منصوبہ تو اسی دن تیار کیا تھا جس دن ہم نے بنک میں قدم جلانے تھے۔ مگر ہر منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے چند دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے ہمارے راستے میں دشواریاں حائل تھیں۔ ایک تو ٹلوٹنگ مارکیٹ میں کاروبار کا وقت بڑا نا معقول تھا۔ سورج نکلنے تک مارکیٹ بند ہو جاتی تھی اور ہم اپنے بچپن کے وعدے پر اب تک قائم تھے کہ جب تک مسٹر سورج کی آنکھ نہیں کھلے گی اپنی آنکھیں بند رکھیں گے۔ دوسرے درویش دوم کی جبلی کاہلی۔— اس کی تیاری ٹلوپڑہ کی تیاری سے کسی صورت میں کم نہ تھی۔— جہاں تک درویش دوم کے شیو بنا نے کا تعلق تھا وہ بالکل سکرے کی کھال اتارنے کے برابر تھا۔ اس کے خاردار بالوں کو کاشنے کے لئے کئی بلیڈوں کی دھاریں کنڈ ہوتیں، مگر شیو کے بعد بھی چہرے پر نور نہیں برستا تھا۔ وہی بلاٹنگ پیپر جیسا سفید چڑہ، لڑکیوں کو دیکھ کر کبھی نہ اڑ بن جاتا اور کبھی چند رہ۔ شیو کے بعد غسل کا مرحلہ ہوتا تھا۔ وہ غسل خانے میں ایسی ہی دلچسپی دکھاتا جیسے گد لے پانی

کشیوں پر ہوتی ہیں۔ سودا بیچنے والی لڑکیاں گرد و نواح کے علاقوں میں سے کیلے ناریل، اتار، سُنگرے، پیاز، بزر مرچیں، کھیرے، چھلی اور طرح طرح کے رنگ برلنگے چھول کشیوں میں لاد کر لاتی ہیں۔ یہاں گاہک موجود ہوتے ہیں جو یہ سامان خرید کر اپنی اپنی دکانوں پر لے جاتے ہیں۔ سیاحوں کے لیے خرید و فروخت سے زیادہ دلچسپ ان چھوٹی چھوٹی کشیوں کی سیر ہوتی ہے۔ کیونکہ یہاں کے ملاح اپنی ان منظر سے انجمن والی کشیوں کو اس ہنرمندی سے چلاتے ہیں جیسے ہمارے ہاں کے رکشا ڈرائیور سڑکوں پر جان کی بازی لگائے رہتے ہیں۔ ہماری لکڑی نما کشتی گدے لے پانی کے سینے کو چیرتی بڑی لانچوں سے دامن بچاتی بڑی تیزی سے ہچکوئے کھاتی جا رہی تھی کہ بارش نے آن گھیرا۔ ہماری کشتی پر چھٹت نہ تھی۔ ادھر بارش ہونے لگی اور ادھر درویش اول درویش دوم پر برنسے لگا کہ تم نے یہ چھٹت کے بغیر کشتی کیوں لی، سارا پروگرام چوپٹ کر دیا۔ ملاح نے کشتی کنارے سے لگادی، پسلے اپنی زبان میں لکڑی کے جھونپڑے والی عورت سے کچھ کہا۔ پھر ہمیں اپر جانے کا اشارہ کیا۔ اس ہست میں سب چیزیں بڑی ترتیب سے رکھی تھیں۔ گھر کے باہر تار پر رنگ برلنگے کپڑے سوکھ رہے تھے۔ بارش کے باوجود انہیں وہاں سے کسی نے نہ اتارا۔ شاید اس نے کہ بارش وہاں بہت تھوڑی دیر کے لئے ہوتی ہے۔ بعد میں پھر سورج چکنے لگتا ہے تو چوٹی سے ایڑی تک پیمنہ ہی پیمنہ۔ نہوں کے ارد گرد ناریل اور کیلے کے پیڑوں میں گھرے ہوئے اسی طرح کے سینکلنوں گھر ہیں؛ جن کے سامنے نگ دھنگ سخت مند پچے ندی کے گدے لے پانی میں نہاتے دکھائی دیتے ہیں۔ اسی ندی کے پانی میں تھائی لڑکیاں کپڑے دھوتی دکھائی دیتی ہیں۔

بارش رکی تو کاروبار پھر شروع ہوا۔ کشیوں میں سوار و ردمیاں پنچے پچے سکولوں کو جارہے تھے۔ ایک لانچ میں سوار ڈاکیہ خط تقسیم کرتا پھر رہا تھا۔ اسی گما گھمی میں کشتی لئے جتاب بدھ پر وہت بھی خوراک کا نذرانہ وصول کرتا دکھائی دیا۔ درویش اول نے ایک جاذب نظر لڑکی سے گنا خریدا۔ ایک ہاتھ میں ایک چھ فٹ لمبا

کا پرانا پل پار کیا اور تھوون بوری میں پہنچ گئے۔ لوگ سائیکلوں پر اپنے اپنے دفتروں کو جارہے تھے مگر دیکھنے والے کو یہ احساس ہوتا تھا جیسے پنک کے لئے جارہے ہوں۔ ہر شخص نے شوخ رنگوں والی شرٹیں پہن رکھی تھیں اور تھویرا ہر شخص کی سائیکل کے پینڈلیں بے ساتھ ٹرانسٹر لٹکا تھا۔ وہاں لوگوں کو موسيقی کا بابت شوق ہے۔ ریڈیو پر دن بھر میوزک چلخاڑتا رہتا ہے۔ بنکاں میں کئی ٹیلیویژن سیشیں ہیں۔ کسی اونچی جگہ سے شر کو دیکھا جائے تو چھتوں پر ٹیلیویژن کے ایمیل اسی طرح دکھائی دیتے ہیں جیسے پرانے لاہور کی چھتوں پر کبوتروں کے لئے چھتیاں۔ اس شوق کی انتہا تو ایک شخص نے کر رکھی تھی جس نے اپنے کشتی کے گھر میں ٹیلیویژن سیٹ رکھا ہوا تھا۔

وہاں سڑکوں پر نیلی، بزرگ اور سفید رنگ کی بسیں دکھائی دیتی ہیں جن کی حالت ارین ٹرانسپورٹ کی بسوں سے یقیناً بہتر ہے۔ کم از کم اپنے پیچھے دھوئیں کے بادل تو نہیں چھوڑتیں۔ درویش اول دنختہ ”چلایا۔“ ”تیکی روکو! دو ڈیکھو۔“ درویش دوم نے کہا۔ ”ابے کاٹھ کے الوقت نے کبھی ٹرک نہیں دیکھا۔“ ”مگر اس ٹرک پر گوم بدھ کا بابت بڑا مجسم رکھا ہوا تھا۔ پروہت ارد گرد ساز بچارہ تھے۔ مجسم کے قدموں میں موم بیان جل رہی تھیں۔ پچاری منتیں مان رہے تھے پروہت معبود کو گلی گلی لئے پھرتے تھے تاکہ جو لوگ نذرانے دینے کے لئے مندروں تک نہیں پہنچ سکتے لارڈ بدھا کو لے کر ان کے گھوں تک نذرانہ وصول کرنے کے لئے پنچا دیا جائے۔ درویش اول نے اپنا موسوی کیمرا سنجھالا اور تصویریں اتارنے لگا۔ یہ لارڈ بدھا کا مجہزہ تھا یا درویش اول کی ناہلی کہ کیمرا خراب ہو گیا اور کوئی تصویر نہ اتر سکی۔

دریائے چاؤ فیا سے پھونتی ہوئی ان گنت نہوں نے بنکاک کو مشرق کا ویس بنا دیا تھا۔ یہ نہریں لوگوں کے لئے ذراائع آمد روفت بھی ہیں اور ذریعہ معاش بھی۔ ان کے کناروں پر بھی زندگی آباد ہے اور ان کی لمروں پر بھی۔ بنکاک کی مشہور زمانہ فلوٹنگ مارکیٹ بھی یہاں ایک نر کے سینے پر تیرتی رہتی ہے۔ ہم فلوٹنگ مارکیٹ پہنچ تو اس وقت کاروبار عروج پر تھا۔ درویش دوم نے ہمارے لئے ایک لمبورگی سی کشتی کرائے پر لی اور ہم بھی اس تیرتے بازار میں گھس گئے۔ فلوٹنگ مارکیٹ ہمارے ہاں کی سبزی منڈی کی طرح ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہاں سب دکانیں چھوٹی چھوٹی

درویش دوم۔ دل چاہتا تھا کہ اس کے موٹے پیٹ پر ایسے زور سے لات اروں کے کچھوے کی طرح پانی میں ڈکیاں لگاتا پھرے۔  
فونٹ مارکیٹ سے واپسی پر ہم دریا کے کنارے اس جگہ پہنچے جہاں شاہی کشتیوں کا بیڑا Royal State Barges خوبصورت کشتیاں بلتی ہیں۔ ایک کا نام سویان ہو گک (سری مرغابی) اور دوسری کا نام ان تانگا راج (سات سروالا اٹھدا) ہے۔ ان کشتیوں کے نگران نے ہتایا کہ پہلے زمانے میں بادشاہ جب سلطنت کے دورے کرتے تھے تو ان کے جلوس انہی کشتیوں پر جایا کرتے تھے۔ ۱۹۲۹ میں جب آخری بار جلوس نکلا تو اس وقت شاہی بیڑے میں ۲۵ کشتیاں تھیں۔ یہ کشتیاں بالکل اسی طرح استعمال ہوتی تھیں جس طرح مغلوں کے زمانے میں ہاتھی استعمال ہوتے تھے۔ سرکاری دوروں کے علاوہ نہ ہی رسم کی ادائیگی کے موقعوں پر بھی ان کشتیوں پر جلوس نکالے جاتے تھے۔ ہر سال داث اروں کے مندر کے پوچھتوں کے جبے بدلنے کے روز بادشاہ ان کشتیوں کے رنگین جلوس میں آتے تھے، کیونکہ یہ مندر دریا کے کنارے پر ہے، اس لئے ان کشتیوں کا استعمال ہوتا تھا۔ نگران نے ہتایا کہ ۱۹۲۷ میں بادشاہ بھو میول گیارہ سال کے عرصے کے بعد ان کشتیوں پر سوار ہو کر جلوس کی شکل میں واث اروں کے مندر میں گئے۔ اس جلوس کے لئے تھائی لینڈ کی بحیرہ کے تیرہ سو جوانوں نے شرکت کی۔

دریائے چاؤنلا کے مغربی کنارے شاہی محل کے مقابل واث اروں اس کی تعمیر اس زمانے میں ہوئی جب تھوں بوری سیام کا دارالخلافہ تھا۔ گواب تھوں بوری دارالحکومت نہیں رہا اور سیام نام بدل کر تھائی لینڈ بن گیا ہے، مگر واث اروں کی اہمیت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اب بھی ہر سال صدیوں پرانی رسم پوری کی جاتی ہے اور بادشاہ ذاتی طور پر مندر میں جا کر پوچھتوں کو جبے پیش کرتے ہیں۔ ہم اپنی نسخی میں لاجج کو کنارے پر روک کر مندر دیکھنے گئے۔ سب سے پہلے میں گیٹ کے قریب دو

گنا اور دل ربا مسکراہیں ملیں تو ہم دونوں بھی خریدار بن گئے۔ ایک کشتی میں چلتی پھرتی کافی شاپ دیکھی۔ یہ صاحب گھر گھر کافی بیچتے پھرتے تھے۔ جہاں سینکڑوں کشتیاں ہوں گی وہاں ٹریلک کا مسئلہ ضرور ہو گا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ٹریلک جمع ہو گیا۔ پھر ٹریلک پولیس کی لاجج نے اسی طرح ٹریلک سنجھالا جیسے عام سڑکوں پر سنجھالا جاتا ہے۔ اسی نر کے کنارے ایک جگہ تھائی لینڈ کی صنعت کاری کی اشیاء کی دکان ہے جہاں تھائی لینڈ کا ریشم براستا ملتا ہے۔ اسی طرح تھائی ریشم کی نایاں، مگر مجھ کی کھال کے دستی بیگ، اعلیٰ چڑے کے جوستے، لکڑی کی دستکاری کا سامان اور تھائی لینڈ کی مشورہ ”پُنس“، انگوٹھیاں ایک ہی چھٹ کے نیچے مل جاتی ہیں، جو دوسری جگہوں سے قدرے سقی ملتی ہیں۔ درویش دوم کو بیماری کی حد تک شاپنگ کا شوق تھا۔ اسے ہر دو چینز پسند تھی جو سقی بھی ہو اور نیزادہ بھی ملتے۔ خریداری کرتے وقت وہ سبزی اور دوسری اشیا میں بہت کم فرق محسوس کرتا تھا۔ مثلاً کچھ بعید نہیں کہ وہ شاپنگ کے جون میں یلز گرل سے کہ ڈائلے ”پلیز دو کلو نایاں، پانچ کلو جوستے اور ڈیڑھ کلو اگر بیان قول دیں میں ابھی اڑھائی گز پیاز لے کر آتا ہوں۔“ تھائی صنعت کاری کے اس سال میں ہم لوگ خالی ہاتھ گئے تھے۔ مگر جب باہر نکلے تو سامان سے لدے ہوئے تھے۔ اس سامان میں درویش اول اور میرا تو خالی مشورہ تھا اور درویش دوم کا سامان تھا۔ میں سامان سے لدا و اپنی کشتی میں سوار ہونے لگا تو میرا تو ازن خراب ہو گیا۔ دراصل یہ سب کچھ اس مولے درویش دوم کے سبب ہوا۔ اس نے اپنا وزن کشتی کے اسی طرف ڈال دیا جدھر سے میں سوار ہو رہا تھا۔ پھر کیا تھا میرا آدھا جسم ندی کے غلیظ پانی میں اور آدھا کشتی میں۔ درویش دوم نے جھٹ سے سامان کے تھیلے میرے ہاتھ سے کپڑ لئے اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا۔ دوسرا درویش میری مدد کرنے کے بجائے جڑے کھولے ہنس رہا تھا۔ جیسے کوئی بہت بڑا تماشہ ہو رہا ہو۔ بیچارے ملاج نے میری مدد کی اور میں کشتی میں سوار ہوا۔ اس وقت دونوں درویش مجھے نہر لگ رہے تھے، خاص طور پر وہ موٹا

بہت بڑے بہت دکھائی دیئے۔ ان بتوں کی شکلیں بہت بھی اچھی تھیں اور دونوں نے ہاتھوں میں بڑے بڑے ڈنڈے تھے ہوئے تھے۔ ہماری لانچ کے ملاج نے، جو اس وقت گھائیڈ کے فرائض انجام دے رہا تھا، بتایا کہ یہ مندر کے چوکیدار ہیں اور یہ بدرجھوں کو مندر سے دور بھاگنے کے لئے ہیں۔ یہ بات سنتے ہی درویش اول کے قدم رک گئے، مگر درویش دوم نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے تسلی دی اور کہا ”تم چلے جاؤ، تمھیں کچھ نہیں کہیں گے۔“ اس مندر کی خاصیت یہ ہے کہ یہاں سجادت کے لئے پیپیاں اور رنگ برلنگے ٹوٹے برتوں کے ٹکڑوں کو استعمال کیا گیا ہے۔ اس مندر کا میٹر ۷۶ فٹ اونچا ہے اور اس بلندی سے شر کا بہت اچھا نظارہ ہو سکتا ہے۔ سائز میں بچے تک ہم مندر کی سیرے آتا گئے تو واپس ہوٹل کی طرف گوچ کی۔ اب بنکاک میں ہماری آخری رات تھی اور اس رات سے نہ جانے ہم نے کیا کیا امیدیں باندھ رکھی تھیں۔ کیونکہ آج کی رات ہم مسٹر اسلام خان کے مہمان تھے اور ہم ان کی مہمان نوازی سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔

درویش اول کمرے میں اس طرح گھوم رہا تھا جیسے پھرے میں ڈارون کی تھیوری والا اور انسان سے مشابہت رکھنے والا جانور۔ انسان پر گھٹائیں بھی ہوئی تھیں اور وہ اس طرح بیدردی سے برس رہی تھیں جس طرح کوئی چیزیں یوں خاوند پر برس رہی ہو۔ جوں جوں پارش بدھتی گئی توں توں ہماری نا امیدی بھی اور بھوک بھی بدھتی گئی۔ جماں تک بھوک کا تعلق ہے اس سے میرا بہت قریبی رابطہ ہے۔ رہے دوسرے درویش تو ان میں درویش اول تو آنکھوں کی خوارک پر گزارہ کرتا تھا۔ اس خوارک کی بنکاک میں کمی نہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ بلڈ پریشر کی وجہ سے عام خوارک سے پرہیز کر کے صرف آنکھوں کی خوارک پر آلتھا کرتا ہے۔ حالانکہ آنکھوں کی اس رنگیں خوارک سے بلڈ پریشر کی حالت تغیین تو ہو سکتی ہے اس میں کمی کی امید نہیں۔ درویش دوم کی فاقہ متی صرف پیٹ کا دائرہ کم کر کے عشق کا دائرة وسیع کرنے کی آرزو میں ہوتی تھی۔ مگر میں سنگل پلی والا بندہ خان صاحب کی اس دعوت کا صبح سے

انتظار کر رہا تھا، صرف یہی نہیں بلکہ درویشوں نے رات کے کھانے کی لذیذ کمانیاں نا کر دوپھر کا کھانا بھی گول کر دیا تھا۔ رہا میزان تو اس نے چھ بجے کا وقت دیا۔ اب آٹھ بج رہے تھے۔ نہ میزان آیا اور نہ میز۔ سوا آٹھ بجے ٹیلیفون کی گھٹی بھی۔ درویش دوم نے بیزاری سے ”ہیلو“ کہا۔ دوسری جانب سے آواز سنتے ہی اس کے بلاںگ ہبپر نماچھے پر زندگی کے آثار دکھائی دینے لگے۔

سیام کے قدیمی رقصوں میں دو رقص بہت مشور ہیں ایک کون رقص

Thai Masked Dance اور دوسرا لاکون رقص

Classical Dance ہے۔ آج کے پروگرام میں سب سے پہلے کون رقص پیش کیا گیا۔ خانصاحب پہلے بھی سئی بار یہاں کے رواستی رقص دیکھے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ان کے بارے میں کچھ تفصیل بتائی۔ کون رقص میں کدار چھوپ پر ماسک پہننے ہیں۔ اس رقص میں تین ہزار سال پرانی رامائن کی کمانیوں کی عکاسی کی جاتی ہے۔ اس رقص کی خوبی یہ ہے کہ اس میں مکالے کے بغیر پوری کمانی کا مفہوم سمجھ میں آ جاتا ہے۔ کداروں کی پہچان ان کے کپڑوں کے رنگ سے کی جاتی ہے۔ مثلاً راما کا لباس سبز، لکشم کا سنہرا اور ہنومان کا سفید ہوتا ہے۔ اس رقص میں لڑائی کے مناظر بھی پیش کئے جاتے ہیں اور کروار بڑی خوبصورتی سے موسيقی کی دھن کے ساتھ تکواریں لہراتے ہیں۔ یہ رقص کسی حد تک کھاکلی رقص جیسا ہوتا ہے۔

لاکون رقص کی کمانیاں مذہبی نہیں بلکہ رومانی ہوتی ہیں۔ پچھلے زمانے میں یہ رقص شزادیوں کے دل بھلانے کے لئے کیا جاتا تھا اور اس وقت یہ رقص صرف عورتیں کرتی تھیں۔ گواں رقص کے ایکش بہت ست ہوتے ہیں۔ مگر ان میں بہت گریس ہوتی ہے۔ کداروں کے لباس بہت خوبصورت ہوتے ہیں۔ اس رقص کی کمانیوں کے کدار اپنے اپنے پارٹ ادا کرتے ہیں۔ مگر کبھی کبھی مکالے بھی بولے جاتے ہیں۔ رقص اور خوارک اور خوارک اور رقص کا سلسلہ بہت دیر تک جاری رہا۔ ہم نے بادل ناخواستہ اس رنگیں رات کو الوداع کہا اور اپنے ہوٹل پہنڈیے۔

ہیں اور مرد بچوں کا خیال رکھتے ہیں، مگر کی حفاظت کرتے ہیں اور مرغ لڑاتے ہیں۔ کچھ دیر مرغوں کی جھنپس دیکھیں۔ نزدیک ہی ہاتھی کام پر لگا ہوا تھا۔ ہاتھی سے تھائی لینڈ میں بست کام لیا جاتا ہے۔ یہ دیوقامت جانور زیادہ تر لکڑیاں کھینچنے کے کام آتا ہے۔ مغربی تھائی لینڈ کے چیڑ اور دیار کے جنگلات میں اب بھی ہاتھیوں سے لکڑیاں کھینچنے کا کام لیا جاتا ہے۔ ثم لینڈ کے گائیڈ نے بتایا کہ ہاتھی تھائی لینڈ کے مشق شر سیورن کے گرد و نواح کے علاقے میں پائے جاتے ہیں اور وہاں کے لوگوں کی آمدنی کا ذریعہ ہاتھیوں کی تربیت ہے۔ وہ جنگلی ہاتھیوں کو پکڑ کر انہیں تربیت دیتے ہیں اور تربیت یافتہ ہاتھیوں کو جنگل کے ٹھیکیداروں کے ہاتھ فروخت کرتے ہیں۔ گو ہاتھی کی عمر تو خاصی لمبی ہوتی ہے، مگر اس کے کام کرنے کا عرصہ ۳۰ سے ۸۰ سال کی عمر کے درمیان کا ہے۔ اس کے بعد ہاتھیوں کو پورے اعزاز کے ساتھ پہنچ دے کر برپا ہار کر دیا جاتا ہے۔ ثم لینڈ میں دستکاری، رقص اور باکسٹنگ وغیرہ کی بھی نمائش کی جاتی ہے اور سیاح یہ تمام چیزیں دیکھ کر تھائی لینڈ کے بارے میں بہت کچھ بہت کم وقت میں جان جاتے ہیں۔ سیاحت کے فروغ کے لئے ہمارے ملک میں بھی تو ایسی جگہ اسلام آباد اور کراچی کے نزدیک بنائی جائیتی ہے، جہاں علاقائی رقص اور شافت کی جھلکیاں دکھا کر سیاحوں کے لئے دلچسپی کا سامان پیدا کیا جاسکتا ہے۔

تنی گھنٹے ہم نے ایئرپورٹ پر گھوم کر گزارنے تھے۔ چنانچہ ایئرپورٹ بلڈنگ کی چھت سے نظارہ کرنے لگے۔ تھوڑے تھوڑے عرصے بعد جیٹ طیارے یا اتر رہے تھے اور یا اپنی منزلوں کو پرواز کر رہے تھے۔ رن وے کے اردو گرو پھیلی ہوئی ہری بھری گھاس میں ننگ دھڑنگ بچے اپنی بھینسوں کو چرا رہے تھے۔ وہیں کچھ فاصلے پر تھائی فضائیہ کے لڑاکا طیارے بھی بے یار و مددگار کھڑے تھے۔ اس لاوارثی میں تو ہمارے ہاں اونمنی بسوں کو بھی نہیں کھڑا کیا جاتا۔ اسی عرصے میں سبز رنگوں والا پی آئی اے کا طیارہ ٹوکیو سے واپس وطن جاتے ہوئے بنکاک اتزا۔ اپنے ہم وطنوں کو دیکھ کر وطن کی یاد ستابنے لگی۔ مگر وطن کی یاد کو سیاحت کے شوق میں چھپا کر میں پاس کھڑے

بارش کا زور ٹوٹنے ہی رات کا طسم زوروں پر ہو گیا۔ ہم واپسی پر پیٹ پاگ سے گزرے تو مشرق کی حیا کو فٹ پاتھوں پر شیم برہنہ پایا۔ مغرب کے خریدار اپنے سوڑے بغلوں میں دبائے لزکھڑاتے جا رہے تھے۔

ہمارا جہاز شام کو چار بجے چیاگ مائی کے لئے اڑنا تھا۔ مگر ہم نے صبح دس بجے ہی ہوٹل سے سامان نکالا اور ایئرپورٹ کا رخ کیا۔ جلدی جانے کا سب سے پہلا سبب تو یہ تھا کہ تھائی لینڈ میں ہوٹل چھوڑنے کا وقت دن کے بارہ بجے ہے۔ اگر ہم ساڑھے بارہ بجے بھی ہوٹل چھوڑتے تو اگلے چوبیس گھنٹے کا کرایہ ادا کرنا پڑتا۔ ظاہر ہے درویش دوم جیسے کمپیوٹر داعی کے ہوتے ہوئے اس قسم کی عیاشی کی مجنماش نہ تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ہم لوگ ایئرپورٹ کے نزدیک ثم لینڈ دیکھنا چاہتے تھے۔ ثم لینڈ، انگلینڈ یا نیوزی لینڈ کی طرح کا کوئی ملک نہیں بلکہ میں ایک پارک ہے جس میں تھائی لینڈ کے مختلف علاقائی مناظر پیش کئے گئے ہیں۔ ثم لینڈ صرف سیاحوں کی سولت کے لئے بنایا گیا ہے۔ کیونکہ ان کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ تھائی لینڈ کے دور دراز علاقوں میں جا کر اس کی تندیب کے مختلف پہلو دیکھیں۔ لہذا ثم لینڈ دیکھنے کے بعد تھائی لینڈ کی علاقائی تندیب کا پورا اندازہ ہو جاتا ہے۔

ثم لینڈ پنج۔ درویش دوم نے تین نکٹ خریدے۔ ہر نکٹ کی قیمت ایک سو باتھ (پچھے ڈال) تھی۔ درویش دوم نے فورا حساب لگا کر کہا کہ اس سے تو بہتر تھا ہوٹل میں رہتے، وہاں کم خرچ ہوتا۔ ثم لینڈ میں داخل ہوتے ہی سیدھے ہاتھ دھان کا کھیت تھا جس میں ایک محترمہ نے ہل جوت رکھا تھا۔ وہاں ہل کھینچنے کے لئے نیل کی بجائے بھینس استعمال کی جاتی ہے۔ بھینس کو دیکھ کر درویش اول نے درویش دوم کو کہا کہ وہ دیکھو تمہاری نسل کی چیز پر ظلم کیا جا رہا ہے۔ تم ذرا نجع کر رہنا، کہیں ایسا نہ ہو کہ جھیس یہ لوگ بیس اور رکھ لیں اور ہمیں اپنے ہمراہ بھینس لے جانی پڑے۔ کھیت کے نزدیک ہی بانسوں کا گھر تھا۔ جس کے سامنے چند مرد اکٹھے تھے اور مرغ لڑا رہے تھے۔ تھائی لینڈ میں عورتیں کھیت باڑی کا کام کرتی

کرتے ہیں۔ سواری پئے جائے تو یہ اسکی قمت۔ خون خنک کے بغیر ہی ڈرائیور نے ہمیں ہوٹل پہنچا دیا۔

درویش اول کی جگہ پسندی کا خوش آئین پہلو یہ تھا کہ وہ ہر شر اور مقام کے بارے میں بنیادی معلومات پہلے ہی سے حاصل کر لیتا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ معلومات فراہم کرتے وقت اپنے پسندیدہ مقامات کو ایسے ڈرامائی انداز میں پیش کرتا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی وہاں جانے کو جی چاہتا۔ یہی حال اس نے چیاگ مائی میں کیا۔ ہوٹل میں سامان رکھنے کی دیر تھی کہ اس نے روائی کا اعلان کر دیا۔ ست الوجو درویش دوم کو تو عام حالات میں کمرے سے نکالنا مجبور سے کم نہ تھا اس وقت تو وہ تھا ہی تھکا ہوا، بھلا اس پر روائی کے اس اعلان کا کیا اثر ہوتا۔ چنانچہ درویش اول نے کری سنجھانی اور بستر پر بچھے ہوئے درویش دوم کو چیاگ مائی کے بارے میں بچھے دار قصہ سنانے شروع کئے۔ اگرچہ درویش دوم کے بغیر بھی چیاگ مائی کی سیر کی جا سکتی تھی۔ اور شر کے حسن اور صحت پر کوئی فرق نہیں پڑتا تھا مگر اس کو ساتھ نہ لے جانے سے ہم لوگوں پر بہت فرق پڑتا تھا۔ مثلاً ہم تینوں نے سیرو سیاحت کے لئے جو خزانہ جمع کیا تھا اسکی سمجھیاں درویش دوم کے پاس تھیں۔ ظاہر ہے کلید بدار کے بغیر سیر کیا گماں ہوئی تھی۔

کہ دوئی مو تھپ کی بلندیوں پر سرمئی شام پھیل چکی تھی۔ افون پر پھیلے سرخ زعفرانی اور اودے رنگ سیاہی مائل ہوتے جا رہے تھے۔ انسانی درندگی پر پردہ ڈالنے کے لئے سیاہ رات اپنا دامن پھیلائے بڑھ رہی تھی۔ قدم مندرجہ کے بیناروں کی تکونیں رات کا دامن چاک کرنے کے لئے بھالوں کی طرح تھی ہوئی تھی، مگر ان سب چیزوں سے بے خبر سڑکوں پر زندگی رواں دواں تھی اور اس روانی میں تینوں درویش بھی شامل ہو گئے۔ ہماری منزل شہینہ بازار تھی۔ اور بازار کی یہی کشش تھی جو درویش دوم کو کھینچ لائی۔ جمعہ بازار کی طرح یہاں ہر چیز تھوک کے بھاؤ مل رہی تھی۔ چھوٹے بڑے سینکڑوں مثال تھے جو رنگ برلنگی اشیا سے کچھ کچھ بھرے ہوئے تھے۔

بده پروہت سے باشیں کرنے لگا۔ پروہت کو جب پتہ چلا کہ ہم پاکستان سے آئے ہیں تو اس نے فوراً پوچھا کہ ہم نے لاہور کے عجائب گھر میں گوتم بدھ کا مجسمہ دیکھا ہے یا نہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ بات بن گئی، کیونکہ اتفاق سے یہ مجسمہ میں نے دیکھا ہوا تھا۔ صرف یہی نہیں میں نے پروہت کو وادی سوات میں پھیلی ہوئی بدھ عبادت گاہوں کی تفصیل بھی بتا دی۔ باقتوں باقتوں میں وقت کٹ گیا۔ اور درویش اول بھاگتا ہوا آیا کہ جلدی چلو اڑان کا نامہ ہو گیا ہے۔ نیچے گیا تو پتہ چلا کہ جلدی کس بات کی تھی۔ سامان اٹھانا تھا جس کے لئے ان دونوں کو میری یاد ستاری تھی۔ کاؤٹر پر کھڑی جامنی و روپی والی بادای لڑکیاں بات کرتیں تو رس گھوول دیتیں۔ یہ تو زہر کو بھی ہاتھ لگا دیں تو شہد بن جائے، گواڑ پہلے سے بھی زیادہ ملک ہو جائے گا۔ بنکاک کو آخری سلام کیا اور چیاگ مائی جانے کے لئے جماز پر سوار ہو گئے۔

تحالی لینڈ کے شمال میں بنکاک سے سات سو کلو میٹر دور چیاگ مائی کا شر ہے جو آبادی کے لحاظ سے تو ملک کا دوسرا نمبر کا شر ہے، مگر اور کئی لحاظ سے بنکاک سے بازی لے گیا ہے۔ مثلاً بنکاک کے مقابلے میں یہاں کا موسم بڑا عاشقانہ ہوتا ہے۔ شر اور موسم دونوں مری اور ایبٹ آباد کا ملاب سانظر آتے ہیں۔ گرمیوں کی شدت میں تو شمنشاہ بھو میال بھی بنکاک کو چھوڑ کر یہاں اپنے محل میں منتقل ہو جاتا ہے۔ بنکاک کے ناٹ کلبوں کو سجانے والی کلیاں زیادہ تر اسی شر اور علاقے کی رہنے والی ہوتی ہیں۔ اور شاید انہی کلیوں کی کشش تھی جو ان تین بھونزوں کو چیاگ مائی کھینچ لائی تھی۔

ایرپورٹ سے سوری والنگر ہوٹل جانے کے لئے درویش دوم نے ٹیکسی کی بجائے تھک تھک (رکشا) کا انتخاب کیا۔ تحالی لینڈ کی تھک تھک اور ہمارے ہاں کے یہ موت کے اڑن کھنوں لے اگرچہ قریبی رشتہ دار ہیں، مگر ڈرائیوروں میں بہت فرق ہے۔ وہاں کے ڈرائیور تو سواری کو صرف ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتے ہیں، مگر ہمارے ڈرائیور تو سواری کو اس جہان سے دوسرے جہان پہنچانے کی سر توڑ کو ش

گورے کا فیشن بھی مجبوری ہی سمجھتے۔

ہینڈل پر شرک ناقشہ، ڈنڈے پر درویش اول اور پیڈل پر ہمارے پاؤں۔ تھائی لینڈ میں ٹریفک سڑک کے دائیں ہاتھ چلتی ہے۔ ہمیں عادت ہے بائیں ہاتھ چلنے چلانے کی۔ سائیکل پر درویش اول کا بوجھ اور کندھوں پر حفاظت کا بوجھ۔ یہ دونوں بوجھ بس قیامت کا بوجھ تھے، اور ہم ان لوگوں میں ٹھہرے جو نہیں اخانتے تکے کا بوجھ۔ ادھر درویش دوم پر اپنی جسامت کے بوجھ کے علاوہ اور کچھ بوجھ نہ تھا۔ بلکہ وہ اس سائیکل پر سیر کے لئے باقاعدہ تیاری میں تھا۔ چیانگ مائی کے شہینہ بازار سے خریدی ہوئی پھولدار، شوخ و شنگ بشرت۔ سر پر ٹکنوں کا ہیٹ اور ہم لوگوں کی کمر آلوں نظروں سے بچنے کے لئے سیاہ چشمہ۔

سرڈکوں پر سرڈکوں کے نام تھائی زبان میں لکھتے تھے اور نقشے پر انگریزی میں۔ جو سڑک نقشے پر تھی وہ شر میں ہمیں نہ ملے اور جو شر میں نظر آئے وہ نقشے پر نہ ملے۔ اور ملتی کیسے۔ درویش اول نے نقشہ تو محض دکھاوے کے لئے پھیلایا ہوا تھا۔ اصل دھیان تو اس نے راہ چلتی یہیوں کے چال چلن پر لگا رکھا تھا۔ مجھے الوبانے کے لئے کبھی دائیں مڑنے کو کہہ دیتا اور کبھی بائیں مڑنے کو۔ اسی گمراہی میں دن کے گیارہ نع گئے اور ہم کو ہلو کے نیل کی طرح وہیں گھومتے پھرے۔ حرام ہے جو کوئی تاریخی مندر یا مقام نظر سے گزرا ہو۔ ہاں اسی کش کمش میں پرانے شر پنج گئے۔ جسکے چاروں طرف شرپناہ اور حفاظتی خندق ہے۔ اس شرپناہ اور حفاظتی خندق نے نہ کبھی باہر والوں کو انداز آنے سے روکا اور نہ اندر والوں کو باہر جانے سے۔ ہم بھی بلا روک ٹوک شرپناہ کو پار کر گئے۔ مگر سفید ہیٹ والے سنتری بادشاہ نے وسل بجائی اور رکنے کا اشارہ کیا۔ میں تو رکنے کا بہانہ ہی ڈھونڈ رہا تھا۔ فوراً بریک لگائی۔ ویسے ہم نے دانستہ طور پر ٹریفک کی قانون ٹھکنی ہرگز نہ کی تھی۔ مگر یہ دائیں کے ہیر پھیر میں کچھ گزر بڑے ضرور ہو گئی تھی۔ چیچے درویش دوم کو دیکھا تو وہ سڑک کے دو سری جانب کھڑا مسکرا رہا تھا۔ چنانچہ پلیس (پولیس) مقابلے کے لئے میں نے درویش اول کو میدان

وہاں خریدنے کی لاکھوں چیزیں اور دل پشوری کرنے کے لاکھوں لوازمات تھے۔ ایک ایک سیلز گرل قابل دید دید تھی۔ تینوں درویش ہر لڑکی کو ہر زادے سے اس طرح دیدے چھاڑے تاڑ رہے تھے کہ اگر وہ موم کی ہوتیں تو یقیناً پکھل جاتیں۔ خیران کو تو کچھ نہ ہوا البتہ تینوں درویش پانی پانی ہو گئے۔ درویش اول تو تھا ہی دل کا سوداگر، بھلا اسکو دنیاوی چیزوں سے کیا سرو کار۔ البتہ درویش دوم نے حسب عادت کوئی سات کلو کپڑے خرید لئے۔ چیانگ مائی، تھائی لینڈ کی دستکاری کا مرکز ہے۔ یہاں خوبصورت چھتریاں لکڑی کا نمائش سامان، ریشم اور انہون کثرت سے ملتی ہے۔ گاہکوں کو انہون اور کوئی نیچ کر پولیس کو اطلاع دیتا بھی چیانگ مائی کے تجارتی اصولوں کا حصہ ہے۔ بہت سے ناداواقف اور نووارو اس اصول کا شکار ہو جاتے ہیں۔

شہینہ بازار سے کچھ دور شاہراہ کا پسینگ دین پر ایک اور بازار ہے جسے مختلف زبانوں میں مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ مگر قارئین کی سوچ کے لئے اس بازار کو میں بازار حسن، بازار جسم اور بازار جنس کہہ کر پکاروں گا۔ درویش اول اس بازار کا شہزادہ تھا۔ اسے اس بازار میں جا کر وہی سکون ملا جو عام بازار میں درویش دوم کو ملتا تھا۔ چنانچہ اب وہ بھی اسی فراغدلی سے سودے کر رہا تھا جو شہینہ بازار میں درویش دوم نے کئے۔ تھائی لینڈ کے جنی کاروبار کا خام مال چیانگ مائی کے علاقے سے آتا ہے۔ اسی لئے اس بازار میں یہ راٹھیریل ستا بھی ملتا ہے اور بکھرت بھی۔

چیانگ مائی میں اپنی رات جتنی رنگیں گزروی تھیں تھی دن اتنا ہی ذلت و خواری میں گزرا۔ گو اس خواری میں شر کا کوئی دغل نہ تھا، دغل تھا تو درویش دوم کا اور اسکی بچت سیکم کا۔ اس سیکم کے تحت اس نے شر کی سیر کی خاطر نیکی میں گھونٹنے کی بجائے دو سائیکل کرائے پر لے لئے۔ دو اس لئے کہ درویش اول کو سائیکل چلانی نہیں آتی تھی۔ لہذا اسکا بوجھ بھی میری سائیکل پر ہونا تھا۔ یہ سائیکل مجبوری کی سواری تو ہے سیر کی ہرگز نہیں۔ ہاں گوروں کی بات الگ ہے۔ وہ تو شوکیہ گدھے کی سواری بھی کر لیتے ہیں۔ ویسے گورا تو منہ بھی کالا کر لے تو فیشن کملاتا ہے، مگر ہم کالوں کے لئے

پر ہاتھی ہونے کا شہر نہ ہوا، ورنہ موصوف فوراً بناک کے چڑیا گھر میں پہنچا دیتے جاتے۔ اگرچہ روایتی طور پر تھائی لینڈ میں سفید ہاتھی خوش بختی کی علامت ہے۔ اور پرانے زمانے میں جس بادشاہ کے پاس جتنے زیادہ سفید ہاتھی ہوتے تھے اتنا ہی وہ خوش نصیب سمجھا جاتا۔ مگر اس منہگانی کے زمانے میں سفید ہاتھی پالنا بادشاہ کے لئے بھی ممکن نہیں۔ رسمًا ”تھائی لینڈ“ میں جتنے بھی سفید ہاتھی ہیں وہ بادشاہ کی ملکیت ہیں۔ اسی لئے جو نی کسی باشندے کو سفید ہاتھی ملتا ہے وہ بادشاہ کو تھنکے کے طور پر بھیج دیتا ہے۔ جسے بادشاہ چڑیا گھر کے حوالے کر دیتا ہے۔ جمال تماشائیوں کی نکشوں سے سفید ہاتھی پالے جاتے ہیں۔

لوئی کراٹھونگ کا توار خزان کے موسم میں چاند کی چودھویں رات میں منایا جاتا ہے۔ اس رات پورے تھائی لینڈ کے دریاؤں، نہروں، ندیوں اور جھیلوں کے کنارے توار منانے والوں کے تجوم ہوتے ہیں۔ چیانگ مائی میں اس توار کا خاص حسن اور رنگ ہوتا ہے جسے دیکھنے کے لئے ہزاروں لوگ تھائی لینڈ کے دور دراز علاقوں سے آتے ہیں۔ یہ توار پانی کے دیوتاؤں کو نذرانے پیش کرنے کے لیے منایا جاتا ہے۔ چنانچہ کیلے کے چوپوں سے کنوں کے پھول نما کراٹھونگ یعنی کشتیاں بنائی جاتی ہیں۔ جن میں عقیدت مند موم بیان اور اگر بیان جلا کر کے ڈالتے ہیں اور پانی میں بہادیتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ یہ کشتیاں اپنے ساتھ گناہ بھالے جاتی ہیں۔

چیانگ مائی میں چودھویں کی رات تھی۔ شر کو چیرتے ہوئے دریائے پنگ کے کنارے سینکنوں ہزاروں چاند اترے ہوئے تھے۔ فضا میں اگر بیوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ دریا کے سیاہ سینے پر ٹمٹھاتی بیوں کی قطاریں ہچکوئے کھاتی چلی جا رہی تھیں۔ درویش اول نے پھولوں سے کمی ایک بی بی سے ماچس مانگی۔ موم تی بلائی اور کشتی دریا میں چھوڑ دی۔ انکی کشتی دو چار کشتیوں سے نکراری.... ڈگگانی.... اور ڈوب گئی۔ درویش دوم تو کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔ فوراً بولا۔ ”بچو!.... ایک کشتی تو تمہارے کل رات کے گناہوں کا بوجھ ہی نہیں اٹھا سکتی.... بھا!“ ساری عمر کے

میں چھوڑ دیا۔ ہم ہیں عادی اپنی پولیس کے بھلا تھائی پولیس کو ہم کیا خاطر میں لاتے۔ درویش اول نے پولیس والے سے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ سنتری نے تھائی زبان میں الزام لگائے۔ درویش اول نے سرائیکی میں صفائی پیش کی۔ سنتری نے مصافعے والا ہاتھ اپنی جیب میں ڈالا اور ہمیں جانے کا اشارہ کر دیا۔ پس مقابلے کے بعد اکثر قانون نکنوں کے حوصلے بلند ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ”جھاکا“ کھلنے کی دیر تھی کہ ہم بھی بھر ہو گئے اور دن بھر چیانگ مائی میں سائیکل دوڑاتے پھرے۔ ویسے بھی طول و عرض کے لیاظ سے یہ مختصر سا شر ہے۔ مگر بدھ مندوں کی تعداد تین سو سے زیادہ ہے۔ ظاہر ہے ہمیں نہ سب مندر دیکھنے کی ضرورت تھی اور نہ ہوت۔ جو مندر ہمارے راستے میں آیا اسے دیکھے ڈالا اور جو نیچے گیا اسے جانے دیا۔ بدھ مندوں کی ایک مخصوص طرز تعمیر ہوتی ہے۔ ایک گنبد نما ”سٹوپا“ ہوتا ہے، جس میں گوتم بدھ کی راہکھ ہوتی ہے۔ پھر گوتم بدھ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے مجسمے۔ مجسموں کے سامنے نذرانے پیش کرتے عقیدتمند۔ اگر بیوں اور تازہ پھولوں کی خوشبو۔ زعفرانی بیادوں والے بدھ بھکشو۔ ہر بدھ مندر میں امن، سلامتی اور سکون بہت ملتا ہے۔ ذہنی سکون بھی اور روحانی سکون بھی۔

مگر ہمیں اسوقت جسمانی سکون کی بہت ضرورت تھی۔ کیونکہ دن بھر سائیکل چلانا اور درویش اول کے وجود کے پوچھ کو ڈھوننا کوئی آسان نہ تھا۔ لہذا پہلی ہی فرست میں سائیکل واپس اور سوانا باٹھ پر حملہ۔ چونکہ چیانگ مائی بناک کے مقابلے میں ابھی کم کر شلی ہوا ہے اس لئے یہاں ہر کام تسلی سے بھی ہوتا ہے اور خلوص سے بھی۔ ماش کرنے والی بیسی نے اس چا بکدستی سے ماش کی کہ ہم گھوڑے کی طرح چاق و چوبیدہ ہو گئے اور دن بھر کے نہ عال جسم میں کرٹٹ سا آگیا۔ درویش اول کی بیٹھی چارج ہوتے ہی اسکی جاپانی کھلوٹے والی چال پھر سے لوٹ آئی، مگر درویش دوم کی کچھوئے والی مچال پر صرف اتنا اٹڑ ہوا کہ وہ ہاتھی کی طرح جھوم جھوم کر چلنے لگا۔ اور ہاتھی بھی سفید ہاتھی۔ خدا کا شکر ہے کہ چیانگ مائی کے لوگوں کو درویش دوم

کاشتکاروں کے مطابق اگر وہ کوئی اور فصل کاشت کریں تو وہ اسکے لئے عذاب جان بن جاتی ہے۔ کیونکہ اس فصل کو منڈیوں تک لے جانے کے لیے انہیں دشوار گزار پنڈتیوں سے گزر کر جانا پڑتا ہے اور یہ کئی دن کا تکلیف وہ سفر ہوتا ہے۔ مگر اس کے مقابلے میں اگر انیون کاشت کریں تو یوپاری گھر بیٹھے رقم دے کر ساری فصل لے جاتے ہیں۔ پہلے پہل تو انیون کی کاشت صرف اس سولت کے لئے کی جاتی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب صرف انیون ہی تھی کوئین نہیں بنی تھی۔ جب سے انیون کو کین بن کر فیشن ایبل نشہ بن گئی ہے اور اسے امریکہ اور یورپ کے نوجوانوں نے اپنایا ہے تب سے یہ کروڑوں کا کاروبار بن گیا ہے اور اس کاروبار میں انٹرنیشنل گینگ ملوث ہو گئے ہیں۔ امریکہ میں استعمال ہونے والی ۲۰ نیصد کوئین گولڈن ڑائی ایمنل سے آتی ہے۔ ویسے اس بدنی میں پاکستانیوں نے بھی بڑا نام پیدا کیا ہے۔ دری، باجوڑ اور فرنٹیر کی دوسری وادیوں میں اسکی کاشت ہوتی ہے اور لندی کوئل کی فیکٹریوں میں انیون سے کوئین بنائی جاتی ہے۔ سرحدیں اکثر ناجائز کاروبار کو جنم دیتی ہیں۔ جس طرح گولڈن ڑائی ایمنل نے اس کاروبار میں نام کمایا اسی طرح اب گولڈن کرینٹ یعنی افغانستان، پاکستان اور ایران نے بھی بڑا کمال دکھایا اور اب ہر پاکستانی جب دنیا میں کسی ہوائی اڈے پر اترتا ہے تو اس سے چوروں کا ساسلوک کیا جاتا ہے۔ اکثر جامہ ملائشی میں جاتی ہے اور سماں پر باقاعدہ کتے چھوڑے جاتے ہیں۔ ملک سے باہر جو رسوائی ہوتی ہے وہ تو الگ ہے اصل الیہ تو ملک کے اندر شروع ہو گیا ہے۔

نشہ کھبور کا ہو یا انگور کا، پوست کا ہو یا بھنگ کا، جو کا ہو یا کوئین کا، چند لوگوں اور چند جگہوں تک محدود تھا۔ شراب کی باقاعدہ دکانیں تھیں اور انیون کے باقاعدہ ٹھکے تھے۔ پھر قانوناً یہ سب کچھ ختم کر دیا گیا۔ اس معركے میں عوامی رہنمای بھی شامل تھے اور علمائے دین بھی۔ اب وہ کاروبار محدود سے لامحدود ہو گیا ہے۔ وہ دبایا جو سریازار ہوتی تھی اب اندر گراونڈ چلی گئی ہے۔ وہ چیزیں جنہیں حاصل کرنے کے لئے چوراہوں پر جانا پڑتا ہے اب چار دبیواری میں میرہیں۔

گناہوں کو لیکر کیسے تیرتی۔ تم کسی سینہر کا بندوبست کرو۔ ”ایسے موقعوں پر درویش اول ہم لوگوں کو بالکل نظر انداز کر دیتا تھا۔ چنانچہ اس نے درویش دوم کو ہولے سے ”شٹ اپ“ کہا اور اپنے گناہوں کو بہانے کا بہانہ بنا کر پھولوں سے ندی اس گلبدن سے سریش ہو گیا۔ سال بھر کے گناہ رات بھر میں بہ گئے .... اور اب یہ پاکدا من بیسیاں اگلے تواری کی تیاری میں کشتوں کا بوجھ بدلانے چل پڑیں۔ درویش اول کے گناہ بھے یا بڑھے اسکا ہمیں علم نہیں، البتہ آخری خبریں آنے تک وہ کشتی رانی میں صروف تھا۔

درویش اول اپنے گناہوں کا بوجھ ہلاکرتے کرتے اتنا ہلکا ہوا کہ اسے بترے باقاعدہ گھینٹا پڑا۔ اس سفر میں یہ پہلا موقع تھا جو تیاری کے معاملے میں درویش اول کے ساتھ وہی کاروائی کی جا رہی تھی جو عام حالات میں درویش دوم کے ساتھ کی جاتی تھی۔ ہماری مسلسل ہنگامہ آرائی سے تھگ اگر اس نے اپنی زلفوں کو سجانے کی جنگ شروع کی۔ ایک ایک زلف دراز کو گیلا کیا جو اتنا طویل کام نہ تھا۔ کیونکہ گھنٹی کی چند زنگیں تھیں۔ پھر ان کا تانا بانا سا بنا اور اپنے سر کے گلوب پر بچھا دیا۔ چند زلفوں کی ایک لٹ کو اس خوش اسلوبی سے پیشانی پر سجا دیا کہ پھرے اور سر کے درمیان ایک قدرتی باکونڈری سی بن گئی۔ آخر میں زلفوں کے اس جال پر اس انداز سے پرے کیا کہ جو زلف جمال تھی سر سے سریش ہو گئی۔ درویش اول نے یہ سب کام اس ہر مندی سے کیا کہ ہم اسکی قابلیت کے قائل ہو گئے۔

چیانگ مائی کے شمال میں برا، لاوس اور تھائی لینڈ کی سرحدوں کے ملاب پر ایک تکون سی بن جاتی ہے جو گولڈن ڑائی ایمنل کے نام سے مشہور ہے۔ یہ ایک دشوار گزار پہاڑی علاقہ ہے۔ جمال تک ان گھنے جنگلوں اور ندی نالوں کی کثرت کے سبب وہاں تک رسائی کا تعلق ہے تقریباً ناممکن ہے۔ یہاں صدیوں سے مختلف قبائل آباد ہیں جو انیون کی کاشت پر اپنا گزر اوقات کرتے ہیں۔ وہاں صرف دو ہی فضلوں کی کاشت ہوتی آتی ہے۔ کھانے کے لئے چاودل اور کیش کیلئے انیون۔ ان قبائل

بری طرح سے نشانہ بنے ہیں۔ یہ لوگ ریاست چترال کی تین چھوٹی سی وادیوں رمبو، ببوریت اور بریر میں آباد ہیں اور صدیوں سے آباد ہیں۔ اسی طرح کی کچھ وادیاں افغانستان میں بھی جہاں پر یہ لوگ آباد تھے۔ افغان تو نیمادی طور پر تندیب و تمن کے لیئے ہیں، جنکی درندگی پر تاریخ نادم ہے۔ چنانچہ زور شمشیر کی افغان تندیب نئے کلاشوں پر حاوی آئی اور وہ وادیاں نورستان میں بدل دی گئیں۔ کچھ یہی خوش ہمارے کلاشوں کا ہوا ہے جو مختلف قسم کی یاخار کا شکار ہیں۔ ان وادیوں میں داخل ہونے سے پہلے ایون کا قبضہ ہے۔ اس قبضے کے لوگ بست عیار ہیں۔ معصوم کلاش ان کی عیاری کا شکار ہیں۔ ان عیاروں نے چند بکریوں کے عوض ان کی زمینیں اور چند سکوں کے عوض انکے صدیوں پرانے اخوت کے درخت ہتھیا لئے ہیں۔ اب زمینوں پر بھی ان کا قبضہ ہے اور باغات پر بھی۔ اہل ایون کی عیاری، ظلم کا صرف ایک پہلو ہے۔ اصل مسئلہ تو نگ نظر ملا کا اسلام ہے۔ جو ان چند لوگوں پر دائرہ حیات نگ کرتا جا رہا ہے۔ وہ محمدؐ کا اسلام۔ سلامتی، رحم دل، برباری، انصاف، امن اور رواداری کا اسلام کماں ہے؟ کیا محمدؐ کے اسلام میں اقلیتوں کے لئے کوئی گنجائش نہ تھی؟ اگر تھی تو پھر خدار کلاشوں کو نملا کے نگ نظر اسلام سے بچائیے۔ قبل اس کے کہ انکا وجود افغانستان کی طرح یہاں بھی ختم ہو جائے اور ہم لوگ تاریخ کے کنہرے میں مجرموں کی طرح پیش ہوں۔

تحالی لینڈ کے میو قبیلوں کو نہ ملا کا خوف ہے اور نہ ایون کے عیاروں کا۔ ان ہنس مکھ لوگوں کے ساتھ ہماری لمبی ملاقاتیں رہیں۔ درویش اول نے تو اسکے کھانے کی دعوت بھی قبول کر لی جو جیپ ڈرائیور سمیت ہم نے مل کر کھایا۔ کھانے سے فارغ ہوئے تو سیدھے چیانگ مائی کے ہوائی اڈے کی راہ اختیار کی، جہاں سے جہاز پکڑ کے بنکاک جانا تھا اور وہاں سے سیدھا سنگاپور پہنچنا تھا۔

ہاں تو یہاں ذکر گولڈن ٹرائی ایسٹرنگ کے قبائل کا ہو رہا تھا جن میں سے ایک میو قبیلہ چیانگ مائی کے قریب پہاڑیوں پر آباد ہے۔ جہاں پہنچنے کیلئے ہم لوگ ایک جیپ میں سوار ہوئے۔ حسب معمول درویش اول نے جیپ کی انگلی سمیت پر قبضہ جمایا اور ہمارا سفر شروع ہوا۔ شرسرے چند میل دور شاہی محل کے پہلو سے ایک سڑک مرتعی ہے جو پہلے پکی اور پھر کچھی ہو جاتی ہے۔ جیپ کی پچھلی سیٹوں پر اچھتے ہوئے ہجکو لے کھاتے کچھ دیر تک تو یہ سفر جاری رہا اور پھر کچھی سڑک بھی ختم ہو گئی۔ اب ایک پہاڑی گنڈنڈی سے میو گاؤں تک جانا تھا۔ جو درویش دوم کے لئے جان لیوا کام تھا۔ ویسے بھی درویش دوم کی سیاحت کا دائیہ بیشترا پاکستانیوں کی طرح شاپنگ پلازاوں تک ہی محدود تھا۔ اور میو گاؤں تک جا کر اس نے گویا ہماری سات پشتوں پر احسان دھر دیا ہو۔ خدا خدا کر کے اس گاؤں میں پہنچ۔ لکڑی کے بنے چھوٹے چھوٹے گھر۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں والے چھوٹے چھوٹے لوگ۔ میو قبیلے کے اکثر مرد شکاری ہوتے ہیں اور ہمارے فرنیئر کی طرح وہاں بھی بندوق مرد کا زیور سمجھا جاتا ہے۔ یہ تحالی لینڈ کا واحد علاقہ ہے جہاں مردوں نے موچیں رکھی ہوئی تھیں۔ ہمارے پہاڑوں کی طرح یہ لوگ بھی بڑے سماں نواز واقع ہوئے ہیں۔ عورتوں نے گھرے نیلے رنگ کے لے لئے جبے پن رکھتے تھے جن پر شرخ رنگوں کی کڑھائی کا کام کیا ہوا تھا۔ کانوں میں چاندی کے بندے اور بالیاں اور گردن میں رنگ برلنے منکوں کے ہار۔ یا جوں کی کثرت کے سبب یہاں بھی تصویر اُمارنے کے پیسے دینے پڑتے ہیں۔ میو قبیلے کے لوگ بالکل ہمارے کلاش لوگوں سے مشابہت رکھتے ہیں۔ عادات، اطوار اور لباس تقریباً یکساں ہیں، رنگ و روپ میں البتہ نیا وی فرق ضرور ہے۔ کیونکہ ہمارے کلاش بڑے خوبصورت لوگ ہیں۔ مگر اس قسم کی اقلیتوں کے مسائل ساری کائنات میں ایک جیسے ہیں، چاہے وہ امریکہ کے ریڈ انڈین ہوں یا جنوبی امریکہ کے انکاڑ۔ تحالی لینڈ کے میو ہوں یا پاکستان کے کلاش۔ بھی ترقی یافتہ تندیبوں کا شکار ہو کر انسانی چڑیاگھروں میں بدل دیئے گئے ہیں۔ ہمارے ملک کے دو اڑھائی ہزار کلاش تو نہ ہی اور تندیبی ستم کا

# سنگاپور



”—— جیون میں ایک بار آنا سنگاپور —— دیکھو جی دیکھو ——“  
 درویش دوم کے بے ڈھنگے ہاتھ نے میرا منہ بند کر دیا اور درویش اول نے کہا ”بایا کوئی خطا ہو گئی ہو تو بخش دو —— ہمیں کس جرم کی سزا دے رہے ہو جو بنکاک سے دماغ کھانا شروع کر رکھا ہے۔“ میں نے تملکا کر کہا۔ — “جو تمہارا دماغ کھائے گا اس کو توفاقہ ہی ہو گا۔“ درویش دوم نے میرے تازہ ترین زخموں پر نمک چھڑکتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا گلا کائٹے کے قابل تو ہے گانے کے قابل ہرگز نہیں۔“ مجھے مجبورا ان بد ذوقوں کی وجہ سے اپنا سکیت بند کرنا پڑا۔ میں نے دل بھلانے کے لئے ایئر ہوسٹس کو بلایا اور اس سے باتیں شروع کر دیں ہماری گفتگو میں باتیں کم اور قصیٰ نہیں تھے۔ جب درویشوں کے بیزار چروں پر رونق کے آثار نمودار ہونے لگے اور وہ منہ سنوار کر ایئر ہوسٹ سے کچھ بات کرنا ہی چاہتے تھے تو میں نے اسے ”خدا حافظ“ کہ کر جانے دیا۔ میری اس بات سے دونوں درویش ناراض ہو گئے اور منہ بورے ہر ماشرز واکس کاٹریڈ مارک بن کر بیٹھ گئے۔ پھر سنگاپور تک ہمارا His Masters Voice سفر ایسا خاموش اور با ادب گزرا جیسے پورے راستے قوی ترانہ بجا رہا ہو۔  
 جہاز بادلوں کے آنجل کو ہٹاتا ایئرپورٹ پر اتنے کے لئے پنج پرواز کرنے لگا۔ میں نے دونوں درویشوں کے لوازمات کے پسیر پارٹس، جن میں ٹھہراس، کیمرو اور شیوگنگ کا سامان تھا، اپنے گلے کا ہار بانے شروع کئے۔ دوسرے مسافروں نے بھی دستی

بیوں کے بال کئے پر درویش اول سب سے زیادہ خوش نظر آ رہا تھا اور زور زور سے قتے لگا رہا تھا۔ شاید اس لئے کہ اسے اپنے بال کئے کا کوئی خطرہ نہ تھا۔ ادھر دیکھا تو درویش دوم غائب تھا۔ درویش اول کو سامان کے پاس کھڑا کر کے اس کی حلاش شروع ہوئی۔ وہ ایک ستون کے پیچے چھپا کھڑا تھا۔ میں نے پوچھا ”یہ آنکھ مچوں کھینے کا کون سا وقت ہے؟“ درویش دوم نے معصومیت سے کہا۔ ”یار! پولیس والے بال کاٹ رہے تھے میں نے سوچا کہیں مفت میں جماعت نہ ہو جائے۔“

میں نے جل کر کہا۔ ”چھوڑ یار۔ بال بیوں کے کٹ رہے ہیں، بھالوؤں کے نہیں۔ تمیں کیا خطرہ۔“

ہواں اڈہ ہر ملک کی ترقی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ سنگاپور کے ایزپورٹ کو دیکھ کر بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ملک خوشحال ہے۔ قوی ہوائی کمپنی سنگاپور ایئر لائنز کے علاوہ درجنوں میں الاقوامی ہوائی کمپنیوں کے جیٹ طیارے سنگاپور کی فضا میں چلتھاڑتے رہتے ہیں۔ ایزپورٹ بلڈنگ کے اندر ہوٹل کی معلومات کے کاؤنٹر پر بھی درجن لڑکیوں کی طرف رجوع کیا۔ اپنا بجٹ بنا کر ہوٹل کے متعلق مشورہ لیا۔ انہوں نے سکنڈ ہوٹل King Hotel میں ٹھہرنے کو کہا۔ ہم نے کمپیوٹر دماغ درویش کی طرف دیکھا تو وہ آنکھیں بند کئے منہ ہی منہ میں کچھ بڑا برا رہا تھا۔ جب اس نے آنکھیں کھویں تو ان میں ایک خاص قسم کی روشنی تھی۔ ہم سمجھ گئے کہ گیان ہو گیا ہے۔ کمرے بک کرائے اور نیکی سینڈ کی طرف جانے لگے۔

ایک پادری قلی نے آگے بڑھ کر سامان اٹھانے کی بیکش کی تو درویش اول نے میری طرف متنی خیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اسے منع کر دیا۔ گویا بات اب مجھ بے وردی قلی تک آپنی تھی۔ سامان اٹھانے پر تو مجھے کوئی خاص اعتراض نہ تھا مگر حسینوں کے جھرمٹ میں ایسی بے حرمتی قدرے کھل رہی تھی۔ مگر پھر سوچا کہ دانہ خاک میں مل کر گل گلزار ہوتا ہے۔ گلزار ہونے کی خاطر میں نے دونوں درویشوں کا سامان اٹھایا اور یہ دونوں حسب عادت منک منک کر چلنے لگے۔

سامان اس طرح مفہومی سے اپنے دست راست میں تھام لیا گیا وہ ایسا نہ کرتے تو جہاز کا عملہ اس سامان کو لے اڑتا۔ اب دونوں درویشوں نے میرے ساتھ سفارتی تعلقات بحال کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ کیونکہ اب میری زبان و رازی ان کے کام آنی تھی۔

ہوٹلوں کے بارے میں تفصیل معلوم کرنا، کشم والوں سے دو دو ہاتھ کرنا، نیکی تک سامان اٹھانا اور پھر کرایہ طے کرنا یہ سب میرے فرائض تھے۔ سب سے پہلے پولیس کا سامنا ہوا۔ انہوں نے پاسپورٹ سے زیادہ واپسی کے نکٹ کو دیکھا اور ایک بفتہ کی سیاحت کے لئے ویزے کا ٹمپہ ویزا لگا دیا۔

کشم والوں نے صرف زبانی حساب کتاب لیا۔ ہم نے جو کما اس پر اعتدال کیا۔ سب سے جiran کن بات یہ تھی کہ کشم والے مسکرا رہے تھے اور سیاحوں سے گیئیں ہاٹک رہے تھے۔ بھلا کشم والوں کا کیا کام ہے جو مسکرائیں اور سیاحوں سے سملکروں کا سالوک نہ کریں۔ کشم کے شرفا نہ روئے نے ہمارے اور سنگاپور کا بہت اچھا تاثر چھوڑا، مگر وہیں ایک اور دلچسپ حادثہ بھی پیش آیا۔ اس حادثے کا شکار تینوں درویش نہیں بلکہ دو پہنچتے۔ سنگاپور کی حکومت کی طرف سے سنگاپور میں بیوں کا داخلہ منوع ہے۔ اسی جہاز سے ایک پسی اور ایک پہنچنی بھی سفر کر رہے تھے۔ انہیں پولیس نے روک لیا۔ ایزپورٹ پر ایک بھوم اکٹھا ہو گیا۔ ان کے داطھے کی شرط یہ رکھی گئی کہ وہ بال کٹوائیں۔ مگر پسی تو اپنے لبے اور غلیظ بالوں کو سمن کے بال سمجھتے ہیں۔ بال کئے سے تو ان کے اصولوں کی توجیہ نہیں تھی۔ بھلا وہ اپنے اصولوں پر کسی حکومت کے قانون کو کیسے چلنے دیتے۔ مگر ظالم پولیس والوں نے دو مجبور بیوں کے بالوں پر اپنے قانون کی قینچی چلا دی۔ ان کی سحری اور خمار زلفیں کٹ کر ان کے خستہ حال دامن میں آگریں۔ بھوم کے قلقوں میں ان مجبوروں کی سکیاں سننے والا کوئی نہ تھا انہوں نے اپنے ویران اصولوں کی یاد کو سمجھتا۔ بے بس اور پر نم آنکھوں سے بھوم کو دیکھا، اپنے رک سیک کندھوں پر اٹھائے اور چپ چاپ ایزپورٹ سے باہر نکل گئے۔

میکسی والے نے میز گھایا تو سر چکرا گیا۔ مگر یہ تسلی کی بات تھی کہ پیسے صرف وہی ادا کرنے ہو گئے جو میز پر ہونگے۔ یہ الگ بات ہے کہ میز کے ہندسے بڑھانے کے لئے میکسی ڈرائیور صراط مستقیم پر چلنے کے بجائے گراہ ہو جائے۔ میز کی تک نک اور دل کی دھک دھک برابر جاری تھی۔ میں نے دل کی دھڑکنوں کو بہلانے کے لئے گاڑی سے باہر نگاہیں دوڑانی شروع کر دیں۔ جہاں ہواں اڑے کی سڑک میں روڈ پر داخل ہوتی ہے۔ اس چوک میں ایک بہت بڑا فوارہ ہے جس کے ابتدے ہوئے آباد پہنچ گئے ہوں۔ درختوں کے جھرمٹ میں وہی سرخ اور ڈھلان چھتوں والے مکان، وہی سڑکوں کی اوپچائی اور نچائی۔ مگر سنگاپور کے کچھ حصے ہی اس طرح کا منظر پیش کرتے ہیں زیادہ تر شرمنیدان میں سندر کے کنارے واقع ہے۔ اس میکسی میں میز کے سوا سب خاموش تھے۔ ڈرائیور نے تو چپ سادھ رکھی تھی۔ نہ بنکاک کے ڈرائیوروں کی طرح لڑکیوں کا تذکرہ نہ سوتا باقاعدہ کا ذکر۔ بس اک طویل خاموشی۔ ہم نے سنگاپور سے جو امیدیں باندھ رکھی تھیں وہ ٹوٹنے لگیں۔ شرکے ایک چوک سے گزرے تو مسجد کے مینار دکھائی دیئے۔ نمازیوں کو دیکھا تو یاد آیا کہ ماہ رمضان ہے۔

مگر ہم لوگ تو سفر میں تھے اور سفر میں روزے معاف ہوتے ہیں۔

سکندر ہوٹل کے سامنے میکسی رکی۔ میز کی تک بند ہوئی تو دل دھک دھک سے تک دھنا دھیں کرنے لگا۔ ہم نے میکسی سے قدم باہر رکھا ہی تھا تو میں باور دی مشینے ہم پر شکروں کی طرح چھپے۔ اور وہ سامان جسے میں اکیلا اٹھا لایا تھا اس انداز میں اٹھایا جیسے پہاڑ اٹھا لیا ہو۔ ہوٹل کے دروازے پر سرخ قالین پر قدم جانا تھا کہ شیشے کا دروازہ خود بخود ایسے کھل گیا جیسے کسی جادوگر نے کہہ دیا ہو

”کھل جاس سم۔“ کاؤنٹر پر کھٹی لڑکیوں کے کچھ سے ملاقات ہوئی۔ ان میں سے ہر ایک نے ایک ایک عدو مسکراہٹ سے نوازا۔ گویا مسکراہٹوں کی نمائش ہو رہی تھی اس کچھ کا ہر دانہ بے داغ تھا۔ میں نے کروں کی چاپیاں وصول کیں اور لفت کے ذریعے ہوٹل کی گیارہ منزلوں میں سے سات منزلوں کو طے کیا اور اپنے کمرے میں جا پہنچ۔ یہ ہمارا معمول تھا کہ ہم ہیشہ دو کمرے بک کراتے تھے۔ ایک کمرے میں دو درویش اور دوسرے میں ایک درویش ہوتا ہے۔ دراصل ان دونوں درویشوں میں سے ایک کا ساتھ نہ جانا بھی کچھ میری ہی ذمہ داری بن گئی تھی۔ اب سنگاپور میں مجھے خراں والے درویش دوم کے کمرے میں رہنا تھا۔

ہم نے جلدی جلدی اپنے گرد آلودہ چاند سے مکھڑوں کو جھاڑ پوچھ کر اس قابل کیا کہ کسی کو منہ دکھائیں۔ تیار ہونے کے سلسلے میں درویش اول کی ایک بات قابل تعریف تھی کہ وہ تیاری میں پانی سے زیادہ یوڈی کلوں اور آفٹر شیو لوشن استعمال کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہمیں کوئی خوبصورتگانے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی تھی۔ سب سے جلدی میں تیار ہوتا تھا کیونکہ میں تو بچپن سے اسی مقولے پر سختی سے عمل کرتا رہا ہوں کہ شیروں کا منہ کس نے دھویا ہے۔

سنگاپور مشرق کا واحد شر ہے جس کا صفائی کے لحاظ سے سوٹر لینڈ کے کسی بھی شر سے مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ سنگاپور میں بھی بارش تو بناک کی طرح ہوتی ہے مگر یہاں سڑکوں پر پانی نہیں کھڑا ہوتا۔ سڑکوں کے دونوں جانب فٹ پاٹھ کے نیچے نالیاں نہیں ہیں جن میں پانی بہس جاتا ہے۔ چائنا ٹاؤن پہنچے تو معلوم ہوا کہ سنگاپور کے اجلے دامن میں بھی غلامت کے داغ موجود ہیں۔ چائنا ٹاؤن میں تمام پرانی آبادی ہے اور قسم سنگاپور (جب یہ صرف چھپیوں کا گاؤں تھا) اسی جگہ آباد ہتا۔ اب بھی اس کی گلیاں تک اور تاریک ہیں۔ سڑکوں پر غلامت کے ڈھیر بھی نظر آتے ہیں اور غربت بھی۔ مگر یہ احساس شدت سے ہوتا ہے کہ مشرق کی یہ یادیں بہت جلد ترقی کے ہاتھوں نکست کھا جائیں گی۔ سنگاپور میں بہت سی جگہوں پر پرانی آبادیوں کو مسماں کر

جاتا ہے۔ سنگاپور نے خاندان سری وجیا کے دور میں خوب ترقی کی، مگر ۱۹۷۷ء میں جادا کی فوجوں نے سری وجیا خاندان کو تباہ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی سنگاپور کی اہمیت ختم ہو گئی اور یہ جزیرہ سمندری لیسوں کا مرکز بن گیا۔ ان بھری قذاقوں نے گرد و نواح کے سمندروں پر اپنا تسلط جمالیا تھا۔ اس طرف سے گزرنے والے تجارتی جہاز ان لیسوں کو نیکس ادا کر کے ادھر سے گزرتے تھے۔ آہستہ آہستہ اس جزیرے پر سلطان حسین محمد شاہ کا قبضہ ہو گیا۔ ۱۸۱۹ء میں سر ریفلز نے برطانیہ کے لئے جنوب مشرقی ایشیا میں بند رگاہ کی تلاش شروع کی تو اس کی نظر انتخاب سنگاپور پر پڑی۔ سر ریفلز نے سلطان سے معابد کر کے سنگاپور اور اس کے ارد گرد ۱۱ میل تک کے جزیروں کو سرکار برطانیہ کے چنگل میں پھنسایا۔ اپنی جنگ ایمانی پوزیشن کی وجہ سے سنگاپور کی بند رگاہ آسٹریلیا سے انگلستان تک جانے والے تجارتی جہازوں کے لیے ایسا مقام تھا جہاں ان کا رکنا لازمی تھا۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں سنگاپور نے ملاکا اور پیناگ کی بند رگاہوں کو مات کر دیا۔ دوسری جنگ عظیم میں جاپانیوں نے سنگاپور پر قبضہ جمالیا اور اتحادیوں کے تقریباً آٹھ ہزار فوجیوں نے یہاں ہتھیار ڈال دیئے۔ جاپانیوں کی مکلت کے بعد ایک بار پھر یہ جزیرہ برطانیہ کے قبضے میں چلا گیا۔ لیکن اب غلام دنیا میں آزادی کے نفرے بند ہو رہے تھے۔ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۷۵ء تک سنگاپور مختلف ادوار سے گزرا اور آزادی کی جدوجہم جاری رہی۔

۳۱ اکتوبر ۱۹۷۱ء کی صبح توپوں کی گھن گرج نے درویش دوم جیسے مست بندے کو بھی چونکا دیا۔ توپوں کی آواز اور گھبیر ہوتی گئی اتنے میں درویش اول شلوار پہننے، گلے سے نگاہ ڈیل روٹی کا سا بیٹت نکالے کمرے میں آیا۔ خوف سے اس کی قلیل زلفی ایشن کھڑی تھیں۔ اس نے خوفزدہ نگاہوں سے ہماری طرف دیکھا تو ہم پسلے ہی بستر میں مورچے سنبھالے بیٹھے تھے۔

ریڈیو سنگاپور سے اس الوداعی پریڈ کا آنکھوں دیکھا حال نشر ہونے لگا تو ہمیں کچھ تسلی ہوئی۔ ۱۹۵۲ء سال کے قبضے کے بعد برطانیہ کی فوجیں ہیشہ کے لئے سنگاپور سے

کے نئی عمارتیں تعمیر کر دی گئی ہیں۔ اسی طرح ایک دن چاٹا ٹاؤن کی چھل پبل بھی ٹاؤن پلیٹنک کا شکار ہو جائے گی۔  
ایک ہوٹل کے سامنے ہجوم دیکھا تو وہاں پہنچ گئے۔ گوشت تلا جا رہا تھا۔ یہ شاید سنگاپور کا بندو خاں ہو۔ تبھی تو اتنا راش تھا۔ میں نے درویش اول سے بڑے پیار اور ادب سے کہا ”جلدی سے چار پانچ پلیٹ کا آرڈر دیدو۔“ درویش اول نے کہا ”تمیں معلوم ہے یہ کس چیز کا گوشت ہے؟“ میں نے لا پرواٹی سے کہا ”اس وقت تو برا گوشت بھی چل جائے گا۔“ درویش اول نے چلا کر کہا ”ارے یہ سانپ کا گوشت ہے۔“ سانپ کا! میرا جسم ٹھٹھا ہونے لگا۔ بھوک غائب۔ سامنے شوکیس میں مختلف قسموں کے سانپ لٹکے ہوئے تھے۔ وہاں زندہ سانپ بھی موجود تھے تاکہ گاہوں کے سامنے سانپ ہلاک کر کے انھیں تازہ گوشت کھلایا جاسکے۔ ایک بڑے سے چھٹے میں سانپ کو جکڑ کر اس کا گلا دبایا جاتا ہے۔ جب سانپ مر جائے تو اس کی گردن اور دم علیحدہ کر دی جاتی ہے کیونکہ اس میں زہر ہوتا ہے۔ پھر سانپ کا پیٹ چاک کر کے اس کی کھال اتاری جاتی ہے اور گوشت کے ٹکڑے مچھلی کے ٹکڑوں کی طرح تل کر لوگ چٹھارے لے لے کر کھاتے ہیں۔ اس خوراک کو دیکھ کر بھوک تو ختم ہوئی سو ہوئی البتہ خوف طاری ہو گیا۔ رات بھر سانپوں کے خواب آتے رہے۔

ٹھماںک (سمندری شر) سنگاپور کا اس نام کا نام ہے جب یہ صرف مجھیوں کا گاؤں ہوتا تھا۔ اس کا موجودہ نام اسے ساڑا کے شہزادے نیلا اتنا نے دیا۔ کہتے ہیں یہ شہزادہ فتوحات کی غرض سے بھری بیڑا لے کر نکلا۔ اس جزیرے کے قریب پہنچا تو ساحل پر اسے ایک عجیب و غریب جانور دکھائی دیا۔ اس کے مشیروں نے اس جانور کا نام سنگاپور پڑھایا۔ شہزادے نیلا اتنا نے اسی جگہ پر اپنے جہازوں کو لنگر انداز ہونے کا حکم دیا۔ شر کی بنیاد رکھی اور اس کا نام سنگاپور (شیر کا شر) تجویز ہوا۔ گو سنگاپور کے گھنے جنگلوں میں شیر کا وجود عقل تلیم نہیں کرتی۔ نہ ہی شہزادے اور اس کے مشیروں کے علاوہ کسی نے اس جزیرے میں کوئی شیر دیکھا مگر آج تک اس شر کو اسی نام سے یاد کیا

چیزیں ہیں جن کا ہماری سڑکوں کے ساتھ قریبی تعلق ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ہمیں سنگاپور کی صاف، شفاف سڑکیں سونی سونی دکھائی دے رہی تھیں۔ درویش دوم نے آکتا کہ کہا۔ ”چلو یار ان سڑکوں پر کیا رکھا ہے۔ نائیگر بام گارڈن دیکھنے چلتے ہیں۔“ ہم نیکی میں سوار ہوئے اور ساحل کے ساتھ ساتھ نائیگر بام گارڈن کا رخ کیا۔ سڑک کے بائیں جانب ملاکابے کے نیلگوں سینے پر ہپکو لے کھاتے جزاً حد نظر تک پھیلے ہوئے تھے۔ دائیں جانب سبزہ زار سے ڈھکی اور ناریل کے پیڑوں میں چھپی اوپھی پنجی پھاڑیاں تھیں۔ اب ہم جدید سنگاپور سے نکل کر قدم سنگاپور سے گزر رہے تھے۔ پھاڑی ڈھلانوں پر بنے لکڑی کے چھوٹے چھوٹے غلیظ گھروں کے سامنے مجھوں کے جال لٹک رہے تھے۔ نیک دھڑکن پنچے دنیا سے بے خبر اپنی ہی دنیا میں کھوئے ہوئے ان غلیظ گھروں کے آنکن میں کھیل رہے تھے۔ سڑک کا ایک موڑ مرٹے ہی نائیگر بام گارڈن کا مین گیٹ دکھائی دیا۔

نائیگر بام گارڈن ایک چینی رئیس کی تخلیق ہے۔ نائیگر بام دراصل ایک مرہم کا نام ہے جو جوڑوں اور پھٹوں کے درد کا بہترین علاج ہے۔ یہ مرہم ایک چینی رئیس کی فیکٹریوں میں تیار ہوتا ہے۔ جس نے اس مرہم کی شرت کے لئے یہ باغ بنوایا ہے۔ اسی نام کا ایک باغ ہاگ کانگ میں بھی میں نے دیکھا۔ مگر سنگاپور کا گارڈن بہت وسیع ہے۔ باغ کا جو قصور عام ذہن میں آتا ہے یہ باغ بالکل اس سے مختلف ہے۔ کیونکہ اس باغ میں روایتی چھلدار درخت اور پھولوں کے پودے نہیں دکھائی دیتے۔ بلکہ چنانوں کو کاش کر مجھتے تراشے گئے ہیں جو مختلف کمانیوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان میں بیشتر کمانیاں چینی دیوملا سے لی گئی ہیں۔ چنانوں سے تراشے ہوئے مجھتوں کو قدرتی رنگ دیئے گئے ہیں۔ مجھتوں کے ارد گرد کمانی کے مطابق مناگر پیش کئے گئے ہیں تاکہ دیکھنے والے کو یہ احساس ہو کہ کدار معمول کے مطابق روزمرہ کی زندگی گزار رہے ہیں۔ وہیں ایک بہت ہی دلچسپ منظر کی عکاسی کی گئی ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ کیسے انگریزوں نے اس علاقے پر قبضہ کیا، پھر کس طرح یہاں کے

روانہ ہو رہی تھیں۔ برطانیہ کا آفتاب اپنی کرنیں سمیت کر مغرب کی جانب لوٹ رہا تھا۔ سامر اجیت کے جنائزے کو بڑی دھوم سے اٹھایا جا رہا تھا۔ ہم مشرق والے بھی کتنے عجیب ہیں، صدیوں تک مغرب والوں کے ستم کا شکار رہے ہیں، ان سنگروں کو ملک سے نکالنے پر خوشی کے شادیاں بھی بجائے ہیں مگر نہ جانے کیوں کچھ عرصہ بعد ان کے بغیر ادیساں چھا جاتی ہیں اور مختلف بہانوں سے انسیں واپس بلا لیا جاتا ہے۔

درویش اول نے اپنے ذوق سیاحت کی تکیں کے لئے پیدل سیر کی تھانی۔ مگر ہم تینوں کی رفتار میں نبیادی فرق تھا۔ چنانچہ درویش دوم اپنی کچھوے جیسی چال کے سبب سب سے پیچھے ہوتا۔ درویش اول کی چال کے بارے میں تو میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ بالکل ایسے تھی جیسی جاپانی کھلونے کو چانپ بھر کے چھوڑ دیا جائے۔ لہذا وہ تیز تیز قدم اٹھاتا بت آگے نکل جاتا۔ دونوں درویشوں کے درمیان رابطہ قائم رکھنا میرا فرض تھا۔ اس لئے میں بھاگ کر کبھی درویش اول کے پاس پہنچتا اور کبھی درویش دوم کے پاس۔ یہ سلسہ کچھ دیر جاری رہا۔ ہم خزان کے چوں کی طرح ادھر ادھر بھیختے رہے۔ سنگاپور میں پیدل چلنے والوں کے لئے ایک بہت بڑی سولت ہے جس کا درویش اول نے بڑی شدت سے استعمال کیا۔ ہر چوک میں زیرا کراسنگ کے ساتھ پول پر بٹن لگا ہوتا ہے۔ جب کوئی بوڑھا بچہ یا لاگر قسم کا شخص سڑک پار کرنا چاہے تو وہ بٹن دبادے۔ اس طرح ٹریفک کی حق میں لال اشارہ ہو جائے گا۔ ٹریفک ہکم جائے گی اور پیدل لوگ جان کی بازی لگائے بغیر ہی سڑک پار کر سکتے ہیں۔ درویش اول کے لیے عام حالات میں سڑک پار کرنا اتنا ہی مشکل تھا جتنا نیپولین کی فوجوں کے لئے آبنائے برطانیہ British Channel عبور کرنا، مگر اب تو بٹن دبا کر کبھی سڑک کے اس پار اور کبھی اُس پار۔ جب وہ سڑک پار کر رہا ہوتا تو اس کے سپاٹ چہرے پر فتح و کامرانی کے کچھ ایسے ہی تماشات دکھائی دیتے جیسے امریکہ دریافت کرنے کے بعد کولبس کے چہرے پر ظاہر ہوئے ہوں گے۔

سنگاپور کی سڑکوں پر مگنڈی، مگداگر، کمھی اور دھوول دکھائی نہیں دیتی۔ یہی چار

کاؤنٹر کے پیچے تھی ہوئی محترمہ کو ایک عدد سلام اور دو عدد مسکراہٹوں سے نواز۔ پھر بڑے رازدارانہ انداز میں پوچھا۔ ”بی بی! اس وقت سیر کے لئے کونی جگہ مناسب ہے؟“ محترمہ نے مجھ سے بھی زیادہ رازدارانہ انداز میں آہت سے کہا۔ ”روی ٹریکٹروں کی نمائش لگی ہوئی ہے وہ دیکھ لیجئے۔“ بھلا روی ٹریکٹروں کو دیکھنے کے لئے سنگاپور آنے کی کیا ضرورت تھی۔ لڑکی نے میرے چہرے پر بیزاری کے آثار دیکھ کر کہا۔ ”آپ لوگ بوجی شریٹ چلے جائیں۔“ ”وہاں کیا ہو گا؟“ میں نے بے چینی سے پوچھا۔ ”وہاں روی ٹریکٹر نہیں ہونگے“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

رات جوان تھی اور درویش جوان تر۔ ہم شیروں کی طرح دہاڑتے ہوئے بوجی شریٹ پہنچے۔ وہاں کیا پہنچے کہ گویا کسی زنانہ جزیرے میں پہنچ گئے ہوں۔ ہر طرف بھر کلی چمکی لڑکیاں۔ آگے پیچے لڑکیاں، ہزاروں من لڑکیاں، ادھر ادھر لڑکیاں، ہزاروں من لڑکیاں اور پہنچے لڑکیاں، ہزاروں من لڑکیاں خیر ایسی بھی کوئی بات نہ۔ تھی۔ ہمارے پیشووا درویش اول نے ہم دونوں درویشوں کی جگہ دو غنچے، ہم گلبدن درویشاںیاں سنبھالیں اور بوجی شریٹ کے ایک بار میں مورچہ سنبھال کر بیٹھے گئے۔ درویش دوم کے سفید دسپاٹ چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا ایک جارہا تھا۔ جلتے بیجتے نیوان سائینوں کے رنگ، اٹھتے بیجتے جذبات کے رنگ اور آخر میں بھی رنگ رلیاں منانے میں مشغول ہو گیا۔ میں نے بھی طوطا چشمی اور چشم پوشی کا چشمہ اتار اور اسی حمام میں کو ڈیکھا جس حمام میں سب نگئے تھے۔

کیروں کی فلیش گنوں سے آنکھیں چند ہیاری رہی تھیں۔ مغربی موسيقی پر مشتق جسم ترپ رہے تھے۔ بار میں بھی رنگ بر گئی بو تکوں میں بند جن نکل کر انسانوں کو چڑھ گئے تھے۔ انسان اپنی فطری آزادی کا بھرپور مظاہرہ کر رہے تھے۔ اس مادر پدر آزاد ماخول میں درویشوں کو دیکھا تو وہ زلفوں کی چھاؤں اور بانسوں کی قید میں تھے۔ درویش اول کو دیکھا تو روگئے کھڑے ہو گئے۔ اسکے سر کے چیل میدان پر خون کا سیلا ب آیا ہوا تھا۔ چکن دل درویش اول تو خون خرابے سے دور بھاگتا تھا، مگر وہ خون سے لٹ

باشندوں کو غلام بنا کر رکھا۔ جس نے آزادی کا نعرو لگایا اسے زنجیوں میں جکڑ دیا اور کوڑوں کی سزا دی۔ دو گھنٹے کی مسلسل سیر کے بعد ہم تھک ہار کر ہوٹل کو چل دیئے۔ سنگاپور کو ایشیا کے خوبصورت Mini Asia کہا جاتا ہے کیونکہ یہاں ایشیا کی مختلف نسلوں، ملکوں، مذاہبوں اور زبانوں کے لوگ مل جل کر رہتے ہیں۔ اس ملاب نے سنگاپور کو ایشیا کا شوکیس بنا دیا ہے۔ چنانچہ سال بھر کوئی نہ کوئی تواری جاری رہتا ہے۔ تواری چاہے کسی مذہب سے تعلق رکھتا ہو اس میں بھی لوگ شریک ہوتے ہیں۔ کسی سیاح کو ایشیا کی تمام نسلوں کو بیریک نگاہ دیکھنا ہو تو وہ سنگاپور میں شام کے وقت ایلو یونیورسٹی واک پر چلا جائے۔ اس سیرگاہ میں سکھ سردار بھی دکھائی دیں گے اور چینی بھئی۔ یہ پارک سمندر کے کنارے سمندر کی سطح سے کوئی دس فٹ اونچا ہے۔ سمندر کی لمبیں پارک کی پتھریلی دیواروں سے نکراتی رہتی ہیں اور اس کی نمکین ہوائیں ناریل کے پیڑوں پر سرگوشیاں کرتی رہتی ہیں۔ ادھر پارک میں ربلوے پلیٹ فارم کا منظر ہوتا ہے جہاں خوانچہ فروشوں کی صدائیں بچوں کا شور اور بڑوں کے قلقے بلند ہو رہے ہوتے ہیں۔ ہم اس منظر سے اپنے آپ کو مانوس کر ہی رہے تھے کہ ایک صاحب تشریف لے آئے۔ ان کی دعوتی اور تلک اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ ہندو ہیں۔ انھوں نے ہمیں سمندر کے کنارے ایک مقام پر لاکھڑا کیا اور کہا کہ آنکھیں بند کر کے سمندر میں تین سکے پھینک کر کوئی تمنا کیجئے! ایک مراد پوری ہو جائے گی ”درویش دوم نے جھٹ کہا کہ تین سکوں سے تین مرادیں پوری ہونی چاہتیں۔“ درویش دوم کی مرادوں کا کیا ہوا، اس کی مجھے خبر نہیں۔ میں نے تو ایک ہی آرزو کی تھی وہ پوری ہو گئی۔ وہیں پر چھوٹے چھوٹے ہوٹل ہیں جہاں چٹ پٹی چیزیں ملتی ہیں۔ وہاں ایک مدراسی کے ہوٹل میں ہم نے ہماری کتاب کھائے اور ناریل کا پانی پیا۔ وہاں کے کتاب قسم کی چیزیں بھی ملتی ہیں جنہیں سیاح بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔

بنکاک کی رنگین راتوں کا ساتھ بھانے کے بعد سنگاپور میں سر شام سورہنا یہاں کی راتوں کے ساتھ سراسر نافضانی تھی۔ رات کو نوبجے ہوٹل سے نیچے اترے۔

سنگاپور کی سیر میں کراویں گی .... وہ تولاہور بھی آنے کو تیار تھی .... انہی پچھلے ہفتے ہی خط آیا تھا۔ کہتی ہے کہ میں لاہور آکر تمہیں لاہور کی سیر کرانا چاہتی ہوں .... "ادھروہ لڑکی نماہی بھرے اپنی اس ماڈل کی فیس فوٹو گرافروں کی اس رقم سے وصول کرتے ہیں جو انہیں سیاحوں کو تصویریں پہنچنے پر ملتی ہے۔ چنانچہ تصویروں کے وہ تینوں سیٹ ہم نے اپنے وزیر خزانہ درویش دوم کو پیش کر دیئے۔ اس نے بلا حیل و جھٹ و رقم فوراً ادا کی اور اپنی تصویروں کا سیٹ جھٹ سے اپنی جیب میں چھپا لیا۔ تینوں درویش شرمندہ شرمندہ واپس ہوٹل پہنچنے تو کاؤنٹر والی لڑکی نے مکراتے ہوئے پوچھا۔ بوگی شریٹ پسند آئی؟ "تینوں درویش بے یک زبان بولے۔ ہم تو روی ٹریکٹروں کی نمائش دیکھنے گئے تھے۔" اس چڑھا نے لفٹ بند ہوتے ہوئے ایک اور فقرہ کسا۔ "وہ روی ٹریکٹر پسند آئے؟ .... دیے اصل نقل کا پتہ نہیں چتا ...." تینوں درویشوں نے قسم کھا کر وعدہ کیا کہ اس رات کا ذکر کہیں نہیں ہو گا .... چنانچہ اسکا ذکر ہم نے کہیں نہیں کیا۔ البتہ قلم کی قسم نہیں کھائی تھی اور نہ لکھنے کا وعدہ بھی نہیں کیا تھا .... دیے اب تھا ہے کہ بوگی شریٹ کی وہ رونقیں بھی ختم ہو گئی ہیں اور بوگی شریٹ کے فتنے بھی وہاں سے غائب ہو گئے ہیں۔

درویش اول نے نمار منہ مسجد سلطان کے علاقے کی سیر کا اعلان کیا۔ شاید اس لئے کہ وہ اپنے گناہ اور ثواب کا پلنس درست رکھنا چاہتا تھا۔ چونکہ ہم لوگ بھی اسکی تمام وارادتوں کے ساتھی تھے اس لئے وہاں جانے پر بھلا ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ چنانچہ سنگاپور کا نقشہ پھیلایا۔ راستہ تھیں کیا اور روانگی ڈال دی۔ پیاز نما گہنبوں والی یہ مسجد سنگاپور کی سب سے بڑی مسجد ہے۔ سنگاپور کے تین چار لاکھ مسلمان اسی مسجد کے گرد و نواح میں صدیوں سے قیام پذیر ہیں۔ پرانے زمانے میں عرب تاجر اس علاقے میں آکر آباد ہوئے تھے۔ پھر سلطان نش نے اپنا قلعہ بھی اسی علاقے میں بنایا جس کا سلطان گیٹ کے علاوہ کچھ نشان باقی نہیں۔ وہاں قدم عرب تاجروں کی جو نشانیاں باقی ہیں وہ اس علاقے میں پھیلے ہوئے بازار ہیں جن میں سب

پت سر سے بے خبر، جوان اپنے قہقہوں میں ڈیکیاں لگا رہا تھا۔ میں نے گرگٹ رنگ درویش دوم کی وجہ خون آلود سر کی طرف دلائی تو اس نے قہقہے لگاتے ہوئے کہا۔ "اڑے طوٹا چشم .... ذرا چشمہ لگا کے دیکھو ...." خیر ہم نے بغير جسم کے ہی دیکھا اور بڑے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا ہے کہ خون سمجھے تھے وہ جوان لبوں کی سرفی تھی جو شدت جذبات میں لڑکیوں نے درویش اول کے گلوب پر مختلف" میک اپ" کپنیوں کی لپ سکوں کے اشتخار سجادیے تھے۔

کپیپڑ دماغ درویش دوم سب سے بازی لے گیا۔ مشرق بعید میں مردوں کے جسم پر بال نہیں ہوتے۔ گویہ بات وہاں مقیم سکھوں پر صادق نہیں آتی اور درویش دوم کے سامنے بھالو بھی کلین شیوڑہ ہی لگتا ہے۔ چنانچہ بالوں والا مر وہاں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ لہذا درجنوں قدر دنوں نے بالوں کے اس بادشاہ کو گھیرا ہوا تھا۔ رات کا طسم اپنے عروج پر تھا۔ سنگاپور کی بوگی شریٹ نے بنکاک کی پیٹ پیانگ روڈ کو بہت پیچھے چھوڑ دیا تھا .... مگر نہیں .... دنوں میں فرق ہے۔ گو فرق، بہت باریک ہے اور وہ باریکی تصویروں نے ظاہر کر دی۔ فوٹو گرافرنے تصویروں کا ایک ایک سیٹ تینوں درویشوں کے حوالے کر دیا۔ ان تصویروں میں درویشوں کا لمحہ لمحہ مقید تھا۔ وہ تصویریں بوگی شریٹ کی اس طسمی رات کا ثبوت بھی تھیں اور یادیں بھی۔ بلیک میل کے لئے بھی استعمال ہو سکتی تھیں اور شوہزادی کے لئے بھی۔ دراصل بوگی شریٹ ایک قسم کا سچیج ہے۔ جو ناواقفوں اور واقفوں دنوں کے لئے دلچسپی اور شغل میا کرتا ہے۔ وہاں پھر نے والی غنچے دہن، گلبدن درحقیقت لڑکیاں نہیں نیوٹر مغلوق ہوتے ہیں۔ جو اس خوش اسلوبی سے میک اپ کرتے ہیں اور چال ڈھال اور ناز و ادا دکھاتے ہیں کہ کسی قسم کے شک کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ وہ شعلہ بدن، کافر ادا فتنے تصویروں میں تو اور بھی نکھر آتے ہیں۔ یہی تصویریں بعد میں گپ باز سیاح عشق کے میدان میں معز کے مارنے کے لئے ثبوت کے طور پر دکھاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ "اںہے میری گرل فرینڈ ہے۔ ایزیر ہو سش ہے۔ بس، جماز میں مل گئی .... پھر کیا تھا ... بھند ہو گئی کہ

سے مشور عرب شریٹ ہے۔ جہاں جائے نماز، تسبیح، تعویذ، اگر تیان، عطیرات، ریشمی کپڑے، باتیک اور دوسرا رنگ برلنگی چیزیں جو قدمی بازاروں کی جان ہوتی ہیں چھوٹی بڑی دو کاؤنٹ میں بھری رکھی ہیں۔ عرب شریٹ کے اردو گرد دوسرے الف لیلی بazaar بھی ہیں جن میں بغداد بazaar، مسقط بazaar اور قندھار بazaar خاص طور پر سیاحوں کے لئے کشش رکھتے ہیں۔ مگر ان سب بازاروں سے اہم بازار وہاں کا چور بازار ہے جہاں سے ہر "گواچی" ہوئی چیزیں جاتی ہے۔ مرت نذر یوں گلی کوچوں میں اور ٹیلیوں پر ڈھنڈ را پینچے کے بجائے اگر سنگاپور کے چور بازار چلی جائے تو یقیناً اس کا "گواچا" ہوا "لوگ" مل جائے گا۔ اکثر لوگ تو اس بازار میں کھوئی ہوئی چیزیں پالیتے ہیں۔ مگر درویش اول وہاں اپنا دل کھو آیا۔ ایک پھول بیچنے والی بیباک گلبدن نے پھولوں کا ایک گلدستہ درویش اول کو پیش کیا تو وہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتے رہا، پبلو بدلتے رہا، اور ارادہ بدلتے رہا۔ مگر کمپیوٹر دماغ درویش دوم نے جلدی سے لڑکی کو کچھ پیسے دیئے اور وہاں سے چلتا کیا۔ وہ سیاحوں کے جھرمنٹ میں کھو گئی۔ مگر درویش اول پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ اسکی وہ جالانی کھلونے سی چست رفتاری اس طرح ست ہو گئی گویا کھلونے کے بیٹھی سیل ختم ہو گئے ہوں۔

انجانے دیں میں بیانی کی جانی پہچانی ملک نے میری بھوک میں اضافہ اور درویش اول کی رفتار میں چستی پیدا کر دی۔ زرودے کے زعفرانی چاول، کڑاہی میں مچھتے کباب اور شوربے میں تیرتی چانپیں بھوکے درویشوں کو رسوا کرنے کے لئے کافی تھیں۔ بھینی بھینی خوشبو والے کھانوں پر کھیاں تھی پروازیں کر کے بھن بھنا رہی تھیں۔ خوراک کی حدود میں لکھیوں کی اس آزادانہ نقل و حرکت پر مجھے رشک آرہا تھا۔ گو سنگاپور دنیا کے صاف ترین شہروں میں سے ہے مگر یہ علاقہ تو مسلمانوں کا تھا۔ اور ایمان کی صفائی والے گردونواح کی صفائی کا ذرا کم ہی خیال رکھتے ہیں۔ بسم اللہ ہوئی کی گرد آلوہ کرسیوں پر ہم بسم اللہ کر کے بیٹھے گئے۔ غایظ دھوتی والے بیرے نے بدیوار جھاڑن ہوا میں لمائی تو بوسیدہ میز پر آرام کرتی غلاعت کی شزادیوں میں ہاچل

سی بھی گئی۔ اس نے نہم اردو میں موٹے خانامان کو کچھ کہا۔ موٹے خانامان نے پتیلوں میں کڑچا گھملایا اور تھوڑی ہی دیر میں شوربے میں ڈوبتی تھریتی بوٹیاں ہمارے سامنے تھیں۔ ہماری انگلیوں نے شوربے کے اس گمرے سمندر میں بوٹیوں کی حلاش میں غوطہ ذہنی شروع کر دی۔ ان چھوٹے چھوٹے ہوتلوں پر گاکوں کی زیادہ تر تعداد کنکھے سیاحوں، سائیکل رکشہ والوں اور چھیروں کی ہوتی ہے۔ ہمارے اردو گرد مختلف شکلوں اور نسلوں کے لوگ پاکستانی کھانے کو انہیں فوذ سمجھ کر کھا رہے تھے۔ یہاں کو کولا کی بجائے لسی ملتی ہے۔ فرش پر چاروں طرف ہڈیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ پہلا موقع تھا جہاں کتے اور بلیاں بڑے عدل و انصاف کے ساتھ ہڈیوں کا بُوارا کرتے دکھائی دیئے۔ کھانے کے ساتھ پانی پیا تو معلوم ہوا اس میں اورک کا رس شامل ہے۔ اپنے پوتی صورت بیرے سے اس ڈیٹول ڈائیٹ پانی کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ اگر پانی میں اورک کا رس نہ ڈالیں تو پانی کی تاثیر سے جسم میں درد شروع ہو جاتا ہے۔ کھانا ختم بھی نہیں کیا تھا کہ درویش اول نے درد سرکی شکایت شروع کر دی۔ "یار میرا خیال ہے کہ جو پانی میں نے پیا تھا اس میں اورک کا رس نہیں تھا۔ شاید اسی لئے میرے سر میں شدید درد شروع ہو گیا ہے۔" - درویش دوم فوراً بولا۔ "ویسے عام لوگوں کو تو یہاں کے پانی کی تاثیر سے جسم میں درد ہوتا ہے سر میں نہیں۔ مگر چونکہ تمہارے جسم اور سر میں کوئی خاص فرق نہیں ہے اس لئے یقیناً پانی کا اثر تمہارے جسم کے بجائے سر پر ہی ہوا ہو گا.... ویسے بھی تو پانی خالی جگہ کی طرف ہی بڑھتا ہے نا....." درویش اول کو اس طرح کی گستاخ باتیں سخت ناپسند تھیں اور خاص طور پر ہر وہ بات تو اسکو گولی کی طرح لگتی تھی جو اسکے سر اور بالوں کے بارے میں کسی جائے۔ چنانچہ اس نے اورک کے پانی والے دو گلاس چڑھائے۔ غصہ ٹھنڈا کیا اور چائیسا ناڈن جانے کا اعلان کر دیا۔

چست الوجود درویش اول اور ست الوجود درویش دوم کی چال اور چلن دونوں میں بیادی فرق تھا۔ چنانچہ طریقہ سفر پر تو دونوں میں اکثر تکرار ہوتی رہتی تھی۔

نے بے دل سے پوچھا۔ درویش اول نے اسی تلقینیانہ انداز میں کہا۔ ”بھئی دیکھو ان لوگوں نے اک چھوٹی سے روزایت پر شیر اور مچھلی کو شر کا علامتی نشان بنا لیا ہے۔۔۔ مگر ہم لوگ ۔۔۔ چھوڑو یار ہم لوگ بیکار قوم ہیں ۔۔۔“ پھر اس نے اپنا بڑا سارنگی میں ہلاتے ہوئے درویش دوم کی طرف دیکھا اور دیکھتے دیکھتے کہا۔ ”اب یار تمی کو دیکھو ۔۔۔ کس قوم کے پاس انسان نما بھالو یا بھالو نما انسان ہو گا ۔۔۔ مگر نہ ہم نے تمہارا مجسمہ بنایا اور نہ بھالوؤں نے ۔۔۔“ درویش دوم کا چڑھتہ دربن گیا، مگر اس کے پاس خاموش رہنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔

چانسنا ناؤن پنچھے سے پلے فلپ سٹریٹ پر ”واک ہائی چنگ یو“ کا چینی مندر آیا۔ یہ سنگاپور کا سب سے قدیم چینی مندر ہے۔ جسے سمندروں کے دیوتا کے نام منسوب کیا گیا ہے۔ بحری دیوتا کے اس نیول ہیڈ کوارٹر میں سمندری سفر بر جانے والے اپنی حفاظت کی منتیں مان کر جاتے تھے اور آنے والے چڑھاوے چڑھاتے تھے۔ دراصل جنوبی ایشیا اور ایشیا میں چینی تاجریوں کی یांخار کوئی نصف صدی اور صدی کے دورانیئے میں ہوئی۔ یہ لوگ جہاں جان گئے اور جس حان میں گئے، بڑی محنت سے کام کیا اور تجارت پر چھاگئے۔ کوئی بیس بچھیں برس پلے پاکستان میں چینیوں نے جو تے بنانے کا کاروبار شروع کیا تھا۔ اب چینی مopic تو ڈھونڈئے سے بھی نہیں ملتا۔ البتہ چینی ریستورانوں کی بھرمار ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ میں برس بعد کسی اور بنس پر ان کا بقشہ ہو اور چینی ریستوران شیرا پسلوان چلا رہا ہو۔ ہمارے ایک چینی دوست مسٹر ہاڈ کا گبرگ میں بست بڑا ریستوران تھا۔ وہ خود تو بڑا پینڈو قسم کا چینی تھا مگر اس کے ریستوران میں جانا لاہور میں فیشن سا بن گیا تھا۔ ویسے بھی زندہ دلان لاہور خوش خوراکی کے علاوہ کم ہی چیزوں کی طرف دھیان دیتے ہیں۔ مسٹر ہاڈ کے ایک ہی شکل کے پلے پلے کوئی آدمی درجن بیٹھے تھے جو آہستہ آہستہ لاہور سے غائب ہونے شروع ہوئے، مگر کسی کو کانوں کاں خبر نہ ہوئی۔ خبر ہوئی تو اس دن جس دن مسٹر ہاڈ نے اپنا ریستوران بیچ دیا اور امریکہ جانے کے لیے رخت سفر باندھ لیا۔ مسٹر ہاڈ سے اچانک

مثلاً“ درویش اول سیر پاٹے کے لئے بھیکی وغیرہ میں گھومنے کے بجائے بایارہ چلنے کو ترجیح دیتا تھا جبکہ درویش دوم پیدل چلنے کے قطعاً“ خلاف تھا۔ مگر دونوں اپنی اپنی کمزوریوں کو چھانے کے لئے بڑے ٹھوس دلائل پیش کرتے رہتے۔ درویش اول کا کہنا تھا کہ پیدل چلنے سے سیر بھی تسلی سے ہو جاتی ہے اور پسیے بھی بیچ جاتے ہیں۔ درویش دوم کے مطابق پیدل سیر میں زیادہ خرچ ہوتا ہے۔ کیونکہ جتنا زیادہ پیدل چلنی گے اتنی ہی زیادہ بھوک لگے گی اور جتنی زیادہ بھوک لگے گی اتنی ہی زیادہ خوراک ۔۔۔ اور خوراک پر خرچ ہو گا۔ چانسنا ناؤن جانے کے لئے ہم نے درویش اول کی رائے سے اتفاق کیا اور پیدل مارچ شروع کی۔

نارتح برج روڈ پر چلتے چلتے ہم دریائے سنگاپور کے کنارے پنچھے۔ دریا شر کے سینے کو چیرتا مل کھاتا سمندر تک پنچ جاتا ہے۔ اسی دریا کے ذریعے بڑے جہازوں سے اترًا ہوا سامان چھوٹی کشتیوں میں لاد کر شر کے اندر مارکیٹ تک لایا جاتا ہے۔ دریا کے دونوں جانب گودام بنے ہیں جہاں دوسرے ملکوں سے لائی ہوئی اشیا رکھی جاتی ہیں۔ ان چھوٹی بڑی مال برادر کشتیوں کے ساتھ ساتھ کشم والوں کی لانچیں بھی گشت کرتی رہتی ہیں تاکہ سمنکلوں کو قابو میں کیا جاسکے۔

جہاں دریا اور سمندر کا ملап ہوتا ہے وہاں سنگاپور کا سیمبل مریلوں کا مجسمہ نصب ہے۔ اس مجسمے کا سر شیر کا ہے اور جسم مچھلی کا۔ روایت کے مطابق شیراہ نیلا اتنا نے اسی مقام پر شیر دیکھا تھا۔ جس کی نسبت سے مچھیوں کی اس ساحلی بستی کا نام سنگاپور یعنی شیر کا شیر رکھا گیا تھا۔ چنانچہ شیر کا سر اور مچھلی کا دھڑ سنگاپور شر کا علامتی نشان بن گیا ہے۔ ویسے یہ سنگا اور سکھا ایک ہی چیز ہیں۔ دونوں کا مطلب شیر ہے۔ سرداروں نے شیر کو سکھ بنانے کی خاطریا شاید سکھوں کو شیر بنانے کی خاطر سکھا کو سنگھ بنا کر اپنے نام کے ساتھ نصی کر لیا اور اب دنیا کا ہر سروار شیر بلکہ جیئنے کے لحاظ سے بہر شیر نظر آتا ہے۔ درویش اول نے مجسمے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ویکھو یار یہ لوگ چھوٹی چھوٹی چیزوں کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔“ ”وہ کیسے؟“ تھکے ہارے درویش دوم

اشارے کر کے سرگوشیوں میں تھرے کرنے لگے۔ حق تو یہ ہے کہ ان شیشیوں میں ہر مرض کا علاج بند تھا۔ اور بھلا وہ کون سی بیماری تھی جو ان دونوں کو نہ ہو۔ مثلاً مردانہ کمزوری کا پوشیدہ علاج وہاں کٹلے بندوں کیا جاتا ہے۔ مگر اس دوا کی طرف میرنی موجودگی میں دونوں نے آنکھ اٹھا کرنے دیکھا۔ جن سک بھی سلامتی کی طرح بد نام دوا ہے۔ چینی شہنشاہوں کے دور میں یہ دوا طویل عمر اور جنسی قوت کے لئے استعمال کی جاتی تھی۔ اس دوا کی حقیقت بھی کچھ ولی ہے جیسے حکیموں کے کتنے۔ مگر جس کام کے لئے یہ استعمال کی جاتی ہے اس سے کمیزیاہہ ہاضمی کے لئے مفید ہے۔ چنگ چو یو، جڑی بوٹیوں کا تیل، جسمانی درد کے لئے مفید ہے۔ جملی ایک ایک شیشی دونوں درویشوں نے خریدی۔ درویش دوم نے مجھے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ ”یو تو فو! یہ بڑی کار آمد دوا ہے تم بھی ایک شیشی خرید لو۔“ میں نے کہا ”عفوند! تم خرید لو اگر ضرورت پڑی تو میں تمہاری دوا استعمال کروں گا۔“ اسی طرح مگر مجھ کا گوشت دمہ کی بیماری کے لئے، ویل مچھلی کا سوپ پلٹ پریشر کے لئے، کچھوے کا سوپ کمر کے درد کے لئے اور مویتیوں کا پاؤڈر کالوں کو گورا اور گوروں کو، چنور گا، یعنی چاند جیسا بانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اگرچہ درویش دوم کو اس پاؤڈر کی چند اس ضرورت نہ تھی مگر دوسرا دوا کے ساتھ ساتھ ایک پڑیا تو اس پاؤڈر کی بھی خرید ہی لی۔ مگر دونوں درویشوں کی اصل بیماری بال تھے۔ کیونکہ ایک ’فارغ البال‘ تھا اور دوسرا بالوں کے بال سے بے حال تھا۔ چنانچہ دونوں نے چینی بابا سے اپنے اپنے امراض کی دوا لی۔ چینی بابا نے درویش اول کو اک تیل کی شیشی اور درویش دوم کو پاؤڈر کی پڑیا تھا مادی۔ خدا بخوبہ کس سمندری جانور کا تیل اور کس جنگلی جڑی بولی کا پاؤڈر تھا۔ کیونکہ چینی حکیموں سے نہ مگرچھ حفظ ہیں اور نہ مینڈک۔ دونوں درویشوں نے رنگ برلنگی شیشیاں اور ون پونی پڑیاں سمیئیں اور خوشی خوشی میرے ساتھ چل دیئے۔ ان دونوں پر دوائیں خریدتے ہی اتنا خوشگوار اثر ہوا کہ درویش دوم جو اپنے بالوں کو چھپانے کے لئے گردن تک بٹن بند رکھتا تھا گری کا بہانہ بنا کر چھاتی تک قیص کے بٹن کھول

روائی کی وجہ پر چھی تو اکشاف ہوا کہ اسکے ان ”وہک کوڑے“ نما بیٹوں نے لیزا سے لیکر میکسیکو تک چینی رستو رانوں کا جال کچھا دیا تھا اور مسٹر ہاؤ اپنے بیٹوں کے پاس بقیہ زندگی گزارنے جا رہا تھا۔ دنیا کے بھی ملکوں اور شرکوں میں مسٹر ہاؤ موجود ہیں جنہوں نے چینی کھانوں کو اثر نیشل کھانا بنا دیا ہے۔

ہاں تو یہاں ذکر سنگاپور کے چانٹا ناؤن کا ہو رہا تھا، جسکے بھول بھیاں والے بازاروں میں چھوٹی چھوٹی دکانیں رنگ برلنگی چیزوں سے کھچا کچھ بھری ہوئی تھیں۔ ان دکانوں میں درویش دوم کا داخلہ منوع تھا۔ گواں مماثلت پر کوئی سرکاری پابندی نہیں تھی بلکہ ان کی اپنی جسامت تھی۔ کیونکہ انہوں نے ایک دکان میں ”داخلہ ڈالا“ تو کئی ایک کانڈ کی لائینس، بلو روی کاچ کے موم ہتی شینڈ، خوشبووار جڑی بوٹیوں کے جار، چینی کے واڑ اور پھول دان تھس نس ہو گئے۔ صرف یہی نہیں بلکہ چھٹ سے جھولتے پنجھوں میں بند چھوٹے چھوٹے رنگ برلنگ پرندوں نے پھر پھردا کر اپنے آپکو زخمی کر لیا۔ گلدارن پر رنگ سجائے ایک چینی بزرگ نے گھبرا کر اپنی عینک کے دیزی شیشوں سے اوپر دیکھا اور خدا بخرا پنی آنکھوں کی ان تر تھیں کیروں میں سے کیا دیکھا کہ ان کے ہاتھ سے برش چھوٹ گیا۔ درویش دوم اپنی جسامت سیٹ کر اس پھرتی سے اس دکان سے نکلا کہ اس کی چال پر درویش اول کی چال کا گمان ہونے لگا۔ چانٹا ناؤن درویش دوم کو راس نہ آیا اور شاپنگ کا وہ شید ایسی بد دلی سے بازار میں گھونٹنے لگا۔ البتہ درویش اول کے مطلب کی ہر شے وہاں موجود تھی۔ چنانچہ وہ ہر دکان کے سامنے پڑا۔ ڈال رہتا۔

اک چینی دواغانے کے سامنے تو درویش اول مجھتے کی طرح نصب ہو گیا۔ ہر اک دوا کی شیشی کو ایسی حرست بھری نگاہ سے دیکھ رہا تھا گویا اسکا بس چلے تو بھی دوائیں کو ایک ہی جھنکے میں نگل جائے، تاکہ ہر قسم کی ذہنی اور جسمانی بیماریوں سے ہیشہ ہیشہ کے لئے چھکارا پالے۔ درویش دوم جو کچھ دیر پہلے بیزاری کا اشتمار بنا پھرتا تھا چینی دوائیں میں بھرپور دلچسپی لینے لگا۔ اور اب یہ دونوں ایک ایک شیشی کی طرف

کا صدر چنا گیا تھا۔ اس طرح مہبوب کی فلاح و بہبود اور باہمی اتفاق کے لئے یہ آر گناہزیش بڑا مفید کام سرانجام دے رہی ہے۔ سری مریامان مندر میں سلیم سے ملاقات ہو گئی۔

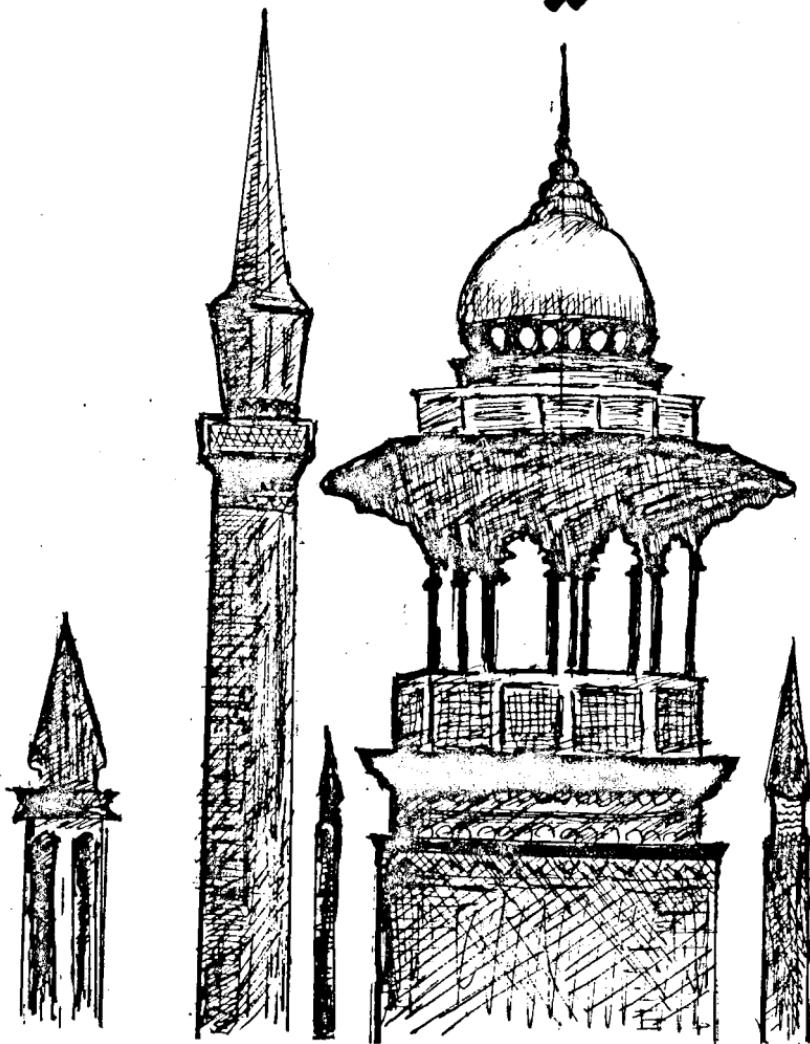
سلیم لاہور کا رہنے والا تھا۔ میری اور اس کی دوستی خاصی پرانی تھی۔ ان دونوں وہ سنگاپور میں قالینوں کا کاروبار کرتا تھا۔ قالینوں کا کاروبار اس نے سنگاپور تک ہی بھجو نہیں رکھا تھا بلکہ کوالا لمپور میں بھی اس کی وکان تھی۔ غیر ملکی سیاحوں میں قالینوں کی بڑی مانگ تھی۔ وہ پاکستان سے قالین منگا کر ایرانی قالینوں کا نام دیکر پیٹتا تھا۔ اسے دوسری صبح کوالا لمپور جانا تھا۔ چنانچہ ہم سب نے جہاز سے جانے کی بجائے سلیم کے ساتھ کار میں سفر کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ سنگاپور اور ملیشیا کے میدانی علاقوں کی سیر ہو جائے۔



لے۔ اوہ درویش اول یوں بار بار گردن جھکتا گویا اپنی خمار زلفوں کو چرے سے ہٹا رہا ہو۔ ابھی ہم لوگ دو اخانے سے چند ہی قدم آگے گئے ہوئے کہ درویش اول غائب ہو گیا۔ میں نے پریشان ہو کر درویش دوم کو پہایا تو اس نے تلی دیکر کہا۔ ”مگر کی کوئی بات نہیں ابھی آجائے گا۔“ گو عام حالات میں کسی درویش کا غائب ہونا فکر کی بات تھی۔ مگر درویش دوم کی بے فکری نے مجھے شک میں ڈال دیا۔ جب درویش اول لوٹا تو اسکی تیص کی باریک جیب میں چھپی جن سگ کی دوشیزیاں دونوں درویشوں کی سازش کی نقاب کشائی کر رہی تھیں۔

سنگاپور کی رنگ برنگ روشنیاں رات کے سیاہ دامن میں موتویوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ تینوں درویش سفر کے منصوبے بناتے سری مریامان مندر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ رحیم کے درپر جانے والے درویش رام دوارے پہنچ تو وہاں بہت بڑا جھوم تھا۔ مندر کے بڑے دروازے کے ساتھ ہی آگ کا الاؤ لگا ہوا تھا۔ نیک، چیر، دیار اور صندل کی لکڑیوں پر شعلے لپک رہے تھے۔ اتنے میں چند پچاری آئے۔ انہوں نے سرخ رنگ کی دھوتیاں پہن رکھی تھیں اور گلے سے نگے تھے۔ ایک پچاری نے جلتی آگ میں کچھ چھڑکا۔ جس سے شعلے اور تیز ہو گئے۔ پھر اس نے دوسرے پچاری کے جسم میں سلاخیں گھونپنی شروع کر دیں۔ اس عبادت کو دیکھ کر ہم خاصے خوفزدہ ہوئے۔ یہی سلاخیں اس کی زبان سے بھی گزاری گئیں مگر نہ تو اس کے جسم سے خون پکا اور نہ ہی زبان سے چیخ نکلی۔ جب شعلوں نے انگاروں کا روپ دھارا تو ان پچاریوں نے دیکھتے ہوئے انگاروں پر چلانا شروع کر دیا۔ پورے جھوم پر خاموشی طاری تھی۔ سیاحوں کے کیمروں کی فلیش گئیں بجلی کی طرح کوند رہی تھیں۔ سنگاپور کے بارے میں یہ بات قابل تعریف ہے کہ وہاں مذہبی رسومات پر اختلافات اور جنگوں نہیں ہوتے۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی اور بدھ مذہب کے لوگ سب مل جل کر رہتے ہیں۔ ۱۹۳۹ء میں ”انٹر ٹائمیس آر گناہزیش“ کی بنیاد رکھی گئی۔ اس آر گناہزیش کا صدر ہر سال بدلتا ہے۔ ۱۹۴۶ء میں اس کا صدر مسلمان تھا۔ ۱۹۷۰ء میں ایک سکھ اس

بلیشا



درویشوں نے سکنڈ ہوٹل کو الوداع کہا۔ سلیم کی گاڑی میں سامان لادا اور ملیشیا کی جانب کوچ کیا۔ سورج نئی نویلی دہن کی طرح بدیلوں میں چڑھائے ہوئے تھا۔ سرکوں پر ٹریک روائی دواں تھی۔ سنگاپور سے باہر نکلے تو گھنے جنگلوں کا سلسہ شروع ہو گیا۔ جہاں تک نظر جاتی تھی ناریل کے پیڑی ہی پیڑ دکھائی دیتے تھے۔ آدمی گھنے بعد ہم سنگاپور کی حدود کو پار کر رہے تھے۔ جزیرے کو ملیشیا کے ساتھ ملانے کے لئے ایک کازوے Cause way بنایا گیا ہے۔ جمال سے بڑک اور ریلوے لائن پہلو بہ پہلو گزرتی ہیں۔ کشم پوسٹ پر پہنچے تو درویش دوم کی شاپنگ ہمارے لئے عذاب بن گئی۔ درویش دوم نے اپنے بکبوں میں اتنا سامان ٹھونسا ہوا تھا کہ کشم والوں نے روک لیا اور کما کہ اس سامان پر ڈیوبنی ادا کرو۔ ہم نے سلیم کی مدد سے احتجاج کیا کہ ہم تو صرف سیاحت کے لئے جا رہے ہیں۔ تجارت کے لئے نہیں۔ چند دنوں کے بعد ہم جگارتا چلے جائیں گے۔ مگر ہماری صفائی اور وکالت کا ان پر کچھ اثر نہ ہوا۔ پھر درویش اول نے کشم والوں کو چایا کہ وہ ملیشیا کے شزادوں کا صہمان ہے اور ثبوت کے طور پر اتحاد کالج کی ایک تصویر دکھائی جس میں شزادہ عمر ننکو اور شزادہ سلیمان ننکو درویش اول کے ساتھ کھڑے تھے اس تصویر کا کشم والوں پر کچھ اثر ہوا اور انہوں نے ہم سے کچھ رقم دہا جمع کروائی۔ ساتھ ہی ایک رسید دی جس کے ذریعے ملک چھوڑتے وقت ہم ایزبورٹ سے اپنی جمع کی ہوئی رقم واپس لے سکتے تھے۔ جس

بھک جانا اور راستے سے بھک جانا کوئی عجوب بات نہیں۔ میشیا کے سفر میں درویشوں کے اس نفحے سے کاروائی کا راہبر سلیم تھا۔ اور جانب سلیم کی ناک کا زاویہ نوے کی بجائے ۱۲۰ ڈگری پر تھا۔ کیونکہ موصوف نے جوش جوانی میں انارکلی میں شاپنگ کرتی کسی الحرمیار کو چھیڑ دیا تھا۔ بی بی نے جوش مروت میں شاپنگ بیگ گھمایا جو سیدھا سلیم کی ناک پر لگا اور سیدھی ناک سیدھی نہ رہ سکی۔ چنانچہ جب وہ آسردیلین طوطے کی چونچ نما ناک کی سیدھے میں چلتا تو دائیں ہاتھ کی جانب جھکاؤ اس کے لئے قدرتی امر تھا۔ پیدل چلتے ہوئے سڑک کے دائیں ہاتھ ہو جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ مگر جہاں ٹرینک بائیں ہاتھ ہو وہاں گاڑی سڑک کے دائیں ہاتھ چلانا موت سے بے ٹکف ہونے والی بات تھی۔ اور موت سے بے ٹکف ہونے کافی الحال ہمارا کوئی مودعہ نہ تھا۔ اس سفر میں سلیم کی ناک نے ہمارا ناک میں دم کر دیا تھا۔ دراصل اس کی ناک سے تین جانیں وابستہ تھیں۔ مگر صورت میں ٹیزی کے بجائے اگر اس کی ناک سرے سے نہ ہوتی تو ہماری صحت پر کیا اثر پڑتا۔ لہذا درویش اول نے ‘کو پالکٹ’ کے فرائض انجام دیئے اور حضرت سلیم کو بار بار سڑک کے بائیں جانب گاڑی چلانے کی یاد دہانی کرتا رہا۔

درویش دوم راستے کے خطروں سے بے نیاز اردو گرد پھیلے ہوئے ناریل، پیچتے اور انساں کے باغات میں کھویا ہوا تھا۔ درویش دوم کی جسمت تو ایسی تھی کہ وہ خوراک کے معاملے میں خود کفیل تھا۔ مگر آج میرے بجائے اسے بھوک ستاری تھی۔ چند میل سفر کے بعد گاڑی رکوتا اور پھل خریدنے شروع کر دیتا۔ پھل خریدتے وقت وہ پھلوں سے زیادہ پھل پیچنے والیوں کی صورت اور خدوخال کا خاصہ خیال رکھتا۔ جبکہ کوئی پھل والی چھری جلا رہی ہوتی تو درویش دوم اس انداز سے اسے دیکھتا گویا چھری انساں پر نہیں درویش دوم پر چل رہی ہو۔

کوالا لپور کی مسجدوں کے سرینک میثاروں اور گنبدوں نے دور سے استقبال کیا۔ شر میں پیچنے تو ٹرینک سے بھری کشادہ سڑکیں اور آسمان کو چھوٹی

دوران کشم والوں سے یہ جھگڑا جل رہا تھا درویش دوم اس بے نیازی سے ایک جانب کھڑا تھا گویا اس جھگڑے سے اس کا کوئی سروکار ہی نہ ہو۔ کشم والوں سے جان خلاصی ہوئی تو گردو نواح کے نظاروں کی طرف متوجہ ہوئے۔ سب سے پہلے ناریل کا جوس پینے کی سوجھی۔ ناریل پینے والے نے سڑک کے کنارے ڈھیر لگا رکھا تھا۔ اسے چار ناریل دینے کو کہا۔ اس نے جلا دوں والا بڑا سا چھرا ہوا میں لرمایا۔ ناریل کا اپر والا حصہ کٹ کر علیحدہ ہو گیا۔ تو ناریل اور سڑا ہمارے حوالے کیا۔ ہم اسی طرح ناریل کا جوس پینے لگے جیسے کوکا کولا پی رہے ہوں۔ ٹھنڈا مٹھا جوس پینے کے بعد کشم والوں کی تلفی ختم ہو گئی۔

جوہور بورو Johore Bahru میشیا کے جزوی صوبے کا دارالحکومت ہے۔ شر بزرے کے سمندر میں گمرا ہوا ہے۔ سڑک کے دونوں جانب بڑے جنگلات اور انساں کے باغات پھیلے ہوئے ہیں۔ ایک لمحے کے لئے سڑک پر گاڑی روکیں تو درجنوں لڑکیاں انساں لئے آپ پر چھپت پڑیں گی۔ انساں کو چھیلنے کی بجائے اپر سے کٹ دیا جاتا ہے، پھر تیز دھار والے چاقو سے گودے کے نکڑے کر دیئے جاتے ہیں۔ ہر انساں کے ساتھ گودا کھانے کے لئے کسی درخت کا لمبا سا کانٹا بھی ملتا ہے ہم نے چار انساں خریدے اور چلدیئے۔ چونکہ سلیم گاڑی چلا رہا تھا اس لئے اس کے حصے کا انساں بھی درویش دوم ہی چٹ کر گیا۔

جوہور بورو سنگاپور سے صرف سولہ میل کے فاصلے پر ہے، مگر وہاں تک پہنچنے میں ہمیں کئی گھنٹے لگے۔ کیونکہ کشم والوں نے ہمارا حشر کر دیا تھا۔ جوہور بورو میں سلطان کا محل دیکھا جو مورش طرز تعمیر کا نادر نمونہ ہے۔ یہاں کی مسجد سیاحوں کے لئے اپنے اوپنے میثاروں کے سبب بڑی کشش رکھتی ہے۔ یہاں ایک چڑیا گھر بھی ہے جسے دیکھنے کے لئے درویش اول بندھ دیا۔ مگر درویش دوم کے پوشیدہ خطرات کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم نے چڑیا گھر کا پردگرام منسوخ کیا اور کوالا لپور کی طرف رواںگی اختیار کی۔ جس کاروائی کا راہبر صراطِ مستقیم پر نہ چل سکتا ہو اس کاروائی کا منزل سے

کے رشتہ داروں کو کمبل ہو جاتے ہیں۔ اور وہ مجبور میزبان اپنے ملک میں بدنامی کے خوف سے خدا بخربختی تکلیفوں کے باوجود اس مذہبی دل کی خدمت کرتے ہیں۔ چونکہ بنیادی طور پر ہم ایک ناٹکر گزار قوم ہیں۔ اسی لئے کسی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ہماری زبانیں پتھر ہو جاتی ہیں۔ پاکستان میں گرمی کی چھٹیاں غیر ملکوں میں مقیم پاکستانیوں کے لئے بڑی بھاری ثابت ہوتی ہیں۔

درویش اول کارگزاری کا بادشاہ تھا۔ ہوش گرینڈ ہسپیس فیک میں قدم رکھتے ہی اس نے با آواز بلند ہوش کے مینجنر سے ملاقات کا مطالبہ کیا۔ ہوٹلوں اور ریستورانوں کے ملازمین لاڈو پسیکر نما گاہکوں سے اکثر گھبرا جاتے ہیں۔ چنانچہ ان کا مطالبہ فوراً پورا کر دیا گیا اور ملاقات کے لیے مینجنر کے دفتر تک پہنچانے کے لیے اک 'چھمک چھوٹ'، ان کے ہمراہ ہو گئی۔ ایسی چٹ پٹی را ہبر کو دیکھ کر ڈپنی میر کاروائی یعنی درویش دوم کی راں بھی ٹکی اور وہ بھی مینجنر سے ملاقات کرنے چل دیا۔ لابی میں باقی رہ گیا میں جو کاروائی کے بکھرے سامان کا حافظہ بنا بیٹھا تھا۔

ہوش کا مینجنر کوئی تحری پیس سوت والا روایتی مینجنر نہ تھا بلکہ ایک گھریانا نما چینی لوکی تھی۔ مس نوک چینی ضرور تھی مگر نہ چینی سی تھی اور نہ چینی کی تھی۔ وہ خالص کاروباری خاتون تھی۔ شاید اسی لئے درویش دوم دوڑتا ہوا واپس لابی میں آیا اور اس کاروباری چیز میں حصہ لینے کے لئے مجھے بلا کر لے گیا۔ دراصل درویش اول نے مس نوک سے اک جھوٹی چیز کاروباری رام کمانی چھیڑ رکھی تھی اور اس کمانی کو سچا ثابت کرنے کے لئے میری چوب زبانی کی ضرورت تھی۔ اس کمانی کے مطابق ہم تینوں پی۔ آئی۔ اے کے شعبہ مارکینگ کے بہت بڑے افراد تھے۔ چج صرف اتنا تھا کہ ہم شعبہ مارکینگ کے محض افراد تھے۔ جھوٹ یہ تھا کہ بڑے افراد تھے بلکہ بہت بڑے افراد تھے جو کوالا لمپور میں ہوٹلوں کا سروے کرنے آئے تھے تاکہ پاکستانی سیاحوں کو وہاں بھیجا جاسکے۔ اس بات میں بھی پوری صداقت نہ تھی۔ کیونکہ ہم صرف اپنی سیاحت کے لئے آئے تھے کوئی سروے وغیرہ کرنے نہیں۔ اس سارے ڈرائے کا صرف ایک ہی

ہوئی جدید عمارتیں نظروں کے سامنے پھیل گئیں تینوں درویش کار کی کھڑکیوں سے گردنیں نکالے اس بے چینی سے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے جیسے زندگی میں پہلی مرتبہ انسانی آبادی میں آئے ہوں۔ ادھر جتاب سلیم اپنی ناک کی سیدھہ میں جا رہے تھے لیکن ابھی تک ان کے کارپیٹ پیلس کا دور دور تک نام و نشان نہ تھا۔ آخر ماڈنٹ بیٹھنے روڈ پر پہنچے۔ جی ہاں یہ سرڑک اسی ماڈنٹ بیٹھنے کے نام پر ہے جو ہندوستان کی تقیم کے وقت وائراء تھا۔

کوالا لمپور بھر حال کراچی نہیں تھا۔ وہاں اس کے نام پر سرڑک ہوتا ہمارے لئے تعجب کا باعث نہ بن سکی۔ مگر جس چیز سے ہمیں تعجب ہوا وہ کارپیٹ پیلس تھا۔ غسل خانہ نما اس جگہ کو پیلس کہنا کچھ ایسا ہی تھا جیسے فٹ پاٹھ پر دی بڑے بیچھے والا اپنی ریڑھی پر پول کانٹینیٹ کا چاندنی لانچ لکھ لے۔

سلیم طوطے کے کارپیٹ پیلس کو دیکھنے کے بعد اسکے گھر کی وسعتوں کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا تھا۔ پھر اس نے دبے لفظوں میں ہوش گرینڈ ہسپیس کی تعریفیں کر کے وہاں قیام کی طرف اشارہ بھی کر دیا تھا۔ مگر درویش دوم پیسے بچانے کی خاطر اسکے کسی اشارے کو خاطر میں نہیں لارہا تھا۔ چونکہ قیام اور طعام کے تماضر انتیارات ہمارے وزیر خزانہ درویش دوم کے ہاتھ میں تھے اس لئے میرے میسے بار بردار درویش کو بولنے کا حق تو ویسے ہی نہ تھا۔ البتہ درویش اول ایسے موقعوں پر اپنا فیصلہ دے سکتا تھا۔ جو اس نے دیا اور سلیم طوطے کو ہوش گرینڈ ہسپیس جانے کو کہا۔ سلیم نے پہلی مرتبہ اپنی ناک کی کیپس کا سارا لئے بغیر گاڑی چلا کی اور ایک ہی جھنکے میں ہمیں ہوش کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا۔ ست الہ جود درویش دوم اپنا وجود گاڑی سے پوری طرح نکال بھی نہ پایا تھا کہ سلیم "خدا حافظ!" کہتا ہوا گھنے ٹرلفک میں غائب ہو گیا۔ اس کا یوں غائب ہونا بھی کوئی عجیب بات نہ تھی۔ کیونکہ پاکستانی غیر ملکوں میں جاتے ہیں تو باجماعت جاتے ہیں اور من اہل و عیال جاتے ہیں اور وہاں مقیم دوستوں، رشد داروں، محلے والوں، دوستوں کے دوستوں، رشتہ داروں کے اہل محلہ اور اہل محلہ

مقصد تھا کہ کاروباری لاج میں آگر مینچر اقامت کے لئے ہمیں مفت کمرے دے دے۔ اور اس مقصد میں ہم کامیاب بھی ہو گئے۔ ہمیں اس ہوٹل کا ایک 'سوٹ'، الٹ کر دیا گیا، جس میں ایک ڈبل بیڈ روم، ایک ڈرائینگ روم، ایک چھوٹا سا باورپی خانہ اور ایک بڑا ساغل خانہ تھا۔ بیڈ روم کے بستروں پر تو درویش اول اور درویش دوم نے قبضہ جمالیا۔ البتہ ڈرائینگ روم کا صوفہ میرے حصے میں آیا اور اس پر بھی میں اس وقت تک دراز نہیں ہو سکتا تھا جب تک دونوں درویش ڈرائینگ روم میں موجود تھے۔ خیر سونے کا مسئلہ تو رات کا تھا اور ابھی شام ہی ہوئی تھی۔ چنانچہ ایونگ ان کے۔ ایں ہمیں کوالاپور میں شام گزارنے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

کہتے ہیں گنجائیا دھوئے گا اور کیا نچوڑے گا۔ گویہ مثال درویش اول پر لاگونہ تھی مگر پھر بھی وہ پانی سے پرہیز ہی کرتا تھا اور اسکی تیاری میں نسلکے کا پانی کم اور پیرس سے آیا بو تکوں میں بند خوشبودار پانی زیادہ استعمال ہوتا تھا۔ جو اس نے خوب استعمال کیا اور بن ٹھن کر ہوٹل کی لالبی میں جا پہنچا۔ درویش دوم کو تو پانی سے اتنی ہی رغبت تھی جتنی ایک مست ہاتھی کو گدے پانی سے ہوتی ہے۔ چنانچہ اسکو غسل خانے سے نکالنا آسان کام نہ تھا۔ کہیں شام ڈھلے وہ غسل خانے سے نکلا تو میں نے غسل کی تیاری شروع کی۔ پانی جیسی خدا کی نعمت کو غسل جیسی چیز پر ضائع کرنے کا میں بالکل قادر نہیں ہوں۔ بس غسل خانے میں آتا جانا ہی کافی ہے۔ اور یقین جانتے میں دونوں درویشوں سے زیادہ اجلالگ رہا تھا۔ غسل خانے کی بھاپ سے گدے آئنے میں اپنا چہرہ دیکھ کر تو مجھے یہی اندازہ ہوا۔

جب تک ہم دونوں ہوٹل کی لالبی میں پہنچے درویش اول اپنی ہواؤں میں تھا۔ چنانچہ اس نے دور ہی سے بلند آواز میں نعروہ لگایا اور ہم اسکی بھروسی اور کرخت آواز کی طرف کھنچتے چلے گئے۔ وہاں ایک سکھ ساقی شراب کے بھذرے کے بھوارے پر مامور تھا۔ سکھ شرابی تو ہوتے ہیں ساقی نہیں، اور وہ بھی چھ فٹ لمبا تر نکا ساقی۔ میں نے سردار جی سے مصافحہ کرنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو اس نے میرے ہاتھ میں "پیالہ"

تحمادیا۔ سکھوں کا پیالہ سے گمراشتہ ہے۔ چاہے پیالہ پنجاب والا ہو یا شراب والا۔ درویش دوم دوا تو ہر قسم کی پی جاتا تھا مگر داروں کی قسم کا بھی نہیں پیتا تھا۔ چنانچہ سردار جی نے اسے پیچی کے پانی اور تھیوں سے بھرا گلاس پیش کیا۔ یہ وہاں کا روح افرا جیسا من پسند مشروب ہے۔

مہنگتو شروع ہوئی تو ہمارے روئے کھڑے ہو گئے۔ روئے تو میرے کھڑے ہوئے درویش دوم کا تو روئٹوں کا ایک جگل سا کھڑا ہو گیا۔ کیونکہ جب تک ہم دونوں تیاری میں مصروف تھے۔ درویش اول نے سکھ ساقی کو یہ گولی فٹ کر دی تھی کہ ہم تینوں کرکٹ تھے اور پی۔ آئی۔ اے کی ٹیم میں کھیلتے تھے۔ ہمارے ٹیکٹے کے ایپارٹ تو ضرور دکھائی دیتے ہیں مگر کرکٹ ہرگز نہیں۔ ہاں حنیف برادران کی اور بات تھی۔ سردار جی کرکٹ کا شیدائی تھا اور ہم تینوں کا کرکٹ سے صرف اتنا ہی واسطہ تھا کہ یہ کھیل پاکستان میں کھیلا جاتا ہے اور ہم پاکستانی تھے۔ البتہ جس بات نے اس جھوٹ پر پردہ ڈالے رکھا وہ پاکستانی کرکٹ سے ہماری واقفیت تھی۔ کیونکہ سبھی نامور کھلاڑی پی۔ آئی۔ اے میں میرے ساتھ کام کرتے تھے۔ ان میں حنیف محمد، پرویز سجاد، آصف اقبال، آصف مسعود، سلیم الٹاف، شفقت رانا، طلعت علی وغیرہ جیسے لوگ شامل تھے اور ان لوگوں کی کمانیاں سنائیں کر ہم سردار جی کی تسلی بھی کرتے رہے۔ اور پیالے بھی چلتے رہے۔

رات نو بجے سردار جی کی ڈیوٹی ختم ہوئی تو وہ ساقی سے ہمارا ساتھی بن گیا۔ ساتھی بھی ایسا کہ گویا کمل ہو گیا۔ وہ بعد تھا کہ ایں میں سیروہ کرائے گا۔ کیونکہ یہ اسکی عزت کا معاملہ تھا۔ آخر ہم لوگ اسکی زبان بولتے تھے۔ اگر 'اسان' تھماری خدمت نہ کی تو پنجاب کی ناک کٹ جائے گی۔ سردار پوری ایمانداری سے یہ دعویٰ کر رہا تھا۔ کیونکہ پنجابی زبان تو اگر طوطا بھی بول دے تو سکھ اسے چُوری کھلا دیتے ہیں۔ ہم تو پھر انہیں تھے، جیسے ہی تھے۔ چنانچہ پنجاب کی ناک بچانے کی خاطر ہم سولی پر چڑھ گئے۔ کیونکہ اس حال میں سردار جی کی گاڑی میں سوار ہونا سولی پر

وجیاں اڑنے لگیں۔

دھوئی باندھے بنیان پنے قصور کا بنیا وہاں کا خانسماں تھا۔ جس نے آلو کی بھیجا، ماش کی دال اور چپاتی سے ہماری خاطر کی۔ اور ہر گرم چپاتی دینے کے بعد یہی فقرہ دہرا دیا۔ ”جناب آپ لور سے آئے ہیں آپکے لئے جان بھی حاضر ہے چپاتی کیا چیز ہے“ درویش دوم نے ’پٹیالوں‘ کی کسر چپاتیوں پر نکال دی، یہاں تک کہ قصور کے بنیئے کی لور سے محبت سرد پر گئی اور اس نے وہ فقرہ دہرانا بند کر دیا۔ کرکٹ کو دن کرتے کرتے رات ڈھل پھل تھی۔ روانگی کا اعلان ہونے سے پہلے بنیئے نے مولیٰ کے جوس کا ایک ایک گلاس سب کو دیا۔ آدمی رات کو مولیٰ کا پانی پینے کا ہمیں تو کوئی جواز نظر نہ آیا۔ مگر سردار جی نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”پوچھ جی پوچھ پینے والوں کے لئے مولیٰ کا پانی برا اکسیر ہوتا ہے۔ صبح تک ہرشے کو بھسم کر دیگا۔“ اور واقعی مولیٰ کے رس نے ہرشے کو بھسم کر دیا اور ہم سب تازہ دم ہو کر اٹھے۔

کوالا پور میں بڑی کیمنی قسم کی گرمی پڑتی ہے۔ سورج سوانیزے پر ہوتا ہے اور بادل پونیزے پر۔ بادل اور بھلی بھوکی بلیوں کی طرح متواتر لڑتے رہتے ہیں۔ بھلی کی کڑک اور بادل کی گرج سے دل دہل جاتے ہیں۔ ہوا میں نبی اس قدر ہوتی ہے کہ نہانے کی چند ان ضرورت نہیں رہتی۔ جو لباس پہنسیں تو یہ سابن کر رہ جاتا ہے۔ درویش اول نے اس گرمی کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنا ڈیرہ غازی خان کا روایتی لباس پہن لیا، خوبصورت کڑھائی والا سفید کرتا اور شلوار، پاؤں میں سلما ستارے والا چکدار کمٹتہ اور گرمی سے بچاؤ کی خاطر سر پر رومال اوڑھ لیا۔ اگر کمی تو عرونوں کے مخصوص ”فنیں بیٹ“ کی، جو اکثر عرب سر پر اوڑھے رومال کے ارد گرد کس لیتے ہیں تاکہ رومال اڑ نہ سکے۔ جونہی ہم ہوٹل کی لابی سے باہر نکلے تیکسی ڈرائیوروں نے ہمارے گرد گھیرا ڈال دیا اور ہر ڈرائیور ”یا شخ... یا شخ“ کہہ کر اپنی تیکسی کی طرف کھینچنے لگا۔

تیکسی ڈرائیوروں کی اس آؤ بھگت کا راز تب کھلا جب ہم ایک تیکسی میں سوار

چڑھنے سے کم نہ تھا۔ درویش اول نے سرحد کے درویش دوم کو سردار جی کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر دھکیل دیا۔ پھر مجھ سرائیکی پسکنگ درویش سوم کو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر اس جانب بیٹھنے کو کما جدھر سے مخالف سمت کی ٹرینک گزرتی تھی۔ اور آخر میں خود سوار ہوا۔ سردار جی سینوں کے اس بزارے سے بے خبر ”کلی، بیانے چلے جا رہے تھے۔ اور ہم لوگ ہر خطرے سے بے خراس کلب کے بارے میں خیالی قلتے ہاڑ رہے تھے جہاں سردار جی اڑاتے ہوئے ہمیں لے جا رہے تھے۔ کیسی کیسی شاہراہیں، ”چوک اور گلیاں پلک جھکتے ہی گزر گئیں اور ہمارے فلاینگ ٹائلر نے سینکور کلب کے سامنے گاڑی جا کھڑی کی۔ اس کلب میں ہر سو اندھرا ہی اندھرا دکھائی دے رہا تھا۔ نہ کلبوں کے روایتی جگ گک کرتے نیوان سائین تھے اور نہ للچانے، رال پکانے والے پوشر۔ بس لمبا اندھرا اور طویل خاموشی۔ یہ کوئی برطانوی طرز تغیری کی خوبصورت اور بڑی سی عمارت تھی؛ جس میں سردار جی کی راہنمائی میں ہم چلے جا رہے تھے۔ ایک ہاں میں داخل ہوئے تو اس کلب کا راز کھل گیا۔ یہ وہ کلب نہیں تھا جسکے لائچ میں ہم پنجاب کی ناک بچانے سردار کی گاڑی میں بیٹھے تھے۔ بلکہ یہ وہ کلب تھا جسکی ہمیں پہلے سے خبر ہوتی تو اپنی ناک بچانے کے لیے بھی سردار جی کی گاڑی میں ہر گز نہ بیٹھتے۔ درویش اول کے جھوٹ کی سزا ہم سب کو مل رہی تھی۔ دراصل یہ ایک سپورٹس کلب تھا۔ جس میں کھلاڑیوں کی قد آدم تصویریں آؤزیں تھیں۔ چونکہ رات کے کھیل سپورٹس کلبوں کی بجائے ناٹ کلبوں میں ہوتے ہیں، اس لئے اس کلب میں خاموشی اور نہانا تھا۔ ہاں سے نکل کر بار میں پہنچ تو وہاں بھی ایک سردار جی موجود تھے۔ رات دس بجے تو دنیا کے سبھی سردار جی ”گٹ“ ہو چکے ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ بھی ہمارے ساتھی سردار جی کی طرح کئی ”پٹیالے“ پار کر چکے تھے۔ سردار جی نے مصانع بعد میں کیا اور ڈیڑھ فٹ لمبی دارو کی شیشی پہلے میز پر نکا دی۔ اتنا تو مینڈک پانی نہیں پینے چتا سردار جی دارو پینتے ہیں۔ دوسرے سردار جی پہلے سردار جی کی طرح کرکٹ کے شیدائی بھی تھے اور اس کلب کے سیکڑی بھی تھے۔ چنانچہ کرکٹ کی

ہو کر غار بلوکی سیر کو نکلے۔ نیکی ڈرائیور نے بڑے احرام کے ساتھ درویش اول سے گزارش کی کہ یا شیخ میں نے آپ کو پہچان لیا ہے۔ آپ بچھلے سال بھی یہاں سے نریں رکوٹ کرنے آئے تھے۔ نادان نیکی ڈرائیور لباس سے دھوکہ کھا گیا۔ قبل اس کے درویش اول حقیقت بیان کرتا، درویش دوم کی عیاری جاگ اٹھی اور اس نے فوراً ڈرائیور کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ اس سال جتنی نریں بھرتی کریں گے ہر زس پر تمہیں بیس ڈالر انعام ملے گا۔ بس ہمارے قیام کے دوران تم ہمیں شرکی سیر کراو اور اچھی اچھی نریں کو ہمارے ہوش میں لے آؤ۔ نیکی ڈرائیور تو اس بات پر تقریباً نیم پاگل سا ہو گیا اور شیخ صاحب یعنی درویش اول کو خوش رکھنے کے لئے جان تک قربان کرنے کو تیار ہو گیا۔ پڑوں کے پیسے نے جاں ان گنت گھروں کو آباد کیا ہے وہاں اتنے ہی گھروں کو برباد اور بے آبرو بھی کر دیا ہے۔ اپنے ملک میں بھی ایسے ہزارہا تھے ہیں جاں ان گنت خاندان اس ستم کا شکار ہوئے ہیں۔ پنجاب اور فرمیر میں تو سینکڑوں گاؤں ایسے ہیں جہاں بچوں اور بوڑھوں کے علاوہ کوئی مرد باقی نہیں رہا۔ بس عورتیں ہی عورتیں دکھائی دیتی ہیں۔ ویسے تو پڑوں کی سر زمین میں عورتوں کی بھی بڑی مانگ ہے اور پاکستان کے دو شہروں یعنی لاہور اور کراچی نے اس مانگ کو پورا کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ اس کوشش میں لاہور کا شاہی محلہ اور کراچی کا ایک مخصوص طبقہ ہے فیشن اسٹبل طبقہ کتے ہیں شامل ہیں۔ مگر سرکاری سپرستی کی غیر موجودگی میں یہ کاروبار دیریا ثابت نہ ہوا اور ہمارے معزز بھائیوں کو یہ را میثیریں حاصل کرنے کے لئے مشرق بعید کا رخ کرنا پڑا۔ ہمارا نیکی ڈرائیور یوریشین نسل کا پڑھا لکھا نوجوان تھا۔ یوریشین نسل کے لوگ جزیرہ فوجی، آسٹریلیا، سنگاپور اور ملیشیا میں ملتے ہیں۔ ان لوگوں کا آبائی وطن تو جنوبی ہندوستان ہے مگر مختلف نسلوں اور نژادوں کے پوند نے اک نئی نسل گھو جنم دیا جو یوریشین نسل کملاتی ہے۔ ہمارا ڈرائیور بت اچھی انگریزی جانتا تھا۔ چنانچہ وہ ڈرائیور کے علاوہ ہمارا گائیڈ بھی بن گیا۔ ادھر درویش اول نے چپ سادھے لی۔ جب کبھی بات کرتا تو اردو میں بات کرتا کرتا تو اردو میں بات کرتا کرتا، جس کا ترجمہ درویش

دوم کرتا۔ اس طرح معصوم ڈرائیور پر شیخ صاحب کا رعب اور بڑھ جاتا۔  
 غار باطو ۲۷۸ء میں دریافت ہوئی۔ لامم شون کے سفید اور پیلے پتوں والی گھنے  
 جنگل میں گھری پہاڑی پر ۲۷۲ میلہ عیاں چڑھ کر غازیک بچیں تو بھگوان برا میںیم کا  
 مندر ہے۔ روم کے ہسپانوی نبیوں کی طرح ان بیڑھیوں تک چڑھتے چڑھتے بھگوان  
 تک چنچنے کا پوگرام تو دیسے ہی بن جاتا ہے۔ بھاری بھر کم درویش دوم کو تو اس کے  
 اس جھوٹ کی سزا فوراً ہی مل گئی تھی جو اس نے معصوم نیکی ڈرائیور سے رچایا تھا۔  
 غار باطو کے اندر پچاریوں سے کہیں زیادہ چمگادڑیں تھیں جو غار کی چھت سے لکھی  
 ہوئی تھیں۔ غار کے اندر جگہ جگہ سے پانی برستا رہتا ہے۔ ہمارے گائیڈ نے بتایا کہ  
 غار میں سفید رنگ کے سانپ بھی بکھرت پائے جاتے ہیں جو شام ڈھلنے اپنی پناہ گاہوں  
 سے نکل کر نبیوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ سانپ سفید ہوں یا کالے آخر سانپ ہوتے  
 ہیں۔ سانپوں کا نام سنتے ہی میں تو فوراً وہاں سے کھکھ لیا۔ کیونکہ کوئی سر پھرا سانپ  
 اگر شام سے پہلے ہی سیر کی ٹھان لے تو ہم اسکا کیا بجاڑ سکتے تھے۔ ادھر درویش دوم غار  
 کے دہانے پر بیڑھی سے نیک لگائے بیٹھا تھا۔ اور اس طرح بیٹھا تھا مجسے صدیوں سے  
 وہیں بیٹھا ہوا ہو اور ہیشہ بیٹھا رہے گا۔ البتہ درویش اول مندر پر چڑھاوے  
 چڑھانے والی پچارنوں کے سب اس طرح ساکن کھڑا تھا گویا ہنوان کا مجسمہ ہو۔ ہنوان  
 کے اصلی پوتے شاخ شاخ فلاہیزیاں لگاتے پھرتے تھے۔ مجھے نہ تو ہنوان سے دیکھی  
 تھی اور نہ پچارنوں سے۔ چنانچہ میں نے تو واپسی کا سفر اختیار کیا۔ ابھی میں آدمیے  
 راستے میں تھا کہ دونوں درویش نبیوں کے ساتھ چلتی ریل کار میں سوار ہاتھ ہلاتے  
 ہوئے گزر گئے۔ غار تک اوپر جانے کے لئے تو ریل کار میں جانا سمجھ میں آتا ہے بھلا  
 اوپر سے نیچے آنے میں ریل کار کی سواری کا کیا مقصد تھا۔ ماسوا اسکے کہ ریل کار  
 نوجوان پچارنوں سے کھچا کچھ بھری ہوئی تھی۔

غار باطو اگرچہ کوالا لمپور سے صرف ۳۳ کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے مگر یہاں  
 بھی سیاحوں کی سولت کے لئے درجنوں کھلانے پینے کی جگہیں اور شاپنگ کے لئے

اسلام آباد اور نیشنل مسجد کوالا لمپور بینیا کی خوبصورت ترین جدید مسجدیں ہیں۔ یہ مسجد پانچ سال کی مدت میں ۱۹۷۵ء میں مکمل ہوئی اور اسکی تعمیر میشیا کے تمام مذاہب نے حصہ لیا۔ درحقیقت یہ مسجد وہاں کی مذہبی ہم آہنگی کا نشان ہے۔ مسجد کا مرکزی گنبد ۱۸ مکتروں والے ستارے کی مانند بنایا گیا ہے، جو میشیا کی تیرہ ریاستوں اور اسلام کے پانچ بینیادی اصولوں کی ترجیحی کرتا ہے۔ نوکدار بھالے کی مانند ۲۷ میٹر اونچا ایک مینار ہے، جسکے اندر باقاعدہ لفت گئی ہوئی ہے۔ یہ مینار موزن کے لئے کم اور سیاحوں کے لئے زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ درحقیقت ایمان والوں کو تو ان کے فرض کی یاد دہانی کے لئے بلند و بالا میناروں اور لاوڑیں کی چند اس ضرورت نہیں ہوتی۔ اور خاص طور پر موجودہ دور میں جب انسان گھری کی سویوں میں جکڑا ہوا ہے۔ درویش اول لفت میں ہرگز سوار نہیں ہوتا۔ درویش دوم کو مفت کی کسی قسم کی لفت بھی ملے تو گریز نہیں کرتا۔ درویش سوم کچھ سائیکل کے پیڈل نما تھا، جو آگے بھی گھوم جاتا تھا اور پیچھے بھی۔ مینار پر جانے کے لئے باقاعدہ بحث ہوئی۔ ہمارے گائیڈ نے پڑ نور اپیل کی کہ مسجد کے مینار سے شر کے بڑے خوبصورت نظارے ہوتے ہیں۔ اگر آپ لوگ مینار پر نہ گئے تو ایل<sup>۱</sup> کی سیرادھوری رہ جائے گی۔ چونکہ درویش اول دراصل وہاں جانے کے لئے درویش دوم نے اصرار کیا تھا۔ کیونکہ وہ انساں سے بت رغبت رکھتا تھا۔ کسی زمانے میں اس پہاڑی پر انساں کے باغات ہوا کرتے تھے اور اسی نسبت سے اسکا نام بھی کوہ انساں مشہور ہوا۔ مگر اب وہاں ایک خوبصورت پارک ہے۔ کیبل کار یعنی برقی جھولے ہیں اور شر کے خوبصورت نظارے ہیں۔ نہیں ہیں تو انساں کے باغات۔ چنانچہ درویش دوم نے فروہاں سے کوچ کا اعلان کر دیا۔

وکافی موجود ہیں۔ وہیں باتیک کی فیکٹریاں بھی ہیں۔ جہاں سیاحوں کی دوپھی کے لئے پہلے باتیک کی رنگائی اور چھپائی کا کام دکھایا جاتا ہے اور بعد میں شاپنگ کا شوق پورا کرنے کے لئے شوروم میں لے جایا جاتا ہے۔ باتیک بھی سندھی اجرک کی طرح کا کپڑا ہوتا ہے جسکی بناوٹ کی ابتدا تو انڈونیشیا میں ہوئی مگر اب میشیا والوں نے بھی اس کپڑے کی چھپائی میں بڑا کمال حاصل کر لیا ہے۔ پہلے کپڑے پر موم سے ڈیرائیں بنائے جاتے ہیں۔ پھر کپڑے کو رنگ میں ڈال دیا جاتا ہے۔ جہاں موم لگا ہوتا ہے صرف وہاں رنگ نہیں چڑھتا بلکہ کپڑا رنگ جاتا ہے۔ اس کے بعد کپڑے کو گرم پانی میں ڈال کر موم اتار لیا جاتا ہے۔ یہی عمل کنی مرتبہ دہرا لیا جاتا ہے اور کپڑے پر مختلف رنگوں کے مختلف ڈیرائیں بنادیئے جاتے ہیں۔ صدیوں پہلے جب انڈونیشیا والوں نے باتیک کی چھپائی کا کام شروع کیا تو اس وقت مختلف پھولوں اور درختوں کی کھال سے رنگ حاصل کیا جاتا تھا۔ مگر اب وہاں بھی کیمیادی رنگوں سے باتیک تیار کی جاتی ہے۔

غار باختر سے واپسی پر ڈرائیور ہمیں کوہ انساں Bukitnana<sup>۲</sup> لے گیا۔ دراصل وہاں جانے کے لئے درویش دوم نے اصرار کیا تھا۔ کیونکہ وہ انساں سے بت رغبت رکھتا تھا۔ کسی زمانے میں اس پہاڑی پر انساں کے باغات ہوا کرتے تھے اور اسی نسبت سے اسکا نام بھی کوہ انساں مشہور ہوا۔ مگر اب وہاں ایک خوبصورت پارک ہے۔ کیبل کار یعنی برقی جھولے ہیں اور شر کے خوبصورت نظارے ہیں۔ نہیں ہیں تو انساں کے باغات۔ چنانچہ درویش دوم نے فروہاں سے کوچ کا اعلان کر دیا۔ درویش اول گناہ و ثواب کی بیلنٹن شیٹ کے توازن کا بہت خیال رکھتا تھا۔ کبھی گناہ کرنے کے بعد اس پر ثواب کا غلاف چڑھا لیتا اور کبھی گناہ کرنے سے پہلے نرسوں کو رکوٹ ترات کے وقت کرنا تھا، اس لئے اس نے ذن کے وقت بہت ہی مخصوص قسم کی سیاحت کی طرف دھیان رکھا۔ چنانچہ کوہ انساں کے بعد سیدھے ”نیشنل ماسک“ قوی مسجد گئے۔ یہ مسجد مشرق بعید کی خوبصورت ترین مسجد ہے۔ فیصل مسجد

علاقے میں پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں مصنوعی جھیل، پارلینٹ بلڈنگ، شاہی محل، نیشنل مونینو منٹ اور عجائب گھر ہے۔ اس سیرگاہ میں ہر مزاج اور ہر شوق کی تسلیکیں کا بندوبست ہے۔ مگر جس شوق میں ہم نے ملیشیا کے ہر عمر کے لوگوں کو الجھا ہوا پایا وہ پنگ بازی ہے۔ یہ پنگ بازی ایک ایسا کھیل ہے جو دنیا کے ہر ملک میں جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ البتہ اس کھیل کو کہیں تو دیوانگی کی حد تک اپنایا جاتا ہے اور کہیں صرف کھیل تک۔ مثلاً ”زندہ دلان لاہور کی زندہ دلی گو صرف پنگ بازی ہی تک محدود ہو کر رہ گئی ہے“، مگر ان کی زندہ دلی نے اس کھیل کو ایک خوبصورت توار بنا دیا ہے۔ اگرچہ لاہور کے بست کارگر اور سماں تو دنیا کے کسی ملک میں نہیں ملتا، البتہ پنگ سازی میں برازیل، جپان اور ملیشیا بڑی مہارت رکھتے ہیں اور وہاں بنائے گئے پنگ ڈیزائیں، سائز اور ٹیبل کے لحاظ سے یہاں کے پنگوں سے بہت بہتر ہوتے ہیں۔ ملیشیا کے پنگ باز بھی لاہوری پنگ بازوں کی طرح پیچ ڈالنے کے تو ماہر ہیں، البتہ ”بُو“ ہونے یعنی گذی کٹنے پر بھگدا نہیں ڈال سکتے، ڈھول نہیں پیٹ سکتے، ”او بکری“ کے نگرے نہیں لگا سکتے، کہی پنگ والوں کو زیل کرنے کے لئے مخصوص آوازیں نہیں نکال سکتے، کلاشکوف بھی نہیں چلا سکتے اور گذی لوٹنے کے لئے چھتوں سے بھی نہیں گرتے۔ شاید اپنی ان سب باتوں کے سب لاہور والے زندہ دلان لاہور کملاتے ہیں اور ”کے۔ ایل“ والے زندہ دلان ”کے۔ ایل“ نہیں کملاتے صرف پنگ باز کملاتے ہیں۔

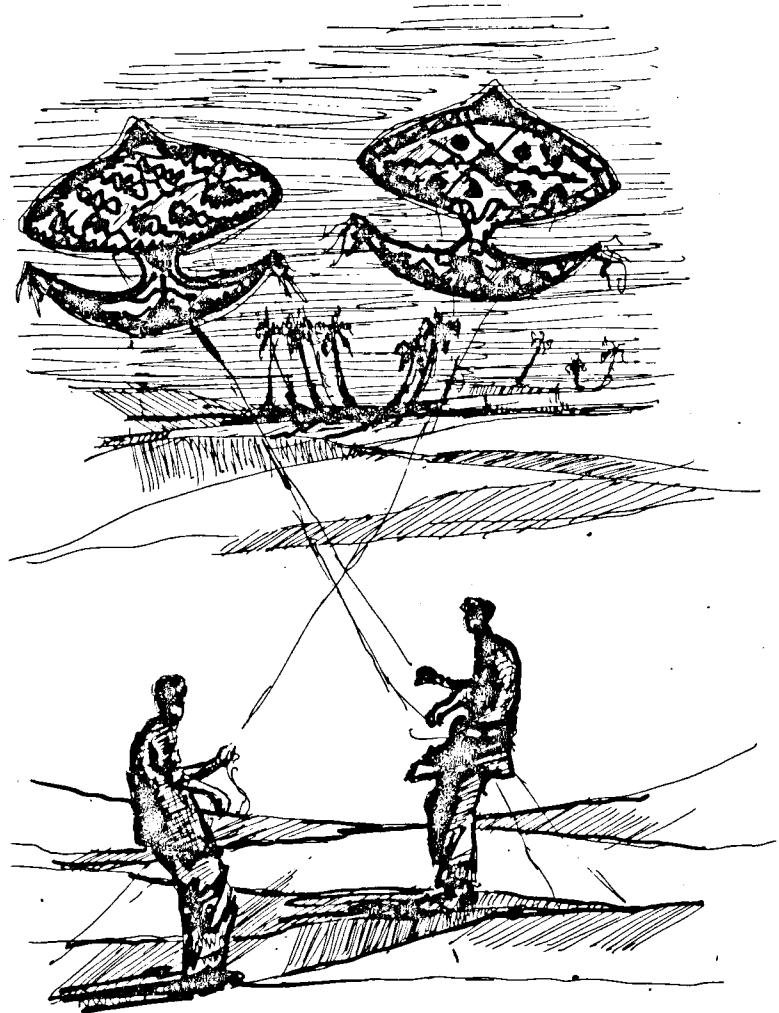
پنگ بازی کی طرح کا ایک اور کھیل بھی ہے جو دنیا بھر میں صدیوں سے کھیلا جاتا ہے اور بہت مقبول ہے۔ یہ کھیل کھلے میدانوں کے بجائے نگل گلیوں اور بند کروں میں کھیلا جاتا ہے اور اس کے کھلاڑی یہ کھیل تماشا ہیوں سے آنکھ بچا کر کھیلتے ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان میں یہ کھیل دنیا کے تمام ممالک سے بالکل مختلف ہے۔ کیونکہ یہاں کی ہیرا منڈیوں میں رقص و موسيقی کو اولیٰ دی جاتی ہے جس کو نہیں، جبکہ دوسرے ممالک میں صرف جنسی کھیل ہی کھیلے جاتے ہیں۔ ”کے۔ ایل“ کا وہ بازار بھول بھیاں والا بازار ہے۔ نیز ہمیں ترجمی پنگ و تاریک گلیاں جماں پیشہ ور خواتین

پھیلایا تھا۔ خدا کا شکر کہ مسجد کے اس بیٹار پر جوتے پہن کر جانے کی اجازت نہیں ورنہ خدا جانے کس کا بجوتا کس کے سر پر ہوتا۔ مگر قربان جائیں درویش اول کی ذہانت کے۔ دراصل جب سے وہ درویش سے شیخ بنا تھا۔ اس نے چب سادھے لی تھی۔ اگر کبھی کوئی بات کرتا بھی تو درویش دوم کے ذریعے۔ اب وہی کاروائی ہماری جان بخشی کے کام آئی۔ طویل خاموشی کے بعد درویش اول نے ایک چٹ پر کچھ لکھ کر درویش دوم کے حوالے کیا۔ درویش دوم نے طالب علم کو انگریزی میں کہا کہ شیخ صاحب دوران سفر کی اجنبی سے ہم کلام نہیں ہوتے۔ اگر تمیں سکالر شپ کی ضرورت ہے تو شیخ صاحب اسکا بندوبست کر دیں گے۔ تم کل دوپہر کو ان کے ہوٹل میں حاضری رہنا۔ اس خلافت کا اتنا شدید اثر ہوا کہ تمام طلبے پورے وقت تقریباً ”رکوع“ کے پوز میں سر جھکائے کھڑے رہے اور کسی نے شیخ صاحب کی جانب آنکھ تک اٹھا کر نہ دیکھا۔ نیشنل مالک کے قریب ہی ”کے۔ ایل“ کا ریلوے شیشن ہے جو مورش طرز تغیر کے سبب قابل دید عمارات ہے۔ خدا خبر برطانوی حکومت کو کیا سو جھی کہ انہوں نے ”کے۔ ایل“ میں مورش طرز تغیر کی تین عماوتوں بنا ڈالیں۔ فیڈرل سیکریٹیٹ، جزل پوسٹ آفس اور ریلوے شیشن۔ ان عمارتوں کو دیکھ کر ”کے۔ ایل“ پر کسی الف لیلوی شرکا گمان ہوتا ہے۔ دوپہر ڈھلے سیر ختم ہوئی تو ہم نے ہوٹل کا رخ کیا۔ کیونکہ شام کو زرسوں کے انٹریوز بھی لینے تھے، جس کے لئے آرام کی سخت ضرورت تھی۔

کوالا لپور کے معنی ہیں گدلے دریا کا دہانہ۔ ۱۸۵۹ء میں جب دو چینی تاجردوں نے شرکی بنیاد رکھی تو اسوقت یہاں دریائے گوم باک اور دریائے کلائنگ کے سکن پر چھبیسوں کی ایک چھوٹی سی بستی موجود تھی۔ کوالا لپور کے قریب ثن کی کانیں دریافت ہوتے ہی یہاں کی اہمیت اور آبادی میں اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔ اور صرف ایک سو سال کے عرصے میں چھبیسوں کی یہ بستی مشرق بعید کے خوبصورت دار الحکومتوں میں شمار ہونے لگی۔

لیک گارڈنز، ”کے۔ ایل“ یعنی کوالا لپور کی خوبصورت ترین سیرگاہ ہے جو وسیع

ٹیڈھی ناک۔ میرا بار بار ہی چاہا کہ سلیم طوطا کی ناک پر ایک گھونسہ ریس دکروں، مگر ایسا کرنے سے اسکی ناک سیدھی ہونے کا خطرہ تھا اور یہ احسان میں اس پر کرنا نہیں چاہتا تھا۔



اور خواتین کے لباس میں پیشہ درڑ کے ہر ذوق و شوق کی تیکین کے لئے موجود ہوتے ہیں۔ جس گھر میں کھیل جاری ہوتا ہے اسکے سامنے لال بنتی جلا دی جاتی ہے۔ شاید اسی لئے اس بازار کو ریڈ لائیٹ ایریا بھی کہتے ہیں۔

شام ڈھل پچھی تھی۔ نرسوں کے انٹرویوز کا وقت قریب تھا۔ تیوں درویش کرے میں بھوکے شیروں کی طرح مل رہے تھے۔ دوسرے کے آرام نے درویش اول کی بیڑی چارج کر دی تھی۔ چنانچہ اسکی جاپانی کھلونے سی چال میں بلا کی پھرتی آگئی تھی۔ جب تک دوسرا درویش کرے کا ایک چکر کاشتے درویش اول دو چکر لگا لیتا۔ دروازے پر دستک ہوئی تو سرت الوجود درویش دوم چیتی کی طرح دروازے کی طرف لپکا اور دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی تیوں درویشوں پر اوس سی پڑگئی، کیونکہ سامنے نرسوں سے ملانے والا یوریشن ڈرائیور نہیں بلکہ سلیم طوطا مع اپنی ٹیڈھی ناک کے کھڑا تھا۔ سلیم طوطے کی یوں ناگہانی آمد درویشوں کے لئے ناگہانی موت سے کم نہ تھی۔ کیونکہ نرسوں کے اس کھیل میں سلیم طوطے کی ناک اگر تیر بھی ہوتی تو اسکا ساتھ ہمیں گوارا نہ تھا۔ وہ تو تھا ہی ٹیڈھی ناک والا اور ٹیڈھی ناک والے بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ بھلاسے ہم کیوں کراپنے ہمراہ لے جاتے۔ ویسے تو ہم پاکستانی ہر عیب کرتے ہیں اور کھلے بندوں، ڈسکے کی چوٹ کرتے ہیں، ہر ملک میں عیب کرتے ہیں اور ہر طرح سے عیب کرتے ہیں، البتہ دوسرا ہم وطنوں سے اپنے عیوں کو چھپانا لازی ہے کہ یہی دو غلا پن ہمارا قوی تشخص ہے۔ درویش اول نے مجھے اپنے پاس بلا کر میرے کان میں سرگوشی کی۔ میرا رنگ بھدی ہو گیا اور میں نے زبردست احتجاج کیا۔ اس نے پھر سرگوشی کی۔ بھی سلیم طوطے کو تم جانتے ہو اور لاہور سے جانتے ہو۔ ہمارا بھلا اس سے کیا دامت۔ تم اپنے لاہور کے رشتے نبھاؤ اور ہماری جان چھوڑو۔

مجھے اس نے دوبارہ احتجاج کرنے کا موقع ہی نہیں دیا اور درویش دوم کو اپنے ہمراہ لے کر نرسوں کے انٹرویوز کے لیے نکل گیا۔ وہاں رہ گئے ہم، سلیم طوطا اور اسکی

# انڈونیشیا



صح کی پہلی کرن سے پہلے ہمارا طیارہ انڈو نیشیا کی پر سکون فضاد میں چھکھاڑ رہا تھا۔ درویش دوم خواب خرگوش سے بیدار ہوا اور حسب معمول سیدھا ٹائیکٹ کی طرف چل دیا۔ وہاں مختلف سائزوں، عمروں اور نسلوں کے لوگوں کی پہلے ہی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ ادھر سرخ منی سکرٹوں میں نیم ڈھکی تابنے سی رنگت والی فضائی میزبانیں پلک پلک کر مسافروں کے سامنے ناشتے کی ٹرے رکھ رہی تھیں۔ جیسے ہی وہ قریب پہنچتیں درویش اول کیوتکی طرح آنکھیں بند کر لیتا، مگر ان کے مڑتے ہی آنکھیں پھاڑ کر تازتا اور بھانپتا۔ شاید اسی طرح وہ اپنی بھوک میں اضافہ کر رہا تھا۔ نیچے نیکوں سمندر کے سینے پر سینکڑوں چھوٹے چھوٹے جزیرے پھیلے ہوئے تھے۔ سلطنت انڈو نیشیا میں اسی طرح کے ساڑھے تیرہ ہزار جزیرے ہیں جن میں کوئی چھ ہزار جزیرے تو ایسے ہیں جہاں پرندوں اور درندوں کے علاوہ کوئی آبادی نہیں۔ بتیں سو میل لمبائی اور بارہ سو میل چوڑائی میں پھیلے ہوئے جزیروں کی اس سلطنت کا جکارہ سے رابطہ قائم کرنے کے لئے ایک مضبوط بحریہ کی ضرورت ہے۔ اسی لئے انڈو نیشیا کی بحریہ جنوب مشرقی ایشیا کی مضبوط ترین بحریہ سمجھی جاتی ہے۔

ملائیشیا میں ہماری آخری رات بڑی تلنخ تھی۔ اور وہی تلنخ دوران سفر بھی اپنی تلنخ دکھا رہی تھی۔ درحقیقت مجھے نرسوں سے ملاقات کی محرومی کا بیچد دکھ تھا۔ جنکا میں کھلے بندوں اعتراف بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ دونوں درویشوں پر سلیم

کیونکہ نریں بالکل بیکار تھیں۔ نریں لاکھ بیکار ہوں سلیم طوطے سے تو یقیناً بہتر ہو گئی اتنا تو نہیں بھی جانتا تھا۔

ہمارا طیارہ جگارتہ کے حیلہ اٹر نیشنل ایرپورٹ پر اڑا، لیکن طیارہ ارتے ہی مسافروں میں بھگڑتی تھی چیزیں۔ اگر ان کا بس چلتا تو وہ دروازہ کھلنے کا بھی انتظار نہ کرتے بلکہ کھڑکی ہی سے باہر چھلانگیں لگانا شروع کر دیتے۔ چونکہ جہاز جہاز ہوتا ہے بس نہیں ہوتی حتیٰ کہ ایرپورٹ بھی جب جہاز بنتی ہے تو اس کی کھڑکیاں بھی تا قیامت بند ہونے کے لئے بنائی جاتی ہیں۔ اسی لئے بیچارے مسافروں کو "مجبراً" دروازہ کھلنے تک جہاز ہی میں رکنا پڑا۔ دنیا کے تمام ایرپورٹوں کے لوازمات تقریباً "یکساں ہی ہوتے ہیں، جسکی ہمیں خوب پریکش ہو چکی تھی۔ چنانچہ بلا جیل و جنت ہم بھی ایرپورٹ کے باہر آگئے۔ دونوں درویشوں سے نئی نویلی صلح کے سبب میں اتنا تابعدار ہو گیا تھا کہ ان کا سامان تو سامان خود انہیں اٹھانے پر آمادہ تھا۔ حالانکہ درویش دوم کو اٹھانے سے تو کریں کی کمر میں بھی مل پڑ جانے کا خدشہ تھا۔ ایرپورٹ سے شر جانے کے لئے بلیٹو بڑی تیکسی سروس کی نئی نویلی اور چیکلی یکساں سینکڑوں کی تعداد میں قطار اندر قطار کھڑی تھیں۔ مگر درویش دوم نے شر میں واڑہ ہونے کے لئے بس میں سفر کرنے کا فیصلہ سنایا اور گیٹ سے باہر بس شاپ کی جانب چل دیا۔ میں بھی نمار منہ سامان گھیتا ہوا درویشوں کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ اس بس پر سوار ہونا اور وہ بھی سامان سمیت، کسی سرکش گھوڑے کو قابو میں لانے سے کم نہ تھا۔ تاہم ہم سوار ہوئے اور بھر انڈر سامان سمیت سوار ہوئے۔ اگرچہ شر تک کا سفر مرغابین کر رہی کرنا پڑا اور ظاہر ہے کہ اس پوزیشن میں ہمیں اپنے مسافروں کے جسموں کے علاوہ اور کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ رنگ برنگ کے پاٹیک سے جھانکتے ہوئے تابنے جیسے جسموں کو جھانکتے جھانکتے ہمارا سفر کٹ گیا اور ہم مردیا کا چوک Merdeka Square میں اڑ گئے۔

جگارتہ کے معنی ہیں شرفخ، اور اس شر نے غلامی اور آزادی، ظلم و تشدد، کشت و خون اور فتح و نیکست کے کئی ادوار دیکھے ہیں۔ ۷۵۲ء میں پرتگالیوں نے حملہ

طوطے کی بے عزتی کا الزام دھرا اور ان سے سفارتی تعلقات تو زلئے اور اعلان کر دیا کہ آئندہ میں ان کا سامان ہرگز ہرگز نہیں اٹھاؤں گا۔ حقیقت یہ ہے کہ غیر معمولی شاپنگ سے ان کے سامان کا وزن بڑھتا جا رہا تھا اور روز بروز کے فاقوں سے میرا وزن گھٹتا جا رہا تھا۔ لہذا ایک ہی جھٹکے میں میں نے دونوں درویشوں سے اپنا بدلہ لے لیا۔ تاہم وہ بھی کوئی کمی گولیاں نہیں کھلیے تھے۔ درویش اول نے فوراً "جوابی حملہ کیا اور دھمکی دیدی کہ بیساں اگر تم ہمارا یہ سامان نہیں اٹھاؤ گے تو تمہارا پاسپورٹ ہم اپنے بریف کیس میں نہیں رکھیں گے۔ بھلا میں اس گیدڑ بھکلی میں کب آنے والا تھا۔ میں نے فوراً اپنا پاسپورٹ واپس لے لیا۔ اور ویسے بھی کینگی کے تو ہم تسليم شدہ بادشاہ ہیں۔ چاہیں تو پوری کائنات سے آنکھیں پھیر لیں، مگر درویش اول بلوج تھا اور بلوجوں کی یاری دوستی کے بارے میں کسی شاعر کا قول ہے۔

سی نوں ماں متاں دیوے چھڈ بلوج دی یاری  
اگلی رات قیام بمناں داتے پھچلی رات تیاری  
درویش اول کی اس خصلت کے علاوہ بھی ہماری ایک مجبوری تھی۔ وہ مجبوری ہرگز یہ نہ تھی کہ اگر ان درویشوں سے بات چیت نہ کی تو کھانا ہضم نہ ہو گا۔ بلکہ مجبوری یہ تھی کہ ان سے صلح نہ ہوئی تو کھانا ملے گا ہی نہیں، کیونکہ سفر خرچ کی جو جمع پوچھی تھی وہ تو سفر شروع ہوتے ہی کپیٹر دماغ درویش دوم کے حوالے کر دی گئی تھی۔ پھر کھانا ٹھرا ہماری کمزوری، جس سے یہ دونوں گھر کے بھیدی بھجنی واقف تھے۔ چنانچہ میں فوراً "امن کی فاختہ بن گیا اور جس طرح بیچاری امن کی فاختہ دنیا میں ذیل ہو رہی ہے اسی طرح ذیل ہوتا رہا، جب تک دونوں درویشوں نے یہ تسلی نہ کر لی کہ میں ان سے نرسوں کے بارے میں قطعاً" کچھ سوال و وال نہ کروں گا اور سامان اٹھانے سے کبھی انکار نہ کروں گا۔ سفارتی تعلقات بحال ہوتے ہی میرا پاسپورٹ درویش اول کے بریف کیس میں تھا اور دونوں درویشوں کا سامان میرے کندھوں پر۔ درویش دوم نے مجھے ہت و حوصلہ دینے کی خاطریہ بھی سنا دیا کہ اچھا ہوا میں اسکے ہمراہ نہ تھا

ساتھ ہمیں پائیں کہ ہم دونوں ہکا بکا رہ گے۔ چنانچہ اس کی نیجت پر عمل کرتے ہوئے سب سے پہلے جوگ جکارتہ جانے کے لیے ٹرین کا لکٹ بک کروایا۔ وہاں ٹرینیں آجی بھی ہیں اور ستی بھی۔

وقت کم اور مقابلہ سخت ہو تو شرکی سیر کا ایک آسان نسخہ بھی ہے۔ گوہ نسخہ پیدل سیر کے مقابلے میں ارزش تو نہیں ہوتا مگر دربردہ دھکے کھانے کی بہ نسبت یقینی ضرور ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم لوگ سٹیشن سے سیدھے یونیورسل ٹورز کے دفتر پہنچے۔ انڈونیشیا میں ایسی بست سی ٹورز کپنیاں ہیں جو سیاحوں کو باقاعدہ تربیت یافتہ گائیڈوں کے ذریعے سیر کرتی ہیں۔ پاکستان اور بھلک دلش کے علاوہ جنوب مشرق اور مشرقی ایشیا کے بھی ممالک سیاحت پر بست توجہ دیتے ہیں۔ کیونکہ سیاحت دنیا کی واحد انڈسٹری ہے جسکے پھیلاؤ سے محبتی بڑھتی ہیں گھٹتی نہیں۔ دنیا کی ہر تجارت کو کوئی ستم کے ذریعے کنٹول کیا جاتا ہے اور ہر ملک دوسرے ملک کو ایک مقررہ حد سے زیادہ نہ مال بھیج سکتا ہے اور نہ ملکوں سکتا ہے۔ مگر سیاحوں کی آمد رفت پر ایسی کوئی پابندی نہیں۔ پھر یہ انڈسٹری ترقی پذیر ممالک کے لئے تو بڑی ہی کار آمد ہے۔ کیونکہ سیاحت اور سیاحوں کی آمدنی کے کمی طبقے حصے دار بن جاتے ہیں۔ مثلاً "سیاح کی آمد پر سب سے پہلے ملک کی ایئر لائی میں کماتی ہے۔ ایسپورٹ کا پورٹر کماتا ہے۔ ایسپورٹ سے شرکانے والے نیکی یا رکشا ڈرائیور کماتے ہیں۔ ہوش والے کماتے ہیں۔ ریسٹوران والے کماتے ہیں۔ ٹور کمپنی والے کماتے ہیں۔ سیر کا ہوں پر سو یعنی بیچنے والے کماتے ہیں اور یوں سیاحت سے آمدنی کا یہ سلسلہ نہ صرف ایک طبقے اور ایک شرٹک محدود ہوتا ہے بلکہ ہر طبقے اور ہر شریں بست سے افراد کے لئے روزی کا ذریعہ بتتا ہے۔ دنیا کی کسی اور انڈسٹری سے اتنے لوگ مستفید نہیں ہوتے۔ زر مبادلہ کمانے کا بھی سیاحت سے بہتر، آسان اور موثر نسخہ کوئی اور نہیں ہے۔ گوہ ہماری حکومتوں کے پاس زر مبادلہ کمانے کا ایک نسخہ کیمیا ہے اور وہ ہے کاسہ

کیا تو اہل جادا نے جملہ آوروں کو بھاست فاش دی اور اس شہر کا نام شریعت یعنی جایا کارتہ رکھا گیا۔ ہر سال ۲۲ جون کو اس فتح کی یاد میں اس شریعت میں جشن منائے جاتے ہیں۔ ۱۵۹۶ء میں ہالینڈ کے چار تجارتی جہاز آئے اور یہاں سے گرم مصالحے یورپ لے گئے۔ اس تجارت سے اتنا منافع ہوا کہ ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی ہمنام برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرح مکاری اور عیاری کو بڑے کار لاتے ہوئے دریائے سیلیونگ کے دہانے پر تھوڑے سی جگہ حاصل کر لی اور اسکا نام ہاتا دیا Batavia رکھا۔ تھوڑی ہی عرصے میں اس جگہ ایک مضبوط قلعہ تعمیر کیا اور پھر اگلی تین صدیوں تک انڈونیشیا کے گرم مصالحوں کی انمول دولت پر شیش ناگ کی طرح پھن پھیلا کر بیٹھ گئے۔ انڈونیشیا کے مرد آہن صدر سکارنو کی ان تھک جدوجہد بالآخر کامیاب ہوئی اور انڈونیشیا دسمبر ۱۹۴۹ء میں آزاد ہو گیا۔ اور جایا کارتہ، جکارتہ بن کر انڈونیشیا کا دارالحکومت قرار پایا۔ گو جکارتہ کو دیکھنے کے لئے ایک ہفتہ درکار ہے، مگر ہمارے پاس تو پورا انڈونیشیا دیکھنے کے لئے ہفتہ تھا۔ چنانچہ درویشوں کی کامینہ کا ہوش کے کمرے میں ہنگامی اجلاس بپا ہوا جس میں فیصلہ کیا گیا کہ جکارتہ میں دو دن اور ایک رات گزاری جائے گی۔ دیسے آپس کی بات ہے درویش دوم کی یہ منطق میری سمجھ میں تو نہ آئی کہ آخر کس حساب سے دو دن اور ایک رات جکارتہ میں گزارے جائیں۔ جبکہ رات اور دن تو برابر ہوتے ہیں۔ لیکن درویش دوم آخر کمپیوٹر دماغ آدمی تھا۔ اس نے تو ایک ایک لمحے کا حساب کر رکھا تھا۔ ہوشوں سے چیک آؤٹ کا وقت دوپر کے بارہ بجے ہوتا ہے جسکے بعد دوسرے دن کا کرایہ دینا پڑ جاتا ہے۔ چنانچہ اس نے کہا کہ "آج دن بھر سیر کرتے ہیں۔ رات ہوش میں گزاریں گے۔ کل بارہ بجے سے پہلے کمروں سے سامان نکال کر ہوش کے سورہ میں جمع کرادیں گے۔ پھر دن بھر سیر کریں گے۔ شام کو ٹرین پر بیٹھ کر جوگ جکارتہ کی طرف سفر انتیار کریں گے۔ رات ٹرین میں گزرے گی تو دوسری رات کے ہوش کا کرایہ بھی نجیج جائے گا اور منزل تک بھی پہنچ جائیں گے۔" یہ سب باتیں درویش دوم نے اس روائی کے

کی حد تک تو درویش اول بھی نوکر شاہی کے طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ چنانچہ جب تک ہم یونیورسٹی نورز کے دفتر میں داخل ہوئے اس نے ہوٹل گرینڈ ہسپیت کو والا پور والا ڈراما ڈھرانے کا فیصلہ کیا اور سیدھا مینپر کے کمرے میں جا گھسا۔ چند لمحوں بعد ہم دونوں بھی وہاں بلا لئے گئے۔ درویش اول نے انڈونیشیا میں پاکستانی سیاحوں کو لانے والی کمائی چھیڑ رکھی تھی اور اس ضمن میں وہ یونیورسٹی نورز کے مینپر سے سیکنڈوں قدم کے سوالات پوچھے جا رہا تھا۔ اور وہ یچارہ میز پر نقصے پھیلائے درویش اول کو ہر قسم کی معلومات فراہم کر رہا تھا۔ کوئی آدھ گھنٹے کی بک بک کے بعد درویش اول نے مطالباہ کیا ”ہم جذارتی کی سیر گاہوں کو ذاتی طور پر دیکھنا چاہیں گے تاکہ سیاحت کے فروغ کے لئے بہتر سروے تیار کر سکیں۔“ مینپر تو اس سعادت پر پاگل سا ہو گیا۔ فوراً ایک گھنیڈھ کو پابند کیا۔ گاڑی حوالے کی۔ رات کو کھانے پر مدعو کیا اور ہمیں سیر پر روانہ کر دیا۔

درویش اول کی سیر تو گائیڈ سے ملاقات ہتی پر پوری ہو گئی۔ کیونکہ وہ تابنے سی رنگت والی لڑکی گائیڈ کم اور کسی مندر کی دیوی زیادہ لگتی تھی۔ اگر ہم دونوں ساتھ نہ ہوتے تو یقیناً درویش اول گیوں کوچوں کی خاک چھاننے کی بجائے اس دیوی کے چرنوں میں بیٹھ جاتا۔ یا یوں کہے کہ اس کے گوٹے گھوٹوں میں بیٹھ جاتا اور اس وقت تک اس کا پیچانہ چھوڑتا جب تک گو ہر مراد نہ پاتا۔ ایسا نامراہ مل پھینک سیاح تو اس گائیڈ نے بھی غالباً ”کبھی نہ دیکھا ہو گا۔“

گاڑی ٹریفک کے گھنے جگل کو چرتی ہوئی سمندر کنارے بے باتا یا کے علاقے میں پکنی۔ اس علاقے میں ہر طرح کی گما گئی ہے جو قدیم شہروں کی روایت سے منقص ہے۔ درویش اول کی بھوک پیاس تو گائیڈ کی قوت سے ختم ہو گئی تھی۔ مگر مجھے بھوک نے تقریباً ”ڈھال کر دیا تھا۔“ میں نے درویش دوم کے موٹے پیٹ پر کھنی ماری اور ایک ایسے رستوران کی طرف اشارہ کیا جہاں تازہ مچھلیاں تلی جا رہی تھیں۔ اس

گد اگری، کہ جب ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ رادر ضرورت اکشہر لاحق ہوتی ہے) تو عمرہ کرنے کے بھانے بھیک مانگنے چلے گئے۔ میں پادر جو اپنے ملک کی مضبوطی کا باعث بنتی، اس کو صحرائی آگ میں جھوٹک دیا اور ان کا خون بھینہ بیج کر جو کچھ زر مبارلہ کمالیا کمالیا۔ یا ایک اور بھی شرمناک کام یہ کیا کہ اپنے ملک کے کچھ حصے ٹھیکے پر چڑھا دیئے۔ چوستان کا علاقہ ہر سال عربوں کو ٹھیکے پر دیدیا جاتا ہے۔ چوستان میں پاکستانی تو کیا چوستانی بھی بمشکل داخل ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ سردویں کے موسم میں وہ علاقہ صرف عربوں کے لئے مخصوص کر دیا جاتا ہے۔ ہماری حکومت جو سال بھر اخباروں اور نیلوں پر جنگلی جانوروں کے تحفظ کے اشتمارات دیتی رہتی ہے اور پاکستانیوں کے لئے ان جانوروں کا شکار اخلاقاً ”اور قانون“ منوع ہے عربوں کے لئے وہ سب کھلے عام معاف ہے کیونکہ پاکستان کا قانون پاکستان میں بھی عربوں پر لاگو نہیں ہوتا بلکہ عربوں پر تو غالباً ”کوئی اور بھی قانون لاگو نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ چوستان کے غرب لوگوں کے تین چار سال کی عمر کے بچے کرائے پر لے لئے جاتے ہیں۔ ان بچوں کو جنگلی اونٹیوں پر باندھا جاتا ہے۔ بچے کوڑے کی ضرب اور درد کے کرب سے جتنی تیز پکار کرتے ہیں اونٹیاں اتنی ہی تیز بھاگتی ہیں اور ہمارے محض عربوں کا دل بھلاتی ہیں۔ اس رسیں میں کوڑے کھانے والے بچے اکثر اونٹیوں سے گر کر ان کے پاؤں تلے کچلے اور روندے جاتے ہیں۔ لیکن چونکہ وادہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے اس لئے جب بھی بچے جوان ہو کر احتجاج کی زبان بنتے ہیں تو عربوں سے زر مبارلہ وصول کرنے والے ہمارے اپنے ملک کے حکمران بھی ان پر کوڑے بر ساتے ہیں۔ مجھے لیکن ہے کہ ایک دن ہمارے ملک میں بھی کوئی روشن داغ حکمران سیاحت کے انمول خزانے کی طرف دھیان دیگا۔ اسے ایک صنعت کے طور پر آگے بڑھائے گا نیز اسے نوکر شاہی کی دستبردار سے محفوظ رکھے گا کہ ترقی پذیر ملکوں میں جب تک نوکر شاہی کا بدنام زمانہ نظام قائم ہے اس وقت تک یہ ترقی پذیر ہی رہیں گے اور نوکر شاہی شہنشاہی عروج پائے گی اور کرسی صدارت تک پہنچ جائے گی۔ سوچ

انڈونیشیا میں جا کر آباد ہو گئے تھے۔ یہ لوگ ہاتھ دیکھ کر قسمت کا حال بتاتے تھے اور مختلف ٹونوں ٹونکوں سے قسمیں بناتے بکاڑتے تھے۔ کیونکہ انڈونیشیا کے لوگوں پر ہندو مت کی توہم پرستی کا گمراہ اثر ہے اس لئے ان لوگوں کا کاروبار خوب چکا اور دوسروں کی قسمتوں کا حال بتانے والے اپنی قسمت بن گئے۔ ان کی موجودہ نسل بڑے بڑے عمدے اور کاروبار سنجالے ہوئے ہے۔ ان میں سے جناب عبدالرحمن اسلم تو اتنا کامیاب ہوا کہ صدر سکارنو کا دست راست بن گیا اور اسی جھنکے میں انڈونیشیا کا امیر ترین آدمی بھی بن گیا۔ خیریہ محنت اور قسمت کے کھلیل ہیں۔ گائیڈ کی اس افاریشن سے درویش اول بست خوش دکھائی دے رہا تھا۔ اور مجھے یقین تھا کہ وہ انڈونیشیا کے سفر میں ضرور کہیں نہ کیں ہاتھ دیکھ کر قسمت کا حال بتانے کا ڈھونگ رچائے گا۔

ہم لوٹ کر مردیکا چوک میں پہنچ گئے جہاں جکارتہ کا نیشنل مونیمنت، استقلال مسجد اور رومن کیتوک چرچ ہے۔ یہ تینوں جکارتہ کے لینڈ مارک سمجھے جاتے ہیں۔ سفید گنبدوں والی مسجد جنوبی ایشیا کی سب سے بڑی مسجد ہے۔ شکر ہے گائیڈ نے دنیا کی سب سے بڑی مسجد نہ کہہ دی، کیونکہ ہم پاکستانی بیج德 جنوبی قوم واقع ہوئے ہیں۔ ہماری ہر شے دنیا سے انوکھی ہوتی ہے۔ ہم ڈیم بنا سیں تو وہ دنیا کا سب سے بڑا ڈیم ہوتا ہے۔ ہم مسجد تعمیر کریں تو وہ دنیا کی سب سے بڑی مسجد ہوتی ہے۔ ہم سڑک بنا سیں تو وہ پرہائی وے کملاتی ہے۔ ہمارے لیڈر دنیا کے عظیم لیڈر ہوتے ہیں۔ پہاں تک کہ ہمارے جرنیل بھی صرف جرنیل نہیں ہوتے بلکہ فیلڈ مارشل ہوتے ہیں۔ خیر وہ سمجھدار لڑکی تھی۔ بڑے چھوٹے کے اس جھنکے میں ابھی بغیر ہی ہمیں نیشنل مونیمنت کی چلی منزل پر لے گئی۔ وہاں انڈونیشیا کی تاریخ بتائی گئی ہے۔ جدوجہد آزادی کے سمبل symbol پیش کئے گئے ہیں۔ اور صدر سکارنو کی آواز میں آزادی کا اعلان سنایا جاتا ہے۔ مونیمنت کے ۳۰ میٹر بلند میٹر پر جانے کے لئے ۷ لفٹیں لگائی گئی ہیں اور میٹر کی بلندی سے جکارتہ شرکے خوب نظارے ہوتے ہیں۔ گریٹر پر جانے کے لئے باقاعدہ پرست لیتا پڑتا ہے، جسے حاصل کرنے کے لئے پیشگی

رسٹوران کی مچھلیاں یقیناً لذیذ ہو گئی، کیونکہ مندر کنارے تک لگی سینکڑوں میز کر سیوں پر گاہک مورچے سنجالے بیٹھے تھے۔ درویش دوم میری درخواست پر غور فراہی رہا تھا کہ گائیڈ نے بھی اس رسٹوران کی تعریف کر دی۔ پھر کیا تھا درویش اول نے فوراً ”گاڑی روکنے کا حکم دیا اور ہم بھی دوسرے گاہکوں کے جھرمٹ میں کریاں سنجال کر بیٹھے گئے۔ درویش اول گائیڈ کے ہمراہ رسٹوران کے اندر اپنی پسند کی مچھلیوں کا آرڈر دینے چلا گیا۔ ویسے کھانے کا آرڈر تو ویٹر بھی لے رہے تھے۔ مگر اسے تو ہم دونوں سے نجات حاصل کرنے کا بہانہ چاہئے تھا جو اسے مل گیا۔ اتنے طویل انتظار کے بعد اتنا قلیل کھانا دیکھ کر مجھے غصہ تو آیا مگر میں مچھلی سے کائنے نکالنے میں الجھ گیا اور درویش اول گائیڈ کو کائنہ ڈالنے میں الجھا رہا۔

جکارتہ کے جنوب میں شرے کوئی دس کلو میٹر کے فاصلے پر ایک مصنوعی سیر گاہ بنائی گئی ہے جسے تماں منی انڈونیشیا انڈاہ یعنی محصر انڈونیشیا کہا جاتا ہے۔ یہ ملک کے ۲۷ صوبوں کی شوونڈو ہے۔ ایک مصنوعی جھیل میں انڈونیشیا کے اہم جزیروں کا نقشہ پیش کیا گیا ہے جس سے اس وسیع سلطنت کا جنوبی انداہ ہو جاتا ہے۔ پارک کے ایک کونے میں ساتھ ساتھ بنی ہوئی پانچ عبادت گاہیں تعمیر کی گئی ہیں جو انڈونیشیا کے مختلف مذاہب کی بھیتی کی مظہر ہیں۔ ان عبادت گاہوں میں ایک مسجد، ایک ہندو مندر، ایک بدھ مندر اور عیسیٰ نبی کے دونوں فرقوں یعنی رومن کیتوک اور پوڈشت کے کیسا واقع ہیں۔ ہماری گائیڈ بھی کچھ نہ ہیوں اور نسلوں کی مرکبی لگ رہی تھی۔ کیونکہ اسکے نقش و نگار پر تو کئی نسلوں کی چھاپ تھی۔ چکلے سیاہ بال اور بڑی بڑی آنکھیں کچھ ہندوستانی پاکستانی جھکلی دکھاتی تھیں۔ تابنے سی رنگت انڈونیشی تھی۔ چینی سی ہاں سے چینی ہونے کا گماں ہوتا تھا۔ دراز قاتمی یورپ سے چ رائی ہوئی لگتی تھی۔ اور چال چلن... خیر چھوڑئے اس سے ہم کو کیا لینا دیتا۔ وہ درویش اول کا مسئلہ تھا۔ ہاں البتہ ایک اور مسئلہ اس گائیڈ نے ضرور حل کر دیا۔ اور وہ ہوشیار پور کے ان لوگوں کے بارے میں تھا جو تقیریاً ”سو برس پہلے ہندوستان کے ضلع ہوشیار پور سے نکل کر

اللائع ضروری ہے۔ لیکن ہماری گائیڈ بڑے ہی کام کی شے تھی۔ اس نے کچھ جیپانی سیاحوں کا پرمث اپنے پاس رکھا ہوا تھا۔ چنانچہ اس نے وہی پرمث گارڈ کو دکھایا اور ہمیں لفت میں دھکیل دیا۔ خدا خبر کس کس نسل کے لوگ اس جیپانی پرمث پر سر کرچکے ہوئے۔ دراصل پرمث کی ضرورت بھی درویش اول جیسے لوگوں کی وجہ سے محسوس کی گئی ہوگی۔ کیونکہ اس بلندی سے خود کشی کے چانسروں کافی روشن ہیں اور حکومت نہیں چاہتی کہ ایک قومی یادگار پر ناکام لوگ اپنے خون کی بھینٹ چڑھائیں۔

یونیورسیل ٹورز کے میمبر نے ہورائیزن ہوٹل کے اوپن ایک ریستوران میں کھانے کا اہتمام کیا۔ درویش اول گائیڈ سے اور گائیڈ درویش سے نصیحتے۔ ادھر بُنس کا ضرورت مند میمبر ہم دونوں سے جکارتہ میں پاکستانی سیاحوں کی متوقع آمد اور انتظامات کے بارے میں اپنی رام کمانی چھیڑے ہوئے تھا۔ جھوٹے سے جھوٹا انسان بھی جھوٹ بول کر آکتا جاتا ہے۔ پھر ہم تو صرف درویش اول کے جھوٹ کی لاج رکھ رہے تھے۔ آخر کب تک؟ ”مگر خدا کا شکر ہے کہ ویٹر کی آمد سے ہماری جان خلاصی ہوئی“، جس نے غالص انڈونیشی پکوان ہماری میز پر سجا دیئے۔ سب سے پہلے ”گادو۔ گادو۔ سلاڈ چھیئی“، جو موگ چھلی کے مرکب سے بنائی جاتی ہے۔ اس کے بعد ”رینڈاگ“ Rendang اور ”اپورایام“ Oporayam پر ہاتھ صاف اور دانت تنیز کئے۔ مرغی اور بڑے گوشت کا یہ کھانا ہمیں تو کچھ عجیب سا لگا، کیونکہ دونوں ہی ناریل کے دودھ میں تیار کئے گئے تھے۔ ”محبوا“ تعریف کرنی پڑی جو ہم نے بہرحال دل کھول کر کی۔ اور اس تعریف کی سزا یہ ملی کہ میمبر صاحب نے اسی کھانے سے ہماری پلیش دوبارہ پُر کر دیں۔ خدا خدا کر کے کھانے سے جان چھڑائی اور منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے میٹھے پر منہ مارا۔ ”چندول“ Chendol وہاں کا خاص میٹھا ہے۔ مگر عجیب میٹھا ہے، کیونکہ نہ میٹھا ہے نہ پھیکا ہے۔ وہی ناریل کا دودھ جو مرغی میں شامل تھا میٹھے میں بھی موجود تھا۔ البتہ اس ریستوران کا پتلی تماشہ بہت پسند آیا۔ ”ویاگ“ کولت انڈونیشیا کا قدیم پتلی تماشہ ہے۔ جس میں پلیوں کے بجائے

کپڑے پر انکا سایہ دکھایا جاتا ہے۔ یہ پتلی تماشہ عام پتلی تماشے کی ماںند نہیں ہوتا بلکہ نہ بھی رسم کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ ان کا یقین ہے کہ تماشے کے دوران میں ہوئے لوگوں کی روح پلیوں میں آجائی ہے۔ اسی لئے تماشہ شروع کرنے سے پہلے اگر حق کی قسم کی کوئی خوبیوں سلگائی جاتی ہے۔ پھر پتلی تماشہ کرنے والا پلیوں کو کیلے کے درخت کے تنے پر سجایتا ہے۔ درخت کا تازیں کا تصور پیش کرتا ہے۔ اچھی روحوں کی نمائندہ پلیاں تماشہ دکھانے والے کے دائیں ہاتھ اور برائی کی نمائندہ باسیں ہاتھ پر ہوتی ہیں۔ گویا یہ خیر و شر کی علامت ہیں۔ پرانے زمانے میں تو ناریل کے تبل کا دیا جلا کر اسی کی روشنی سے پلیوں کا سایہ سکریں پر ڈالا جاتا تھا۔ مگر اب بتنی قلمی سے وہی کام لیا جانے لگا ہے۔ امید ہے کہ ایک دن ناریل کے دودھ کا دودھ کا بھی کوئی نہ کوئی بدل ضرور دریافت ہو جائے گا اور انڈونیشیا کے کھانوں کا ذائقہ کچھ نہ کچھ مختلف بن سکے گا۔ ”والاگ“ Dalang یعنی پتلی تماشہ کرنے والا تن تھا ہی سارا ڈراما لگاتا ہے۔ کھانی بھی وہ خود ہی سناتا ہے اور پلیوں سے ایکشن بھی خود ہی کرواتا ہے۔ سازندے ساتھ ساتھ بیک گراڈنڈ میوزک دیتے جاتے ہیں۔

بھلائی (خیر) اور برائی (شر) کی اس جگہ میں فتح یہیش بھلائی (خیر) کی ہوتی ہے۔ کم از کم فلمسی کھانیوں، ڈراموں اور پتلی تماشوں کی حد تک تو فتح یہیش خیر کی ہوتی ہے۔ حقیقت میں کیا ہوتا ہے۔ یہ ہم سب جانتے ہیں۔ کھانا بھی ختم ہوا پتلی تماشہ بھی تمام ہوا، مگر درویش اول کا تماشہ ابھی جاری تھا۔ اور اسکی سرشت میں بیٹھی بدی کا عمل بھی۔ مگر دونوں درویشوں کے احتجاج پر ”محبوا“ درویش اول کو کچھ حاصل وصول کئے بغیر ہی ہوٹل کو لوٹا پڑا۔ کیونکہ دوسرے ہی روز ایک طویل سفر درپیش تھا اور وہ سفر شروع کرنے سے پہلے طویل آرام کی بھی ضرورت تھی۔

گھنے جنگلوں، بزرہ زاروں، پہاڑیوں، ناریل اور پسیتے کے باغوں میں سے گزرتے ہوئے ہم صبح کے آٹھ بجے جگ جکارتہ پہنچے۔ یہاں ہمارا چوہیں گھنٹے مھرنے کا پروگرام تھا۔ جگ جکارتہ کو جوچہ بھی کہتے ہیں۔ یہاں ایک مشور یونیورسی ہے جہاں ہزاروں

طالب علم زیر تعلیم ہیں۔ اس شرکو طالب علموں کا شرکما جائے تو بے جانہ ہو گا۔ وہاں ہوٹل میں کمرہ لینے کے تو جگہ نہ تھی۔ ہم نے اصرار کیا تو مینجھر آگیا۔ اس نے کماکہ آپ کو اس وقت تو ایک کمرہ مل سکتا ہے مگر رات کو وہ کمرہ خالی کرنا ہو گا۔ ہم نے اس منطق کا سبب پوچھا، تو اس نے کماکہ دراصل یہاں کے ہر ہوٹل میں جنوبی سمندروں کی دیوی "ناھائی لارو کدائی" کے لئے کمرہ بک ہوتا ہے۔ جہاں دیوی رات گزارتی ہے۔ رات بھرا یرنٹشند کمرے میں دیوی کیا کرتی ہے؟ ان تھا لمبی راتوں میں دیوی کا کوئی ساتھی بھی ہوتا ہے یا نہیں؟ یہ ایسی باتیں تھیں جن کا ہوٹل کے مینجھر کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

دن کے وقت دیوی کے کمرے میں سامان رکھنا تو کوئی بدی بات نہ تھی۔ البتہ لمبی سیاہ رات میں دیوی کا ساتھ ہو تو کوئی بات بھی ہے۔

جو جہ میں انڈونیشی سلطانوں کے عالیشان محلات ہیں۔ ہندوؤں کے پرشکوہ مندر ہیں۔ جہاں دن رات کوئی نہ کوئی مذہبی تھوار جاری رہتا ہے۔ ان دونوں لاہوپان کا تھوار منیا جا رہا تھا۔ اس تھوار میں ہر سال آتش فشاں پاڑوں کو نذر آنے پیش کئے جاتے ہیں مگر وہ سال بھر انپنے آتشیں مارے کو اپنے اندر سمئے رکھیں۔ صدر سوکارنو کے دور میں جب کمیونٹوں کا انقلاب دبایا گیا تو اس علاقے میں ایک ہی مقام پر پانچ ہزار لوگوں کو قتل کیا گیا تھا۔ ہوٹل میں کمرہ نہ ملنے کے سبب ہم نے سورا باجا کی طرف سفر شروع کر دیا۔ راستے میں دونوں جانب چاولوں کے کھیت تھے۔ انڈونیشیا میں ایک سال کے اندر چاول کی دو فصلیں کافی جاتی ہیں۔

گو سورا باجا پہنچنے تک ہم لوگ بت تھک چکے تھے مگر فوراً ہی بس میں سوار ہوئے اور جزیرہ بالی کی طرف سفر شروع کیا۔ یہ جزیرہ وہاں سے دو سو میل دور تھا اور ہم لوگوں کو دن کے اُجالے میں ہی جاوا کے جنوبی شریبانیوائی Banyuwangi پہنچنا تھا۔ رات اڑھلے اس سکھنے جنگلوں والے راستے سے گزرتے ہوئے ہنگلی بانوؤں اور انسانی درندوں (راہزنوں) کے جملے کا خطروہ ہوتا ہے۔ راہزنوں کا نام سن کر دردش

اول تمام راستے "جل تو جلال تو" پڑھتا گیا۔ رات گیلی مانک میں برکی۔ صبح جزیرہ بالی میں پہنچنا تھا۔

شپنگ کا بوجھ درویش دوم کے لئے گناہوں کا بوجھ بن گیا، جس سے نجات مشکل تھی۔ ہوائی سفر کی بات الگ ہے، مگر جہاں ریشوں اور بسوں کا سفر ہو وہاں یا تو وہ اپنا بھاری بھر کم جسم سنجاتا اور یا شپنگ کی شامت اعمال۔ چنانچہ اس نے بھی اپنا وزنی دوٹ درویش اول کے حق میں دیا اور ان دونوں نے فیصلہ کیا کہ آئندہ اب بطور بننے کی ضرورت نہیں، صرف ہوائی جہاز سے سفر ہو گا۔ مگر جزیرہ بالی کے دار الحکومت ڈپنپسar Denpasar تک تو بس میں سفر کرنا تھا۔ لہذا جوں ہی سورج نے آگے کھوئی درویشوں نے گلی مانک Gilimanuk کی بندراگاہ کا رخ کیا۔ آگے آگے درویش اور پیچھے پیچھے نک دھرنگ پچوں کا بھوم تھا۔ ایک ایک سوت کیس کو چار چار پیچے چیونٹوں کی طرح چھٹے ہوئے تھے۔ کئی کام چور تو صرف لوگوں کر شہیدوں میں شامل ہو رہے تھے مگر کرایہ وصول کرتے وقت برابر کے حقدار بن سکیں۔

فیری میں سوار ہوئے تو نہیں منے قلیوں کے بھوم نے سکون سے بھری مٹھیاں ہلا ہلا کر ہمیں الوداع کما اور باریک باریک آوازوں میں "سلامت جلان سلامت جلان" (سفر بھیر) کے نعرے بلند ہوئے۔ ایسی پر خلوص الوداع تو کبھی نصیب نہ ہوئی تھی۔ ادھرنی نویلی کشتی کے ملاح نے اپنی شکستہ انگریزی کی اصلاح کرنے کا نادر موقع جانا۔ اور آبائے بالی Bali Strait کے بارے میں ایک صدیوں پر اتنا قصہ بیان کرنا شروع کیا۔ طوطے کی طرح رنے ہوئے فقروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ سیاہوں کو الوبانے کیلئے وہ یہ کمانیاں اکثر سناتا ہو گا۔ حالانکہ ہمیں بنانے کے لیے کمانی سنانے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ اس نے رازدار انہلیوں بتانا شروع کیا کہ ایک دفعہ جاوا کے بادشاہ نے اپنے باغی بیٹیے کو ملک بدر کر کے اس علاقے میں سزا کے طور پر بھیج دیا۔ اس کے ہمراہ سات ساتھی اور سات دن کا راشن بھی میا کر دیا۔ اس زمانے میں جزیرہ بالی اور جاوا خشکی کے راستے آپس میں ملے ہوئے تھے۔ شہزادے نے اس مقام (مالح) پر

جانتے ہیں۔

سرک کے دائیں جانب ساحل سے نکراتی بحر انڈو نیشیا کی لمبیں اور بائیں جانب ہوا میں جھوٹتے ناریل کے پیڑ۔ پیڑوں کے پیچھے چالوں کے کھیت اور کھیتوں کے پیچھے سربرز پہاڑیاں۔ پہاڑیاں، کھیت، پیڑ، پیڑوں کے جھرمٹ میں چھوٹے گاؤں، بائیں اور لکڑی کے گھر، انسانوں کے گھر، بھگوانوں کے گھر، دیوتاؤں اور دیویوں کے گھر، مندر اور مندر کی بچاریں۔ ان پچارنوں کا ذکر تو بعد میں ہو گا ابھی تو سرمی گھٹاؤں نے موسم میں نشہ بکھیر دیا تھا۔ آسمان سے گرتی بوندوں نے جسموں میں آگ لگا دی تھی۔ ان سلگتے انگاروں کو بچانے کے لئے جوان جسموں نے کپڑوں کو خیز باد کہا۔ سرمی گھٹاؤں میں سیاہ زلفوں پر برسنے لگیں۔ سیاہ زلفیں سنہری جسموں پر بکھرنے لگیں۔ بارش میں بھیگتی جوانیاں شو خیاں کرتی دھان کے کھیتوں اور کیلے کے باغوں میں او جھل ہو گئیں۔ ناریل کے پیڑ میں جھوم رہے تھے۔ ہماری بس منزل کی طرف روای دوال تھی۔

بس ایک چھوٹے سے قبیلے میں رکی۔ سرک کے دونوں جانب بائیں اور ناریل کے پتوں سے بینی چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں۔ ان دکانوں پر دکاندار عورتیں اور زیادہ تر گاہک بھی عورتیں ہی تھیں۔ بالی میں روز مرہ کی زندگی میں خواتین کچھ ایسی کثیر تعداد میں دکھائی دیتی ہیں کہ وہاں کا ہر بازار میانا بازار معلوم ہوتا ہے۔ ادھر بس پر خوانچہ فروشوں نے باقاعدہ اور مسافروں نے بے قاعدہ حملہ کر دیا۔ اس منزل کے مسافر اتنے بھی نہ پائے تھے کہ دوسرے مسافر بس میں رونق افروز ہو گئے۔ ان نوادروں کی کہنیوں سے آنکھ اور ناک کو محفوظ رکھنا بڑی ہنرمندی کی بات ہے۔ مسافروں نے بس کے اندر کچھ سکون کا مظاہرہ کیا تو خوانچہ فروشوں نے اپنی کرخت آوازوں سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ ان نو خیز تاجریوں کے قدارتے چھوٹے تھے کہ بس میں بیٹھے ہوئے یا تو ان کی آوازیں سنائی ویتیں یا ایک ہاتھ میں خوانچہ اور دوسرا پھیلا ہوا ہاتھ دکھائی دیتا۔ تاکہ گاہک خوانچے سے سامان اٹھائے تو تاجر کا پھیلا ہوا خالی ہاتھ بھی بھردے۔

ایک اونچی سی چنان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا) پر سات دن کا چلہ کاٹا۔ ساتویں رات سمندروں کی دیوی نے اس کی فریاد سن لی۔ اس علاقے میں بہت بڑا طوفان آیا۔ اس چنان کے علاوہ تمام علاقہ زیر آب آگیا۔ صبح جب طوفان کا ذور تھا تو جاؤ اور بائی کے درمیان خشکی کا راستہ ختم ہو چکا تھا۔ ملاح کی کمائی ختم ہوئی تو ہمارا سفر بھی ختم ہو گیا اور ہم جزیرہ بائی کے ساحلی قبیلے گلی ماںک میں اتر گئے۔ کچھ اسی سائز کے ساتھی ہمارا انتظار بھی کر رہے تھے، جیسے ساتھیوں نے ہمیں الوداع کی تھی اور رخصت کیا تھا۔ فیری کا تھمنا تھا کہ اس ننگ دھڑک فوج ظفر مونج نے ہلہ بول دیا۔ اور چند ہی لمحوں میں ہمیں ڈنپر جانے والی بس میں دھکیل دیا۔ بس کے ارد گرد بنی ہوئی تصویروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ بس کا ڈرائیور بڑا رنگیں مزاج ہے۔ بس کے اندر اور باہر کچھ ایسی ہی تصویریں بنی تھیں جیسے ہمارے ہاں رکشوں اور ٹرکوں پر بنی ہوتی ہیں۔ ادھر ادھر کچھ فقرے بھی لکھے تھے جنہیں میں پڑھ تو نہ سکتا تھا مگر ان تصویروں کو دیکھ کر ان تحریروں کا اندازہ لگایا تو کچھ ایسا لگا: اچھا دوست پھر ملیں گے، خیر نال جاتے خیر نال آ، ہارن دو راستے لو، وغیرہ۔ بس میں سیٹوں پر دو دو مسافر ساتھ بیٹھے تھے چنانچہ ایک طرف درویش دوم کے ماتھیں بیٹھے گیا۔ میں نے تو صرف گزارا ہی کیا بیٹھا نہیں۔ کیونکہ درویش دوم نے پوری سیٹ پر اپنا خوبصورت جسم پھیلایا ہوا تھا۔ درویش اول کے ساتھ ایک خاتون تھیں اور ان خاتون کے ساتھ ایک خوبصورت سا بچہ تھا۔ جب روتا تو با آواز بلند روتا اور لگا تار روتا۔ خوشی کا مظاہرہ بھی کھلے بندوں کرتا، کبھی بال نوچتا کبھی کپڑے چھاڑتا اور کبھی ہاتھ پاؤں فری شاکل میں لرتا۔ اس نے مجہد کی کارستانیاں صرف ماں کی گود تک ہی محدود نہ تھیں بلکہ درویش اول کی حدود کی خلاف ورزی بھی کرتا۔ جماں تک بال نوچنے کا تعلق ہے درویش اول محفوظ تھا۔ البتہ اس کے کپڑوں پر بار بار حملہ ہوتا۔ ان حملوں میں مجہد کی ماں ہی نہیں بلکہ بس میں بیٹھے ہوئے دوسرے مسافر بھی اس کو داد دے رہے تھے۔ مسافروں کے دراز جبڑوں کو دیکھ کر مجروراً درویش اولی کو بھی مکرانا پڑتا۔ گمراں کے دل پر جوبیت رہی تھی وہ تم ہی

ڈرائیور نے بونٹ اٹھا کر اپنے ہاتھ منہ کالے کئے اور پھر نیکی میں بینڈ کر مجھے ہینڈل گھمانے کا اشارہ کیا۔ میں نے کچھ بچکا ہٹ کی تو درویش اول نے کما "یار وقت ضائع نہ کرو۔ بہت تھکے ہوئے ہیں۔" چنانچہ میں ہینڈل گھمانے لگا اور گھما گھما کر ہلکاں ہو گیا۔ خدا خدا کر کے بڑی بی کی رگوں میں پڑوں نے جو دورہ شروع کیا تو اس کا پورا انجر پتھر بننے لگا۔ ہم اسی طرح ہلتے ہلاتے "ساحل سور" کی جانب سفر کرنے لگے۔ کوئی چھ صدی پہلے انڈو نیشیا ایک ہندو ریاست تھی۔ پھر گجراتی تاجروں کے ذریعے اسلام انڈو نیشیا میں پہنچا تو وہاں کے لوگوں نے اسے قبول کیا۔ اسلام اس شدت اور تیزی سے مقبول ہوا کہ وہاں کے ہندو راجاؤں کا اثر ختم ہوتے ہوتے جزیرہ بالی میں سست کر رہ گیا۔ مسلمانوں نے بھی اس جزیرہ کے باسیوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ جزیرے میں ہندو مذہب پروان چھتا رہا اور مذہب کی سرپرستی میں فنونِ لطیفہ، جن میں رقص و موسیقی، مجسم سازی اور آرٹ بھی شامل ہیں پروان چھتے رہے۔ یہاں تک کہ پورا جزیرہ ایک خوبصورت عجائب گھر کی صورت اختیار کر گیا۔ وہاں کا ہندو مذہب بھی خوبصورت رسم و رواج کا اچھوتا اور حسین نمونہ بن گیا۔ ۷۴۵۹ء عیسوی میں ڈچ ملاح جزیرہ میں پہنچے اور یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ علاقے میں بڑی دلکشی ہے۔ جماز کے کپتان نے واپسی کے لیے جب جماز کے لنگر اٹھائے تو آدمی ملا جو نے جزیرہ چھوٹنے سے انکار کر دیا۔ جماز کے کپتان نے وہاں کے راجہ سے مدد کی درخواست کی۔ راجہ نے اپنے محل میں ملا جوں کی شاندار دعوت کی۔ ملا جوں کو محل تک لانے کے کئے راجہ کی خاص بکھی استعمال کی گئی جسکو سفید بھینے کھینچتے تھے۔ پھر یورپی مہمانوں کی میزبانی پر راجہ کی دو سو یویاں مامور تھیں، مساوائے منظور نظر یوی کے۔ راجہ کی قربت سے محروم دو سو یویاں نے ڈچ مہمانوں کی بھرپور میزبانی کی۔ جس کے نتیجے میں ملاح راجہ کی بات نہ تال کئے اور اپنے کپتان کے ہمراہ وطن لوٹ گئے۔ مگر جزیرہ بالی کی محبت کے نقوش اپنے دلوں سے نہ مٹا سکے اور ۱۸۳۶ء میں جب وہ یہاں دوبارہ لوٹ کر آئے تو یہاں سے کبھی نہ جانے کے لئے لوٹ کے آئے۔

کئی ہاتھ خوانچوں کے بغیر بھی پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے پاس بیچنے کے لئے ان کی غربت اور افلas کے سوا کچھ نہیں تھا۔

ڈنپسرا جانے والی شاہراہ صرف سڑک کا کام ہی نہیں دیتی بلکہ اس پر سے مذہبی جلوس بھی گزرتے ہیں۔ جب کوئی فوت ہو جائے تو اس کا جنازہ بھی وہیں سے گزرتا ہے۔ جب گاؤں میں کوئی کھیل دکھانے والا آئے تو سڑک کو تھیڑ کی جگہ استعمال کیا جاتا ہے اور شام کو سڑک چوپاں بن جاتی ہے اور اس پر لوگ بینڈ کر گئیں ہاتھتے ہیں۔ صرف انسان ہی نہیں بلکہ حیوان بھی سڑک سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ "ملا" گائیں بڑی شان بے نیازی کے ساتھ سڑک پر مڑگشت کرتی دکھائی دیتی ہیں جب تک ان کا موڈ ہو وہ سڑک پر بلا علف گھوم سکتی ہیں۔ ان کا جسم اور مزاج تو ہمارے ہاں کی بڑے گھرانوں کی بیگمات جیسا ہوتا ہے۔

دوپر ڈھلنے ہماری بس ڈنپسرا شر میں سوی کے اڈے میں رکی۔ جماز کے حالات ہمارے ملک کے بس کے اڈوں سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھے۔ وہی شور شرابا اور وہی غلاظت۔ سواریوں کی بھیڑ اور کنڈکڑوں کی کھینچا تانی۔ بس سے اتنے والے ہی تھے کہ درویش اول کے معصوم سفر نے الوداعی حملہ کیا، جو بھرپور بھی تھا اور کامیاب بھی۔ درویش اول کی سکنی اسکی جیب سے نکل کر معصوم سافر کی مشی میں تھی اور نئے نئے بچے کی مشی بڑی مضبوط ہوتی ہے۔ درویش اول نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اپنی سکنی چھینے کی کوشش کی تو اس عیار بچے نے مشی تو بند ہی رکھی مگر جبڑے کھول لئے اور اس زور سے دھاڑا کہ سب مسافر چونک گئے اور بیچارہ درویش اول کھیانا سا ہو کر بس سے اتر گیا۔ درویش دوم نے اسکے زخموں پر نمک چھڑکنے کی غاطر اپنی کرخت آواز میں گنگناٹا شروع کیا۔ "نئے نئے بچے تیری مشی میں کیا ہے...."

درویش اول نے جو پہلی نیکی دیکھی اسی میں اچک کر بینڈ گیا۔ وہ کوئی بیس سال پر اپنے ماڈل کی گاڑی تھی۔ ڈرائیور نے گاڑی شارٹ کرنے کے لئے ہینڈل ٹھہرایا۔ سن رسیدہ انہیں نے کچھ دیر گریہ وزاری کی پھر بچکی لے کر خاموش ہو گیا۔

بات تھی۔ کیونکہ ہمارے ملک کے اکثر زن مرد قسم کے مرد حضرات بھتیوں کے ساتھ تو پوری پوری عمر گزار دیتے ہیں۔

خیر بھوتوں سے ملاقات تو رات کی بات تھی ابھی تو دوپر ہی ڈھلی تھی اور مجھے دونوں درویشوں کے ہمراہ ساحل پر جانا تھا۔ جہاں دھوپ میں جسم جلاتے (ٹین کرتے) گوری جل پر یوں کو دیکھنے کا اشتیاق تھا۔

ہم اپنے بھوت بیگنے سے نکل کر سیدھے ساحل پر پہنچے۔ حد نظر تک پھیلی ہوئی شہری ریست اور نیلگوں سمندر۔ ریست پر لوٹتے جو ان بدنوں کے نشان۔ اور ان نشانوں کو چھوٹنے کے لئے سمندر کا مدد جزر یعنی مسلسل آنا اور مایوس ہو کر لوٹ جانا۔ ناریل، کے پیڑوں کا جھومانا اور پتوں کی سرگوشی۔ ہر سو خاموشی ہی خاموشی۔ پھر شور اٹھا۔ ہم چونکے۔ اور دیکھا۔ کچھ نوجوان ساحل کی جانب لپکے۔ ان کے پاس پنکھیں تھیں۔ بڑی بڑی پنکھیں۔ کوئی چالیس فٹ لمبی اور بیس فٹ چوڑی، جنہیں چھ چھ نوجوانوں نے اخہار کھا تھا۔ پھر ایسی پنکھوں کو اڑانے کے لئے ”بُوئے کی ری“ کی طرح ڈور بھی تو دراز چاہئے۔ جو ان نوجوانوں کے پاس تھی۔ بلکہ کئی نوجوانوں کی ٹولیوں نے فیلی سائز پنکھیں اور شیطان کی آئت ہی ڈوریں اخہار کھی تھیں۔ بالی میں بعد از نماز ظہر ساحلوں پر شہری جسموں کی جگہ بنت رنگ بج جاتے ہیں۔ کیونکہ پنگ رنگ کے سامنے دنیا کے سب رنگ ماند پڑ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ درویش اول جیسا رنگیں مزاج درویش بھی شہری جسموں کو بھول کر پنکھوں کے رنگوں میں مست ہو گیا۔ اور پنگ بازی میں استقدار کو گیا کہ بلا خوف و خطر سمندر میں گھس گیا۔ حالانکہ پانی سے اس کے ایسے ہی تعلقات تھے جیسے گنجے کے تعلقات استرے سے ہوتے ہیں۔ اس پنگ بازی میں شرکت کے لئے بالی میں ہر عمر اور ہر نسل کے لوگ آتے ہیں۔ نوجوان صرف پنگ اڑاتے ہیں اور بالی لوگ شر میں لگاتے ہیں۔ جو جیت جائیں وہ جشن مناتے ہیں اور جو ہار جائیں وہ غم مٹاتے ہیں۔ مگر دونوں کاموں کو پورا کرنے کے لئے شراب بھی چاہیئے اور شباب بھی، جبکی اس جزیرے میں کوئی کی نہیں۔ جب آسمان

ڈینپر اگرچہ کوئی ایک لاکھ کی آبادی کا شہر ہے، مگر شور و شرب اس قدر زیادہ اور ٹریک اس قدر گھٹتا ہوتا ہے کہ وہاں رات کوٹ بدل بدل کر ہی گزارنی پڑتی ہے۔ اسی لئے ہم نے ساحل سمندر میں قیام کا فیصلہ کیا تھا۔ مگر بہت سے دوسرے فیصلوں کی طرح اس فیصلے میں بھی میری مرضی شامل نہ تھی۔ کیونکہ ہم تو جہاں چاہیں اور جب چاہیں سو سکتے ہیں۔ اصل مسئلہ تو درویش اول کا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ساحل پر سیاحوں کے ہجوم ہونگے اور ہجوم بھی رنگ برلنگے۔ بھلا وہ ان رنگینیوں سے دور کیوں کر رہا سکتا تھا۔ چنانچہ ہم نے ایک بیکھر کرائے پر لیا۔ جو ہوٹل کے مقابلے میں نہایت ارزان بھی تھا اور آرام دہ بھی۔ البتہ وہاں ہوٹل والی کھانے پینے کی سولتیں فراہم نہیں ہوتیں۔ صرف ناشتے کا بندوبست ہوتا ہے۔ اور کم بخت ناشتے کے انتظار میں ابھی اخہار کھٹھٹے حائل تھے۔ پھر ناریل کے جنگل میں گھرا ہوا یہ بیکھر بھی کچھ بھوت بیکھر نہ زیادہ تھا۔ جہاں دن دہاڑے بھی رات کا سامان تھا۔ سامان اٹھا کر اندر پہنچ تو درویش اول نے مجھے علیحدہ کمرہ الاث کیا اور وہ دونوں ایک ہی کمرے میں قیام پذیر ہوئے۔ پورے سفر میں یہ پلا موقع تھا کہ مجھے الگ کمرہ دیا گیا۔ حالانکہ یہی پلا موقع تھا کہ مجھے خراںوں والے درویش دوم کے کمرے میں سونے پر بھی اعتراض نہ تھا۔ کیونکہ اسکے خراںوں سے تو بھوت بھی پناہ مانگتے ہوئے۔ گوییے تو ہم ماشاء اللہ بڑے ہی بہادر واقع ہوئے ہیں۔ شیر، چیتوں سے اکثر مذہ بھیز ہو جاتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ پنجرے کے اندر بند ہوتے ہیں اور سرم پنجرے کے باہر۔ کیونکہ جب سے ہوش سنبھالا ہے ہم نے تو اپنے ملک میں یہی کچھ دیکھا ہے کہ جو ووٹ سے آتے ہیں وہ سنبھال لیتے ہیں اور جو سمجھیں سے آتے ہیں وہ جموروں کا نعروں گا دیتے ہیں۔ مگر بونے کم بخت دونوں نہیں دیتے۔ شاید اسی لیے ہمیں حکمرانوں اور بھوتوں سے بہت خوف محسوس ہوتا ہے۔ کیونکہ دونوں ضرب لگاتے ہیں مگر دکھائی نہیں دیتے۔ ویسے جس کمرے میں مجھے مٹونسا جا رہا تھا اس میں تو شیر کا پچھہ بھی آنکھیں بند کر کے ہی سوتا۔ کیونکہ وہ کمرہ یقیناً بھوتوں کی آرام گاہ بھی ہوتا تو الگ

سرخی مائل ہوا، سمندر پر سیاہی چھانے لگی تو سب لوگوں نے ساحلوں پر بی بی رنگیں بستیوں کا رخ کیا۔ جہاں بو تکوں میں بند بھوت پیانوں میں سانے لگے۔ مغربی موسمیقی پر تمہرکے ہوئے مشرقی جسم، بو تیک لبادوں سے باہر آنے لگے۔ ساحلوں کی راتیں بڑی آزاد ہوتی ہیں، جہاں قوموں اور نسلوں کا امتیاز ختم ہوجاتا ہے صرف چہرے پہچانے جاتے ہیں اور جسم تولے جاتے ہیں۔ جسموں کے قول میں تو یقیناً درویش دوم اور درویش اول پوری کائنات سے بھاری تھے۔ چنانچہ ہم بھی ایسے ڈسکو میں گھس گئے جہاں انسانیت کے نقاب ہٹا کر انسان اپنی ابدی درنگی پر اترے ہوئے تھے۔ دھمی روشنی نے سب عیب و گناہ اپنے دامن میں چھپا رکھے تھے تاکہ لوگ رنگ رلیاں منا سکیں۔ ہم اس رنگ کے سگ بختے ہی لگے کہ درویش دوم نے میرے کان میں سرگوشی کی جس سے میں سیاہ پوش ہو گیا۔ دراصل مجھ سے مشورہ کئے بغیر ہی دونوں درویشوں نے ایک پتنگ باز پر شرط لگائی اور قسمت کے یہ دھمی وہ شرط ہار گئے۔ جس کی کو پورا کرنے کے لئے ان دونوں نے خوراک پر راشن لگا دیا اور میں شام ڈھلے ہی صبح کے ناشتے کا انتظار کرنے لگا۔

میرا کمرہ اس بھوت بنگلے کے بالکل عقب میں تھا۔ جسکا دروازہ ایک ویران برآمدے میں کھلتا تھا اور کھڑکی ناریل کے جنگل میں۔ اس سے بہتر بھوتوں کی قیامت گاہ (یعنی اقامت گاہ) بھلا اور کیا ہو سکتی تھی؟ چنانچہ جب ڈسکو سے نکلے تو میں بھوتوں سے ملاقات کے لئے بالکل تیار تھا۔ مگر وہاں پہنچنے تو رنگ ہی کچھ اور تھا۔ ہماری غیر موجودگی میں دو آسٹریلیین سیاح لڑکیاں میرے سامنے کے کمرے میں ٹھرا دی گئی تھیں۔ جو ویران برآمدے میں کریاں جائے اور محفل سجائے بیٹھی تھیں۔ ایسی درباڑ پڑوںیں ہوں تو بھوتوں سے بھلا کون ڈرتا ہے؟ مگر ہم نے انکو بھوتوں سے باقاعدہ ڈرایا۔ بھوتوں کے قصے سنائے اور چڑیوں کی دہشت طاری کی۔ ہم نے اپنے مخصوص انداز میں سب قصے ایسے مستند انداز میں سنائے گویا چڑیوں ہماری فرشت کزن ہوں۔ پھر کیا تھا بالی کی سیاہ رات تھی اور آسٹریلیین لڑکیوں کا ساتھ تھا۔ ناریل کا پتا جھومتا تو

وہ سم جاتیں۔ کتنا بھونکتا تو وہ سمت جاتیں اور ہم انکو تملی دینے کے لئے ان سے لپٹ جاتے اور وہ آپس میں لپٹ جاتیں۔ رات بھر ناریل بھی جھوٹے رہے۔ کتنا بھی بھونکتے رہے۔ خوف بھی طاری رہا اور ہم بھی۔۔۔

صحن ناشتے کی میز پر درویش اول نے زیر لب مکراتے ہوئے پوچھا۔ ”کو میاں رات تو آرام سے گزری؟۔۔۔ بھوت۔ چڑیوں نے تو نہیں بھک کیا؟“ ”بھوت تو نہیں البتہ دو چڑیوں ساری رات چھٹی رہی تھیں“۔۔۔ میں نے ناشتہ جاری رکھتے ہوئے کما۔۔۔ ”ہو سکتا ہے وہ اب ناشتہ کرنے بھی آئیں؟“ ”جس پر درویش دوم نے زور دار قبھہ لگاتے ہوئے کما۔“ ”یار تم پر تو واقعی چڑیوں کا سایہ ہو گیا ہے۔۔۔ اس کو اتارنے کے لئے تو تمہیں سرخ مروچوں کی دھونی دینی پڑے گی“۔۔۔

درویش دوم ابھی فقرہ مکمل بھی نہ کر پایا تھا کہ وہ چھپل چڑیوں ناشتہ کرنے واقعی پہنچ گئیں۔ جنہیں دیکھ کر دونوں درویشوں نیم پاکل سے ہو گئے۔ گویا دونوں پر چڑیوں کا اثر ہو گیا ہو۔ اور اب میں نے کما ”تم دونوں ٹھیک ہوتے ہو یا چڑیوں کا سایہ اتارنے کے لئے سرخ مروچوں کی دھونی دینی پڑے گی؟“۔ وہ دونوں دیے تو ٹھیک ہو گئے مگر جزیرہ بالی کی سیر کا منصوبہ کینسل کر کے ان آسٹریلیین درویشینوں کے ساتھ ساحل پر دن گزارنے کو تیار ہو گئے۔ جن کے ساتھ رات گزر سکتی ہے بھلا ان کے ساتھ دن گزارنے میں کیا مشکل تھی۔ چنانچہ ساحل پر دن گزارنے کی تیاری شروع کی، جس میں ایک بست بڑی دشواری تھی۔ ساحل اور سمندر پر دن گزارنے کا ایک مخصوص لباس ہوتا ہے۔ گواں لباس میں کپڑے کا استعمال تو کم ہی ہوتا ہے البتہ نہ زیادہ ہوتا ہے۔ اور وہ لباس ہم تینوں کے پاس تھا نہیں۔ مگر ساحل پر جانا بھی لازمی تھا اور سونگ کا سیٹیوم خریدنے پر بھی نہیں خرچ کرنا چاہتے تھے، بلکہ محدود بجٹ میں اتنی سکت بھی نہ تھی۔ چنانچہ اس سفر میں پہلی مرتبہ تینوں درویشوں میں کسی بات پر کلی اتفاق ہوا تو وہ یہ تھا کہ ہم نے سنجیدگی سے غسل کا لباس ایجاد کرنا شروع کیا۔ درویش اول نے اپنی قیمت اتار دی اور ایک بھک سی پتلون چڑھائی جس کو چڑھانے

اگر وہ کھل کر سانس بھی یہ گاتا اسکی تھک پتلون کھل جائے گی اور اگر پتلون کھلے گی تو اس کے سب بھید کھل جائیں گے۔ ادھر درویشیوں کو کوئی بھید چھانے کی فکر نہ تھی۔ چنانچہ وہ ساحل پر بیٹھتے ہی سمندر میں کوڈ گئیں اور ہم تینوں ساحل پر کھڑے کے کھڑے ہی رہ گئے۔ اور یونہی ان دونوں آسٹریلیین درویشیوں کو سمندر میں تیرتے اور ساحل پر لوٹتے دیکھ دیکھ کر دون گزنا دیا۔

شام ہوتے ہی درویش اول نے میرے کمرے میں پڑاؤ ڈال دیا۔ مجھے کہہ چھوڑنے کو تو وہ ہرگز نہیں کہہ سکتا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ میں لڑنے مرنے پر بتار ہو جاؤں گا۔ چنانچہ اس نے درویش دوم کے خوفناک خراںوں کا بہانہ بنا کر میرے کمرے میں سونے کی خواہش ظاہر کی جو میں نے بادل نخواستہ قبول کر لی۔ دیے بھی دو درویشیوں کے لئے درویش بھی دو ہی چاہیے تھے۔ لہذا اس کی آمد سے مجھے بھی کچھ حوصلہ سامل گیا اور ہم دونوں نے ان دونوں کو بہوت کہانیوں کے جال میں پھنسانے کی سکبیں بنانی شروع کر دیں۔ درویش اول نے تو آخری حربے کے طور پر دست شناسی پر ہاتھ روائی کرنے کا منصوبہ بھی بنا لیا۔ اور مجھے یقین تھا کہ درویش اول جیسے عیار کے سامنے وہ یقیناً ہتھیار ڈال دیں گی۔ ہم دونوں نے اپنی اس یقینی کامیابی پر جشن تک منا لئے۔ مگر ان دونوں کا کرہ بھی بند تھا اور ہتھ بھی گل تھی۔ ”خدا خبر کیا رہ گئیں؟ ساحل سے تو سیدھی ادھر ہی آئیں تھیں۔“ میں نے درویش اول سے سوال کیا۔ سمندر میں تیرتے تھک گئی ہو گئی اس لئے آرام کر رہی ہیں۔ اچھا ہے جتنی دیر سے اٹھیں گی اتنی ہی تازہ دم ہو گی۔ درویش اول نے مجھے تملی دیتے ہوئے کہا۔ مگر مجھے ذرہ بھر تملی نہ ہوئی، بلکہ بے چینی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ ادھر درویش اول کو پورا یقین تھا کہ گیم ہمارے ہاتھ میں ہے اور اسی بھروسے پر آدمی رات گزار دی اور آخر تھک ہار کر لیٹ گئے۔ مگر۔

ہر آہٹ پر چوکے ہم، جاگ کے ساری رات کئی  
آنے والی سو گئیں جانے، کس کے پلو رات کئی

میں ہم دونوں نے بھی اسکی مدد کی۔ پھر اس پتلون کے پائیچے ٹھنڈوں تک اوپر کو موڑ لئے۔ درویش دوم نے یہی سلوک اپنی شلوار کے ساتھ کیا۔ مگر قیص نہیں اتاری جو ہم دونوں نے زبردستی اتار دی۔ درویش دوم نے مجھے اپنی نیک ادھار دیدی جو پہنچتے ہی میری ٹانگوں پر غرارہ ہی بن گئی۔ فرق صرف یہ تھا کہ ازار بند کی جگہ میں نے پہنچی باندھ رکھی تھی۔ ہمارا یہ ملبوس اس قدر مٹھکہ خیز تھا کہ ہم ایک دوسرے سے بھی شرمدہ ہو رہے تھے اور خود اپنے آپ سے بھی شرمدار تھے۔ اور اسی شرمدگی کے سب کمرے سے باہر قدم رکھنے کی ہم میں ہمت نہ ہو رہی تھی کہ آسٹریلیین درویشیوں نے آواز دی، جس پر ہم تینوں لبیک کمک باہر نکل آئے اور اپنا حلیہ بھول کر ان کو ٹکلتے رہ گئے۔ صاحب لباس ہو تو انسا اور اس لباس کے لئے جسم بھی ہو تو انس۔ آسٹریلیین لڑکیوں میں نسوانیت تو قدرے کم ہی ہوتی ہے مگر جسم و جسامت بھرپور ہوتی ہے۔ یہی حال دونوں درویشیوں کا تھا۔ ہر ایک کا جسم اکٹھا ٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا۔ جہاں ہمیں اگر رات کو پہنچے چل جاتا تو یہ بھوکا بھوکا بھوت بلا لیتے۔ بھٹلے درویش دوم کو ہی لانا پڑتا۔ آگے آگے درویشیاں اور پیچھے پیچھے ہم۔ ان کی چال قیامت کی چال تھی اور ان کی چال دیکھ کر ہم اپنی چال بھی بھول گئے۔ کیونکہ خود ساختہ لباسوں نے اپنی جگہ ہم تینوں کے لئے مشکل پیدا کر دی تھی۔ مثلاً ”میری غرارہ نما نیکر بیٹھنے کے باوجود قدم پر نیچے گرتی چلی جا رہی تھی۔ اور اگر اس نیکر کو اپنی گرفت میں نہ رکھتا تو کھلے ساحل پر یقیناً اون پیر کیرے بن جاتا اور لوگ ”پاگل ای اوے... پاگل ای اوے“ کے نغمے لگاتے۔ پھر دنیا میں لباس تو بنا ہی اس لئے ہے کہ انسان اپنے جسمانی معافی چھپا سکے۔ بھلا میں اس غرارہ نما نیکر میں اپنی شکر قدی جیسی ٹانگیں کیسے چھپاتا؟ بھالو جسامت درویش دوم تو قدری پیس سوٹ میں بھی بھالو گلتا تھا۔ اس کے بدن پر اگا ہوا بالوں کا جنگل بھلا اکیلی شلوار میں کیوں نکر ساتا۔ ظاہر ہے ایسے لوگ جنگلوں میں تو ساکتے ہیں ساطھوں پر نہیں۔ رہا تھک پتلون میں جکڑا درویش اول تو اسکی جاپانی کھلوٹے والی چال ہی بدل گئی۔ کیونکہ اس پر خطہ لاحق تھا کہ

بُلگے سے سامان سمیٹا اور اس طلسی جزیرے کے میدانوں اور پہاڑوں کا رنگ کیا۔ کیونکہ ساحل کی جانب آنے سے تو اہل بالی بھی کرتاتے ہیں۔ اُنکے عقیدے کے مطابق مندروں پر بدروحوں کا راجح ہوتا ہے۔ پہاڑوں پر بھگوان اور میدانوں میں انسان بیرا کرتے ہیں۔ بالی کی بستیوں میں ہر روز کوئی نہ کوئی نہ بھی توار ضرور منعقد ہوتا رہتا ہے، کیونکہ ایک تو ان کا سال صرف ۲۰ دن کا ہوتا ہے پھر ہر مندر میں ہر سال کم از کم ایک توار ضرور ملایا جاتا ہے۔ اور ہر گاؤں میں مندر بھی تو کئی کئی ہوتے ہیں۔ اسی لئے عام سال کے دوران بالی میں نہ بھی توار چلتے ہی رہتے ہیں۔ ان تواروں پر لڑکیاں زرق برق لباس پن کر، خوراک، پھلوں اور پھولوں کے خوبصورت سجاوٹ والے نذرانے لیکر مندروں میں قطار اندر قطار آتی ہیں۔ اکثر اوقات ان بجے ہوئے منزل در منزل نذرانوں کی اونچائی نذرانے لانے والی لڑکیوں کے قد و قامت سے تباہاز کر جاتی ہے۔ مگر چھوٹے قدوں اور بھرپور جسموں والی یہ پچار نیں درحقیقت دیوالی وکھائی دیتی ہیں۔ ان سنہری بدن پچارنوں کی پوچا کرنے کو بار بار بھی چاہا اور اگر ہمیں گاؤں کے 'ڈشکروں' کے ڈندوں کا ڈرنہ ہوتا تو ہم بے خطر اس آتش نمرود میں کو وجاتے اور ان آتش فشاں پہاڑوں اور آتش فشاں جوانیوں کے جزیرے میں راکھ ہو جاتے، مگر ہماری بزوی نے ہمیں باز رکھا۔

اگرچہ ہم نے اپنے سامان کے سب پوری بیوں یعنی بالی کی سوزوکی دین بکردا رکھی تھی مگر ڈرائیور کی سفارش پر ایک سواری ہمیں اپنے ساتھ بھانپ پڑی۔ ٹک پتلوں اور بو ٹیک بشرٹ والا یہ پھرت باز نوجوان کبھی پھدک کر ایک درویش کے ساتھ بیٹھتا اور کبھی دوسرے کے ساتھ۔ اس کی انگریزی خاصی معقول تھی اور اسکی ٹنٹکلوں سے اندازہ ہو گیا کہ وہ سیاحوں کو دچپ تھے سنانے میں خاصی مهارت رکھتا تھا۔ چنانچہ یہ مفت کا گائیڈ ہمارے ساتھ شامل ہو گیا۔ ڈپسٹر اُبُد Ubud شاہراہ پر ہماری بیوں دوڑتی جا رہی تھی۔ سڑک کے دونوں جانب ناریل کے جھومتے پیڑ اور چاول کے کھیت تھے، جو حد نگاہ تک پہلے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں ناریل کے جھنڈ میں

میں درویشیوں کو بھلا کر اوپنے کی کوشش کر رہا تھا کہ درویش اول نے مجھے جنمبوڑ کر اخہادیا۔ میں سمجھا کہ وہ آگئی ہیں۔ مگر ان کے بجائے درویش اول کے ذہن میں ایک سیکم آئی تھی۔ اور اس سیکم کو پورا کرنے کے لئے ایک عدد جنگ باڈیز درکار تھا۔ چنانچہ درویش اول کے پتاۓ ہوئے راستے پر (جو یقیناً مرالا مستقیم نہیں تھا) عمل کرتے ہوئے میں ان کے کمرے کے روشن دان تک پہنچنے کی تگ دو کرنے لگا۔ درویش اول کے کندھوں پر چڑھ کر میں نے روشن دان تک رسائی تو حاصل کر لی مگر کمرے کے اندر تک جھانکنے کے لئے ایک آدھ فٹ اور اونچا ہونا لازمی تھا۔ لہذا میں نے اپنے پاؤں اس کے کندھوں سے اپر کی سیڑھی یعنی موصوف کے سر پر رکھے۔ عام حالت میں تو درویش اول اپنے سر پر کمھی بھی نہیں بیٹھنے دیتا تھا، مگر ان درویشیوں کے عشق میں وہ کچھ نہ بولا۔ ادھر میں عجب مشکل میں تھا۔ کیونکہ ایک تو اس کی چیلیں اور چہڑی کھوپڑی پر قدم جانا کامیلہ نہیں چیجیدہ تھا، دوسرے روشن دان تک رسائی اور تیسرے اندر ہمیرے کمرے میں جھاک کر جاسوی کرنا۔ مگر جب اندر نظر گئی تو میں سارے خطرے بھول بھال گیا اس اندر ہمیرے میں بھی ان دونوں درویشیوں کا کردار اور عمل روشن ہو گیا۔ وہ بھتوں کے خوف کے بغیر ہی ایک دوسرے سے نصیحتیں۔ ہم دونوں ان دونوں کے اس باہمی تعلق پر اس قدر بہم ہوئے کہ درویش اول تو سیدھا خراںوں والے درویش دوم کے کمرے میں جا کر سو گیا۔ اور میں رات بھر بستر پر کباب سنج کی مانند کروٹیں لیتا اور ترپتا رہا۔

صحیح ناشتے کی میز پر محبت سے مایوس چڑھے درویش اول نے نمار منہ درویش دوم کی جماعت بنا دی۔ جماعت سے ہماری مراد زبانی کلامی جماعت ہے۔ کیونکہ اس ترے سے تو بالوں کے اس جگل کی ایک درجن جام بھی جماعت بنا نے کے قابل نہ تھے۔ جھگڑا جزیرہ بالی میں آخری دن گزارنے کا تھا۔ دونوں درویشیوں کا شوق سیاحت بالکل مختلف سمتیوں میں تھا۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ اکٹھا سیر کرنا بھی لازمی تھا۔ کیونکہ ہمارے معماشی حالات کے مطابق علیحدہ علیحدہ سیر پر جانے کی گنجائش ہرگز نہ تھی۔ چنانچہ بہوت

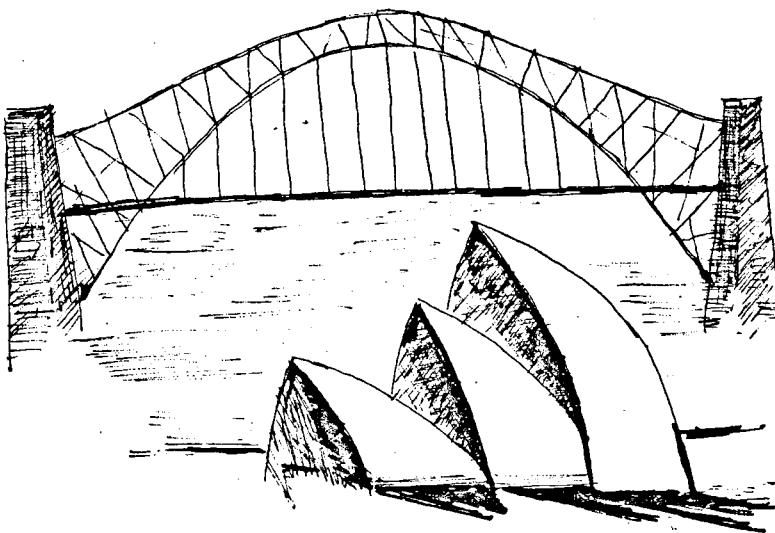
اُبُد کا پہاڑی قصبہ جزیرہ بالی کا لاہور ہے۔ مصوروں، شاعروں، سگٹ راشوں، مجسمہ سازوں اور فنکاروں کا شر۔ جہاں رقص و موسیقی کی تعلیم بھی دی جاتی ہے اور مصوری اور مجسمہ سازی کی بھی۔ یہ بالی کے تنہیب و تدن کا جیتا جائتا شہر ہے۔ جہاں ڈپنپسروں والی افراتفری کے بجائے سکون، تحمل اور ثہراو ملتا ہے۔ ایسا حسین شر جہاں ناریل کی اونچائی سے اونچی عمارتیں دکھائی نہیں دیتیں۔

جزیرہ بالی میں تقریباً ہر گھر کے سامنے بھگوان بوما کا مجسمہ موجود ہوتا ہے۔ زمین کے دیوتا کا یہ بیٹا ہاتھ میں گرز لئے گھروں کی خفاقت کرتا ہے تاکہ دنیاوی آنسیں اور بد روحیں گھر میں داخل نہ ہو سکیں۔ شاید بھگوان بوما کا خوف تھا جس کے سبب درویش دوم نے ہمیشہ ان کے گھروں میں جانے سے انکار کیا، حالانکہ وہاں کے لوگ بڑے ہی مسمان نواز ہیں اور اکثر گھران کے بیانے ہوئے مجسموں اور تصویریوں کی آرٹ گلریاں معلوم ہوتے ہیں۔ جہاں باقاعدہ سودے بازی کے اہتمام کے ساتھ تصویریوں اور مجسموں کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ وہاں مردوں اور عورتوں کے کاموں کی بڑی اچھوتی تقسیم ہے۔ شلا، خرید و فروخت، کھنچی پاڑی، ناج گانا، بنکے پیدا کرنا، پالنا اور گھر چلانا عورت کی ذمہ داری ہے۔ باقی سارے کام بیچارے مردوں کے سر ہیں۔ سب سے پہلا کام تو شادی کے لئے لڑکی کو اغاو کرنے کا ہے۔ اور شادی کا یہ طریقہ بڑا مقبول ہوتا جا رہا ہے۔ کیونکہ یہ سب سے کم خرچ طریقہ ہے۔ اس کے علاوہ مرغے لڑانا، پنگ اڑانا، سیاحوں کو الوبانا کرنے کی جیب تراشی بھی مردوں ہی کی ذمہ داری ہے۔ اور اسی کام پر ہمارے معصوم گائیڈ کی بھی گزر اوقات تھی۔ درحقیقت وہ یہوں ڈرائیور کا پارٹر تھا۔ کیونکہ ایسی وارداتیں سواریوں سے بھری یہوں میں با آسانی ہو سکتی ہیں۔ مگر ہمارے ساتھ جیب تراشی کی کوئی مخالفت نہ تھی۔ میری تو ویسے ہی جیب خالی تھی۔ درویش اول ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر فٹ تھا۔ رہا درویش دوم تو اسکی جیب سے پیسہ نکالنا شیش ٹاگ کے حلن سے حلن (من) نکالنے سے بھی دشوار تھا۔ اسی لئے وہ بیچارہ جنائزے کے دوران سیاحوں کے جھرمٹ میں گھس کر دھاڑی کیا۔

مندر اور گاؤں ... گاؤں اور مندر ... پھر ایک گاؤں ایسا آیا جہاں ہمارے گائیڈ نے گاڑی روکنے کو کما اور اس گاؤں میں چلنے کا اشارہ کیا۔ وہاں ایک ہجوم تھا۔ بہت سے لوگوں نے لبے لبے بانسوں کی مدد سے رنگ برلنگے کاغذوں اور زرق برلن کپڑوں سے جما ایک میٹار سا اٹھا رکھا تھا۔ لکڑی کے ایک تنخے پر کھڑا پروہت اس میٹار پر پکھے پانی پھینک رہا تھا۔ موسیقی اور ہجوم کے شور نے قیامت بہپا کر رکھی تھی۔ پھر اچانک اس جلوس پر کچھ لوگوں نے حملہ کر دیا۔ اس منزل در منزل میٹار کو اٹھائے ہوئے نوجوانوں نے میٹار کو بچانے کی خاطر بھاگ دوڑ شروع کی۔ نیم آسمان پر میٹار سے لٹکا پروہت متواتر پانی پھینکے جا رہا تھا۔ اک عجب لوث کھوٹ اور کھینچا تانی کا عالم تھا۔ موسیقی بھی جاری تھی اور شور و ہنگامہ بھی۔ ہماری سمجھ میں قطعاً ”کچھ نہ آ رہا تھا۔“ اس افراتفری میں ہمارا گائیڈ بھی غائب ہو گیا۔ اور درویش دوم بھی ... خیر درویش دوم تو فوراً ہی مل گیا کیونکہ وہ ناریل کے پیڑ کے پیچے چھپا ہوا ہمیں آوازیں دے رہا تھا۔ ”اوے یو تو فو ادھر آجاو ورنہ مفت میں مارے جاؤ گے۔“ ہم لوگ فوراً ادھر کو چلنے گئے اور اس کمین گاہ سے اس جنگ و جدل کا نظارہ کرنے لگے۔ اس ہجوم کے پیچے ایک اور بھی ہجوم تھا اور وہ ہجوم سیاحوں کا تھا جو کیمروں سے لیں اس اس ہجوم پر بھرپور حملہ آور تھا۔ سیاحوں کو دیکھ کر ہمیں کچھ نسلی تو ہوئی مگر پلے پھر بھی کچھ نہ پڑا۔ پھر سیاحوں کے جھرمٹ سے اچانک ہمارا گائیڈ نمودار ہوا، جس نے اس چھیننا چھٹی کی وضاحت کی۔ دراصل یہ گاؤں کے ایک مالدار آدمی کا جتنازہ تھا جسے جلانے کے لئے جیا جا رہا تھا۔ ان کے عقیدے کے مطابق مرنے والے کی روح جلنے کے بعد گھر کے ارد گرد منڈلانے لگتی ہے۔ اسی لئے روح کو گمراہ اور کنفیوز کرنے کے لئے جنازے پر جلنے کے جاتے ہیں۔ مختلف راستوں اور گزارگاہوں سے گزار کر جلایا جاتا ہے تاکہ روح گھر کا راستہ نہ ڈھونڈ سکے۔ مرنے والے کی روح تو کنفیوز ہوئی یا نہیں اس کی تو ہمیں خبر نہیں البتہ ہم لوگ خاصے کنفیوز ہو گئے اور فوراً ہی وہاں سے اُبُد کا راستہ اختیار کیا۔

بنانے گیا تھا۔

درویش اول حسب عادت بیووں کی اگلی سیٹ پر فٹ ہو کر بیٹھ گیا۔ میں بوجہ مجبوری سب کا سامان لادنے میں مصروف تھا۔ اور درویش دوم غائب۔ جماز کے اڑنے میں صرف چار گھنٹے باقی تھے اور ہم کو ڈسپر کے ہوائی اڈے پر بھی پہنچتا تھا۔ اگر درویش دوم کی جیب میں ہمارے پیسے نہ ہوتے تو ہم یقیناً اسے جزیرہ بالی میں ہی چھوڑ جاتے، مگر مجبوراً اسکا انتظار کرنا پڑا۔ طویل انتظار کے بعد وہ مست ہاتھی کی طرح جھوٹا جھوٹا پہنچا تو اسکے ہاتھ میں شانگ بیک تھا۔ درویش اول نے چکھاڑتے ہوئے پوچھا۔ ”یار! یہ شانگ کرنے کا کون سا وقت ہے؟“ جس پر درویش دوم نے لاپرواٹی سے جواب دیا۔ ”یہی تو شانگ کا وقت ہے۔“ مجھ صبح ہندو دکاندار پسلے گاہک کو خالی ہاتھ نہیں جانے دیتا۔ اس سے بد شکونی ہوتی ہے۔ اسی لئے تو میں نمار منہ گیا تھا۔ ہر چیز اونے پونے داموں خرید لایا ہوں۔ ہم نے اسکی اس منطق کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور چکے سے ہوائی اڈے کا سفر اختیار کیا۔ ڈسپر سے ہمیں جکارتہ پر واز کرنی تھی۔ جہاں سے دوسرا جماز پکڑ کر آسٹریلیا کے شرائید میلڈ جانا تھا۔



آشٹریلیا کو دنیا کی سب سے بڑی جیل تصور کیا جاتا رہا ہے جو مشرق سے مغرب تک ۳۰۰۰ چار ہزار کلو میٹر اور شمال سے جنوب تک ۳۲۰۰ تین ہزار دو کلو میٹر کے طول و عرض میں پھیلا ہوا ہے۔ ملک کے چار سو سمندر واقع ہے، جسے برا سے برا تیراک بھی تیر کر عبور نہیں کر سکتا۔ اس قدر تی زندان خانے کو ۱۸۸۸ء میں سرکار برطانیہ نے خوفناک مجرموں کو دلیں نکالا دینے کے لئے پہلی مرتبہ استعمال کیا اور اسکے بعد اس قسم کے مجرموں سے لدے پھندے جماز کے جماز آشٹریلیا بھیجے جانے لگے۔ اسی کامیاب تجربے کی بناء پر ان گوروں نے ہندوستان کے کالے آزادی پسندوں کو بھی مجرم ٹھرا کر کالے پانی (عبور دریائے شور) بھیجنा شروع کیا۔ آشٹریلیا اور ایک عام جیل میں بنیادی فرق وہی ہے جو چڑیا گھر اور نیشنل پارک کے مابین ہوتا ہے۔ یعنی قیدی بہرحال دونوں ہی ہوتے ہیں۔ پہلی صورت میں بخیرے کی قید تک محدود ہوتے ہیں اور دوسرا صورت میں نیشنل پارک کے حدود و قیود تک۔

یہ برطانوی مجرم رفتہ رفتہ آشٹریلیا کے قدیم پاٹندوں پر سبقت لے گئے۔ کیونکہ وہاں کے اباؤ اور بھنل *Aborigines* نسل کے چھوٹے چھوٹے سیاہ فام لوگ ابھی تک جنگلوں اور غاروں میں اقامت رکھتے تھے اور جنگلی جانوروں کے شکار پر گزر اوقات کرتے تھے۔ ان کے شکار کا سب سے دلچسپ اور ملک ہتھیار "بوم ریک" تھا۔ "بوم ریک" کوئی تین انجوں چوڑا اور دو فٹ لمبا ہتھیار ہے

پہنچائے۔ آشٹلیا کو دریافت کرنے والی سیاحتی مسou کی کامیابی کا انحصار بھی افغانوں کے اونٹوں پر تھا۔ جو میل ہا میل کا سفرپانی کے بغیر ملے کرتے رہے۔

اونٹوں کا آشٹلیا کا سفر درحقیقت ۱۸۵۵ء میں ایک برطانوی افسر کے ہمراہ شروع ہوا۔ یہ برطانوی افسر پہلی اور دوسری برٹش افغان جنگوں کے دوران صوبہ سرحد میں موجود تھا اور اونٹوں کی پاربرداری کی خصلت سے شناسا ہو گیا چنانچہ انہی ملازمت سے ریڑا رہنے کے بعد جب اس نے آشٹلیا میں رہائش پذیر ہونے کا فیصلہ کیا تو اپنے ہمراہ چند اونٹ اور اونٹ بان لے گیا۔ آشٹلیا کی آبادی میں اونٹوں کا تجربہ اتنا کامیاب رہا کہ پھر کراچی کی بندرگاہ سے جب کوئی برطانوی جہاز آشٹلیا کے لئے گزرتا تو اس پر اونٹ بھی ہوتے اور اونٹ بان بھی۔ کراچی میں باقاعدہ الی رکدنگ اینجیساں کھل گئیں جو بلوجھستانی اونٹ اور افغانی اونٹ بان آشٹلیا پہنچانے لگے۔ چنانچہ آشٹلیا نے ایک صدی پہلے وہی کوڑا را دیا کیا جو موجودہ دور میں دوہنی نے دیا کیا۔

امیر دوست محمد خان اپنے چالیس اونٹوں کے ہمراہ کراچی سے آشٹلیا ۱۸۹۰ء میں پہنچا۔ اسکی غیر معمولی شہرت درحقیقت ایک رومانوی داستان کے سبب ہے۔ کوئی گاروی کے سونے کی کانوں کے قریب، جہاں افغانوں کی خیسہ بستی تھی، ایک جرمن خاندان بھی آباد تھا۔ دوست محمد ایک خوب رو نوجوان ہونے کے علاوہ کشتی کا بھی بڑا ماہر تھا۔ بڑے بڑے طاقتور کان کن اس سے کشتی کا مقابلہ کرنے آتے مگر وہ انسیں ایک لمحے میں پچھاڑ دیتا۔ اسی دوران جرمن خاندان کی ایک لڑکی اینی Annie اور دوست محمد کا عشق ہو گیا۔ دوست محمد اینی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ مگر جرمن خاندان نے انکار کر دیا تو وہ دونوں سی پنزوں بن گئے اور اونٹ پر بینہ کر غائب ہو گئے۔ اور ہزاروں میل کے صحراء کو عبور کر کے پورٹ ہیڈلینڈ Port Headland جا پہنچے۔ جہاں انسوں نے شادی کی اور اسکے ہاں ایک پچھے پیدا ہوا جسکا نام انسوں نے مصطفیٰ رکھا۔ جب مصطفیٰ چد سال کا ہوا تو دوست محمد اپنی بیوی اینی کے ہمراہ کراچی آیا اور اپنے بیٹے کو رشتہ داروں کے پاس چھوڑ کر پھر آشٹلیا لوٹ گیا۔ اب تک اینی کے

اور درانتی کے چھل کی طرح نہم دائرے کی صورت میں ہلال نما بنا ہوتا ہے۔ اس تھیمار کے دونوں سرے ایسے زادیوں پر مژے ہوتے ہوتے ہیں کہ جب کوئی ماہر شکاری اسے ہوا میں لرا کر پھینکتا ہے تو شکار کو زخمی کرنے کے بعد ”بوم رینگ“ مخصوص زادیوں کے سبب خود بخود شکاری کے پاس لوٹ آتا ہے۔ اچھے ”بوم رینگ“ کے لئے تھیمار بنانے والا بھی ہمدرد ہونا چاہئے اور شکاری بھی ماہر فن۔ آجکل یہ تھیمار شکار کے بجائے کھیل کے مقابلوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اور غیر ملکی سیاح اسے سو نیزیں سمجھ کر خریدتے ہیں۔

۱۸۵۵ء میں آشٹلیا کی ریاست و کثوریہ میں سونا دریافت ہوا تو اس دلیل کے مجموعوں کے دارے نیارے ہو گئے اور دلیں نکلا دیئے گئے ان غنٹوں اور قاتمکوں کے وارث بھی دہاں پیدا ہو ہگئے اور ان سے ملاقات کرنے کے لئے آشٹلیا پہنچا شروع ہو گئے۔ قاتمکوں کے وارثوں کے بعد وارثوں کے وارث یعنی سرکار برطانیہ بھی سونے کی تلاش میں جا پہنچی اور اس طرح آشٹلیا ایک بدنام جیل اور گنمان خلے سے منذب ملک بن گیا۔ کیونکہ گاؤں کے لوگ ایک مثال دیا کرتے ہیں کہ ’جیدے گردانے۔ اوہدے کلمے وہی سیانے یعنی جسکے پاس دولت آتی ہے اسکے پاس داتاںی بھی آجاتی ہے۔ چنانچہ یہی حال آشٹلیا کا ہوا۔ دولت پاتے ہی آشٹلیین ترقی کی راہ پر گامزن ہو گئے۔ اسکی ترقی میں ہمارے خطے کے ایک نوجوان امیر دوست محمد خان اور اس کے چالیس اونٹ نے نہایت اہم کوڑا را دیا کیا۔ آشٹلیا میں دوست محمد اور اسکے چالیس اونٹ علی بابا اور چالیس چور کی داستان کی طرح مشور ہیں۔ دہاں کے صحراء کو عبور کرنے اور بار برداری کے لئے اس صحرائی جہاز کی بھی اشد ضرورت تھی اور اس بندہ صحرائی بھی۔ چنانچہ اس افغان نوجوان نے (جسکے سبب ان کی نسل کو اب دہاں ”غائز“ کہا جاتا ہے) آباد کاری کے لئے دور دراز علاقوں تک سلان پہنچانے کی ذمہ داری سنگھائی اور خوب سنگھائی کہ ڈاک بائیٹھے کا کام بھی اسی کے سپرد گردیا گیا۔ ڈاک کے بعد میلگرام کا نظام آیا تو اونٹوں کی شیزی کلوں اور سیدھی قطاروں نے پورے آشٹلیا میں پول اور تار

خاندان سے صلح بھی ہو چکی تھی۔ چنانچہ دوست محمد نے کال گارڈی میں جا کر دوبارہ کاروبار شروع کیا۔ اسکے کاروبار نے استمرار ترقی کی کہ اینی کے دو بھائی اسکے ہاں ملازم ہو گئے۔ اسی اثنائیں اسکے ہاں چار بیٹیاں اور ایک بیٹا پیدا ہوا۔

کسی کاروباری جگہ پر دوست محمد اور اسکے سالوں کے درمیان ہاتھا پائی ہو گئی۔ طاقتور خان نے ایک سالے کی خوب پیائی کی۔ اس بے عزتی کا بدله لینے کے لئے دونوں سالوں نے انتقام لیا اور جب دوست محمد سورہ تھاتو اسے قتل کر دیا۔ اینی اس قتل کی گواہ تھی۔ مگر اس نے عدالت میں اپنے بھائیوں کے حق میں گواہی دی اور وہ آزاد ہو گئے۔ اینی نے فوراً کراچی کا سفر اختیار کیا تاکہ دوست محمد کی کراچی والی جائیداد پر قبضہ جاسکے۔ اینی کی اس حرکت پر آسٹریلیا میں مقیم پٹھان سخت ناراض تھے۔ اور وہ حقیقت میں اینی کو ہی دوست محمد کا قاتل سمجھتے تھے۔ چنانچہ دوست محمد کے ساتھیوں کے تین بیٹوں نے اینی سے اپنے چچا کا انتقام لینے کے لئے کراچی کا سفر اختیار کیا۔ کراچی کوچنچتے ہی وہ سیدھے دوست محمد کے گھر پہنچے اور انہوں نے چاقوؤں کے وار کر کے اینی کو قتل کیا اور فرار ہو گئے۔ قتل کے دوران اینی نے ایک لڑکے کی انگلی کاٹ لی۔ جب اسکا پوسٹ مارٹم کیا گیا تو اسکے منہ سے کٹی ہوئی انگلی نکلی۔ اور اس طرح پولیس ان تینوں لڑکوں کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئی اور انہیں چھانی چڑھا دیا گیا۔ اینی ۷ اگست ۱۹۶۰ء کو کراچی میں قتل ہوئی اور اب وہیں دفن ہے۔

ایئی میلڈ سے آسٹریلیا کے مغربی شرائیں پر گل تک ٹرین شروع کی گئی تو اسکا نام ”دی غان“ رکھا گیا۔ کیونکہ منزل کے آخری حصے میں ٹرین کو انجن کے بجائے اونٹ کھینچ کر لے جاتے تھے۔ اس ٹرین کو کھینچنے کے لئے گواب اونٹوں کی ضرورت نہیں رہی مگر نام اب بھی ”دی غان“ ہے۔ بالآخر وہ مشینیں جو اونٹوں پر لا د کر آسٹریلیا کے کونے کو نے پہنچائی گئیں جب اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے اور چلنے پھرنے کے قابل ہو گئیں تو انہوں نے اونٹوں کی جگہ لے لی۔ کیونکہ وہ جوان بھی تھیں اور تیز بھی۔ جب اونٹوں کا کاروبار ختم ہوا تو پٹھانوں نے مزدوری شروع کر دی، یہاں تک کہ

ایئی میلڈ کی بند رگاہ پورٹ ڈارون بھی پٹھان مزدوروں کی مدد سے بنائی گئی۔ ایئی میلڈ میں سو سالہ پرانی ایک مسجد بھی موجود ہے جو پٹھانوں نے تعمیر کی تھی اور ابھی تک قائم و دائم ہے۔

اس رومانوی دور کے اوٹ اور اوٹ بان دونوں کی نسلیں آسٹریلیا میں موجود ہیں۔ اونٹوں کی ضرورت ختم ہوئی تو انہیں صحراء میں آزاد کر دیا گیا، جہاں وہ پھلتے پھولتے رہے۔ اور اب آسٹریلیا کے ریگزاروں میں سینکڑوں ہزاروں اوٹ آزادی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ چند برس قبل سعودی عرب میں وبا چھلی تو بہت سے اوٹ مر گئے۔ چنانچہ سعودی حکومت نے آسٹریلیا سے سینکڑوں اوٹ درآمد کئے اور اپنے ملک میں اونٹوں کی کمی کو پورا کیا۔

قوانين Qantas آسٹریلیا کی قوی ایئر لائئن ہے اور اس کے جہازوں کی دم پر کیگدی کا عالمی نشان بنا ہوتا ہے۔ ہم لوگ پہلی مرتبہ کسی ایسی ہوائی کمپنی کے طیارے میں سفر کر رہے تھے جس کا عالمی نشان جانور ہو۔ کیونکہ ”عوما“ پرندوں کو ہی پرواز کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ درویش دوم عجیب و غیریب منطق کا مالک تھا۔ اس نے اندریش ظاہر کیا کہ اگر جہاز کی پرواز بھی عالمی جانور کیگدی کی چال سی ہوئی تو سفر بہت بچپنی ہو گا۔ درویش دوم بچپنی پروازوں سے بہت خوفزدہ ہوتا تھا۔ مگر درویش اول نے تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ ٹکر کی کوئی بات نہیں سفر خوب مزے میں گزرے گا، کیونکہ صرف جہاز پر ہی کیگدی کا نشان بنا ہے ایسے ہو سش تو کیگدی نہیں ہو گئی اور پھر اس نے بالی والی دونوں آسٹریلین ٹرکیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ سوچو اگر وہ دونوں ایسے ہو سش کی ورودی پہن کر آ جائیں تو کیسی لگیں گی؟ اور پھر آسٹریلیا میں تو ہر لڑکی ان دونوں سے بہتر ہی ہو گی۔ چنانچہ خوب و فضائی میزانوں کی امید پر ہم لوگ آنکھ بند کر کے جہاز میں سوار ہو گئے۔ سافروں کو اپنی مخصوص نشتوں تک پہنچانے کے لئے ایک باریش سیپورڈ مقرر تھا جسے دیکھتے ہی درویش اول کا ما تھا نہ کہ اور اس نے فوراً دوسرے میزانوں کی طرف نظر دوڑا۔ ہر سو باریش باور دی مشتملہ نما سیپورڈ ہی

وکھائی ویئے۔ میزبانی اور خصوصاً "فناٹی میزبانی تو صرف لاکھوں ہی کو زینب دیتی ہے۔ لرکے تو ہوائی قرواق یعنی ہائی جیکر دکھائی دیتے ہیں۔ پھر ڈینکس Qantas کے یہ سینورڈ جہازوں میں شامل ہونے کے لئے تو موزوں تھے جہازوں میں میزبانی کے لئے ہر گز نہیں۔ اپنی نشتوں تک پہنچ تو درویش اول جھٹ سے کھڑکی کی جانب سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گو عام حالات میں آئیں سیٹ پر اسکا جدی پتھی تپھے ہوتا تھا تاکہ ائمہ ہوش کی چال ڈھال پر نظر رکھ سکے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر جہاز کی کھڑکی کھل سکتی تو وہ فوراً جہاز سے باہر کو د جاتا۔ تمام وہ جہاز سے باہر تو نہیں کووا البتہ احتجاج کے طور پر اس نے اپنی آنکھوں پر سیاہ کھوپے Slumbrette چڑھائے جو ہوائی سکپنی والے سافروں میں تقسیم کرتے ہیں تاکہ جو لوگ روشنی کے باوجود آرام کرنا چاہیں وہ آنکھوں پر کھوپے چڑھا کر سو جائیں۔ اگرچہ درویش اول کا سونے کا کوئی ارادہ نہ تھا نہ یہ سونے کا وقت تھا اور نہ وہ سویا۔ گر پر دکھی درویش نے اپنے احتجاج کا بھرم رکھتے ہوئے برابر سیاہ کھوپے چڑھائے رکھے۔ کھانا بھی اس حالت میں کھایا۔ یہاں تک کہ فلم بھی کھوپے چڑھائے ہوئے ہی دیکھے ڈالی۔ جب فلم ختم ہوئی اور جہاز کی روشنیاں بند ہو گئیں تو اس نے اپنے سیاہ کھوپے اتار لئے اور الو کی طرح جگراتہ (رت جگا) شروع کر دیا۔ "آئیں" کے دوسرا جانب سیٹ پر ایک دراز قامت سردار جی بیٹھے ہوئے تھے۔ جنہوں نے فناٹی ساتی سے خوب دوستی بنا رکھی تھی اور اس دوستی کے مل بوتے پر مفت دار و چڑھائے چلے جا رہے تھے۔ انہوں نے گلاس کو ڈیک لگائی، دارو گلے میں انڈیلی اور خالی گلاس مجھے دکھاتے ہوئے پوچھا۔ "ہمارا جو کچھ پہنچے گے؟" سردار جی کے اس سوال نے مجھے تنبذب میں ڈال دیا۔ کیا رات کے بارہ بجے بھی سردار جی لوگ اسی انداز میں سوچتے ہیں جس طرح دن کے بارہ بجے؟ (اگر واقعی وہ سوچتے ہیں) اولاً تو میں ہمارا جو کچھ پہنچے گے تو صرف راج ہی گلتا تھا۔ دوسرے اگر کچھ پہنچا چاہتا بھی تو بھلا غالی گلاس سے کیا پیتا۔ چنانچہ "تینیں سردار جی تو ہاؤی بڑی مریانی...." کہہ کر پچھا چھڑانے کی کوشش کی۔ گر سردار جی کو تو رات بھی

کامی تھی اور سفر بھی، اور وہ گپ لگانے کے نل مود میں تھے۔ وہ مسافر جنہیں دوران سفر جہاز میں نیز نہ آتی ہو وہ اکثر ایسے مسافروں کی تلاش میں رہتے ہیں جن کو گپیں سنانا کروقت کاٹ سکیں۔ اس پورے جہاز میں سردار جی کو شاید مجھ جیسا کوئی دوسرا چند نظر نہیں آیا ہو گا۔ چنانچہ انہوں نے مجھ پر سوال و جواب کی بوجھاڑ شروع کر دی۔ اگر میں پر دویں میں نہ ہوتا.... سردار جی دیو قامت نہ ہوتا.... اور دوسرے درویش بھی میری طرح بزدل نہ ہوتے تو میں سردار کے کسی سوال کا جواب نہ دیتا۔ مگر انہیں ان کمزوریوں کے سبب سردار جی پر ہم نے اپنی خوش اخلاقی کا سکھ جادیا۔ اور ایڈی یلڈیڈ تک اپنی سات نسلوں کا ایک دوسرے سے تعارف کر دیا۔ ویسے تو سفر کا اصل مقصد ہی لوگوں سے میل ملا پ ہوتا ہے۔ ریل گاڑی کے دور میں تو مسافروں کی دوستیاں اتنی مضبوط ہو جاتی تھیں کہ اکثر اوقات رشتتوں میں بدل جاتی تھیں۔ ویسے تو یہ سردار جی بھی ہمارے رشتے دار نکلے۔ تقسیم سے پہلے وہ ایف۔ سی۔ کانج۔ لاہور میں پڑھتے تھے اور کانج کی باسکٹ بال ٹیم کے کپتان تھے۔ ان کا قدر باسکٹ بال کھیلنے اور پنگ لوٹنے کے لئے نہایت موزوں تھا۔ کانج کے رشتے بڑے عظیم رشتے ہوتے ہیں۔ اس لئے فارما نایت ہونے کے ناطے سردار جی سے ہم کانج ہونے والا پختہ رشتہ ہو گیا اور اس رشتے کے سبب ان کے ریسٹوران میں مفت کھانا کھانے پر ہمارا پورا حق قائم ہو چکا تھا، جو ایڈی یلڈیڈ میں قیام کے دوران ہم نے بلا ناغہ ادا کیا اور اس سنیز فارما نایت نے بھی فراغدی سے اپنا یہ رشتہ نہیا۔

درویش دوم کو انساں سے بڑی رغبت تھی۔ اگرچہ وہ خود بھی کچھ انساں کی جسمات کا مالک تھا۔ انڈو نیشا سے روانگی پر اس نے چار انساں پچکے سے اپنے بھاری اور بھدے بیک میں ٹھونس لئے تھے۔ جسکا ہمیں کچھ علم نہ تھا۔ اور آسٹریلیا والے اپنے ملک میں نہ تازہ سبزیاں اور پھل لانے دیتے ہیں اور نہ جانور اور جانوروں کی کھالیں۔ اس پاپندی پر ان کی قرانیہ والے بڑی سختی سے عمل کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کا خیال ہے، اور وہ خیال درست بھی ہے کہ یہ چیزیں اپنے ساتھ جرا شیم اور دوسری

کا تعلق ہے تو انہوں نے اپنی عقل و فہم سے کئی اور نظام بھی مرتب کئے۔ جن میں جسموری نظام، کیونٹ نظام اور سو شلسٹ نظام شامل ہیں۔ ایک اور نظام حکومت، جو صرف درندوں میں اور تیسری دنیا میں پایا جاتا ہے آمرانہ نظام ہے۔ جہاں تک آمرانہ نظام کا تعلق ہے اس سے ہم سب واقف ہیں۔ بالخصوص پاکستانی تو صرف آمرانہ نظام ہی سے واقف ہیں کہ جب جسموریت ہوتی ہے تو سفید لباس اور رنگ برگ بھی تو والے آمر ہوتے ہیں اور جب ڈائیٹری شپ ہوتی ہے تو خاکی لباس اور خاکی جیپ والے آمر ہوتے ہیں۔ حریت کی بات یہ ہے کہ دونوں قسم کے آمروں کو ”فورولی ڈرائیور“ Four Wheel Drive کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ وہ شاید اس لئے کہ انہیں اپنے ضمیر کی دلمل میں دھنس جانے کا خطرہ رہتا ہے۔ مگر ہم نے کسی آمر کو پر سکون اور قدرتی موت مرتب نہیں دیکھا۔ ہاں تو ذکر ملکہ شد یعنی ”کوئین بی“ کا ہو رہا تھا۔ ملکہ شد کی مکھیوں کی ہو یا مکھی نما انسانوں کی ہو بنیادی طور پر خود پسند بھی ہوتی ہے، مغدور بھی ہوتی ہے اور خود غرض بھی۔ ایک شد کے قطرے قطرے کی مالک ہوتی ہے اور دوسری ملک کے ذرے ذرے کی۔ ایک کی مرضی کے بغیر کوئی مکھی بھن بھنا نہیں سکتی اور دوسری کی مرضی کے بغیر کوئی انسان دم نہیں مار سکتا۔ دونوں کا ڈنک زہریلا ہوتا ہے اور دونوں ہی بغیر سوچے سمجھے ڈنک مارتی ہیں۔ چھتے کا شد اور ملک کی دولت صرف ان کے حصے میں آتی ہے جو مکاؤں کی قربت میں ہوتے ہیں۔ مگر قربان جائیں باغ جناح کے مالیوں کے کہ وہ ایسی خود غرض ملکہ سے شد چھین لیتے ہیں۔ شد نکالنے کا سب سے کامیاب طریقہ چھتے کو دھواں دینے کا ہے۔ پرانے کپڑے اور آم کے سوکھے ہرے پتوں کو جب آگ لگائی جاتی ہے تو شعلہ بننے کی بجائے اس میں سے کڑوا دھواں اٹھتا ہے۔ یہ دھواں جب شہید کے چھتے کو دیا جاتا ہے تو مکھیاں تتر بتر ہو جاتی ہیں اور انہیں ڈنک مارنے کا ہوش نہیں رہتا۔ اس طرح مالی بغیر کسی خطرے کے درخت سے شد اتار لیتے ہیں۔ ویزا اور پاپورٹ کی پابندیوں سے بالا تر پرواز کرنے والی شد کی مکھیاں سردیاں آنے سے پسلے ہی واپس آشٹیلیا لوٹ

مسئلہ بیماریاں لاتی ہیں اور اس طرح آشٹیلیا میں پیدا ہونے والی سبزیاں، بچل اور جانور ان غیر ملکی بیماریوں کا شکار ہو سکتے ہیں۔ اس قسم کی پابندیاں دیے تو کمی اور ممالک میں بھی ہیں، مگر اتنی سختی سے ان پر عمل نہیں ہوتا۔ شاید اسکی وجہ یہ بھی ہے کہ آشٹیلیا دنیا کے دوسرے تمام ممالک سے الگ تھلک ہے۔ اس لئے یہ پابندیاں بڑی موثر اور کارگر ثابت ہوئی ہیں۔ ظاہر ہے جرا شیم، آشٹیلیا کے ارد گرد پھیلے ہوئے وسیع سمندر تو عبور کرنے سے رہے۔ مگر ہمارے ایک معتبر دوست منور میر کا خیال بالکل مختلف ہے۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ لاہور کے لارنس گارڈن یعنی باغ جناح میں شد کی مکھیاں آشٹیلیا سے آتی ہیں۔ منور میر کا شد سے جذباتی سارشست ہے۔ کیونکہ شد کا شوق انہیں اپنے والد سے درٹے میں ملا ہے اور اس نسبت سے وہ شد کے بارے میں جو کچھ کہتے ہیں پورے اعتماد سے کہتے ہیں۔ وہ لارنس گارڈن سے ملنے والے شد کے بڑے پرانے خریدار ہیں اور گرمیوں کی ”شکر دوپرے“ خود اپنے سامنے شد کے چھتوں سے شد نکلوتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ شد کا خریدار اگر ہوشیار نہ ہو تو شد یعنی والے خالص شد کی جگہ لوگوں کو گزر کا شیرا نج دیتے ہیں۔ مگر منور میر تو شد چکھ کر ان پھولوں کی نسل اور رنگ تک بتا دیتے ہیں جن کے رس سے شد بنا یا گیا ہو۔ مثلاً ”مئی“ کے مینے میں اترنے والا شد بہار کے خوش رنگ پھولوں کے رس سے اکٹھا کیا جاتا ہے۔ اسی طرح جولائی اگست کے مینوں میں اترنے والا زرد رنگ کا کڑواہٹ والا شد المیاس کے زرد سنہری پھولوں کا نچوڑ ہوتا ہے۔ شد کی ظالم مکھیوں سے شد چھیننا بھی ایک فن ہے۔ کیونکہ مکھیوں کی ہوائی فوج بڑی بے جگہی سے شد اور شد کی ملکہ کی حفاظت کرتی ہے۔ منور کے مطابق شد کے ہر چھتے میں ایک ملکہ کی حکمرانی ہوتی ہے جسے Queen Bee کوئین بی کہا جاتا ہے اور باقی تمام مکھیاں اور کچھ اسکے تابع ہوتے ہیں۔ یہ بادشاہت کا نظام بھی ایک ابدی قسم کا نظام ہے۔ مگر یہ فیصلہ کرنا قدرے مشکل ہے کہ آیا یہ نظام انسانوں نے درندوں سے، پرندوں اور کیڑے کوڑوں سے سیکھا یا ان سب نے اسے انسانوں سے سیکھا۔ جہاں تک انسانوں

جاتی ہیں۔ کیونکہ جب یہاں سرداش ہوتی ہیں تو آسٹریلیا میں گرفتاری کا موسم شروع ہو جاتا ہے۔

ایڈیلینڈ اترنے سے کوئی ڈیڑھ گھنٹے پہلے ہی جہاز کے عملے نے فارموں کے پلنڈے مسافروں کو تھما دیئے اور اعلان کیا کہ جہاز چھوڑنے سے پہلے ہر مسافر کو وہ فارم پر کرنے ہوں گے۔ سب سے طویل فارم قریبی والوں کے تھے۔ جن پر جملی حروف میں منوع چیزوں کے بارے میں لکھا تھا اور خبردار کیا گیا تھا کہ غلط بیان کرنے کی صورت میں بھاری جرمانے ہوں گے۔ ایک تو ان فارموں نے اور دوسرے درویش اول کے تغیرنے بے چارے درویش دوم کو سخت پریشان کیا۔ کیونکہ جب جانوروں اور ان کی کھالوں کے بارے میں سوالنامہ آیا تو درویش اول نے درویش دوم سے کہا۔ ”بھالو میاں .... ان سوالوں کا جواب کیسے دو گے؟ .... اگر قریبی والوں نے تمہارے جسم پر بھالو جیسے بال دیکھ لئے تو وہ یقیناً تمیں چڑیا گھر میں بند کر دیں گے۔“ معصوم درویش دوم نے جھٹ سے جھٹ سے قیص کے بیٹھ کر لئے۔ ہم سب فارم پر کرنے میں اس قدر الجھ گئے کہ کھڑکی سے باہر نظارے کرنے کا موقع بھی نہ مل سکا۔ جونی جہاز رکا تو جہاز کے عملے نے پورے جہاز میں جراشیم کش پرے کر دیا۔ وہ پرے اسقدر سخت تھا کہ مجھے یقین ہے کہ ہمارے جدی پشتی جراشیم بھی ہلاک ہو گئے ہوں گے۔ پھر جہاز کے دروازے اس وقت تک نہ کھولے گئے جب تک ان کو پختہ یقین نہ ہو گیا کہ جراشیم بالکل ختم ہو چکے ہیں۔ مجھے تو یہ خوف تھا کہ درویش اول جیسا کمزور دل آدمی ہی نہ ”پھرک“ جائے۔ مگر شکر ہے کہ ہم بخیر دعافت ایئرپورٹ میں داخل ہو گئے اور سکھ کا سانس لیا۔ ایئرپورٹ کے کوریڈور میں جگہ جگہ دارنگ کے بورڈ لگے ہوئے تھے اور ہر بورڈ کے نیچے ایک ڈبہ رکھا تھا۔ ان بورڈوں پر مسافروں کو خبردار کیا گیا تھا کہ اگر ان کے پاس منوع اشیاء ہوں تو وہ ان ڈبوں میں ڈال دیں۔ بورڈ پرستے ہی درویش دوم سم کر ایک ڈبے کے پاس کھڑا ہو گیا۔ درویش اول نے اسے آگے دھکیلتے ہوئے کہا ”بھالو میاں یہ ڈبہ تو تازہ پھل اور سبزیاں چھیننے کے لئے رکھا ہوا ہے۔ تم فکر نہ کو

جب جانور چھیننے والا ڈبہ آئے گا تو ہم خود ہی تمیں اس میں پھیک دیں گے۔“ درویش دوم نے اس سفر میں پہلی مرتبہ برهنی کا انعام کیا اور درویش اول کو وہ بات کہی جو اسے گولی کی طرح لگتی تھی۔ ”سچنے! کبھی عقل کی بات بھی کیا کرو۔ تمیں معلوم ہے تازہ پھل لانے پر کتنا جرمانہ لگے گا؟ ہم تینوں کا پورے ہفتے کا خرچہ اس جرمانے میں چلا جائے گا۔“

کمپیوٹر دماغ درویش دوم کا یہ حساب کتاب میری سمجھ میں تو بالکل نہ آیا اور میں نے اس سے وضاحت طلب کرتے ہوئے پوچھا۔ ”یار ہم کونا تازہ سبزیاں اور پھل لئے پھرتے ہیں جو وہ ہمیں جرمانہ کریں گے؟“

درویش اول جو گنجائی کی وجہ سے درویش دوم سے چڑا ہوا تھا جل کر بولا ”چلو چلو کچووے ..... بے غم ہو کر چلو.... ہم تمہاری صفائی دیدیں گے کہ تم بھالو نہیں انسان ہو۔ اس لئے جرمانے کا کوئی غم نہ کرو۔“ مگر درویش دوم نے جلدی سے کہا۔ ”یہ تو فو سمجھتے کیوں نہیں، ہو .... میرے پاس چار انناس ہیں۔“

”کیا؟“ ہم دونوں نے بے یک زبان پوچھا۔ جن پر اس نے معصومیت سے جواب دیا۔ ”یار مجھے کیا پڑتا تھا آسٹریلیا والے فروٹ کے اس قدر خلاف ہیں۔ سستے مل رہے تھے .... میں نے لے لئے مگر بتاؤ اب کیا کریں؟“

بات تو درویش دوم کی بھی معقول تھی۔ ہم میں سے کسی کو بھی اس کا علم نہ تھا کہ تازہ پھل لے جانا آسٹریلیا میں عذاب جان بن جائے گا۔

درویش اول نے مسلسلے کا حل نکالتے ہوئے مشورہ دیا کہ یا را! مسئلہ کیا ہے؟ انسان اس ڈبے میں پھیک دو .... اللہ اللہ اور خیر سلا ....

درویش دوم نے اپنے مخصوص معصومانہ انداز میں پوچھا۔ ”یار کیسے پھیک دوں؟“

درویش اول نے گرفتہ ہوئے کہا۔ ”احمق آدمی تجھے ڈبے میں پھل پھیکنا نہیں آتا؟ لاو مجھے دو میں پھیک دیتا ہوں۔“ اتنی دیر میں دراز قامت سردار بھی اپنا

سے اپنی کپان کے وار کئے اور چاروں انناس چھیل کر ایک ایک ہمارے حوالے کیا اور چوتھے کو خود کھانا شروع کر دیا۔ ہمیں کشٹر کے جسمانے کا اتنا خوف تھا کہ پلک جھینٹنے ہی انناس صاف کر گئے۔ سردار جی نے پنجاڑے لیتے ہوئے کہا۔ ”کاکا بی جار انناس تے شے ای کوئی نئیں ..... اسال پہلی وار حد اتھے آئے سی تے امبال دی سالم پیٹی کھڑے کھڑے صاف کر گئے سی ۔۔۔۔۔“ سردار جی کے اس انوکھے ٹوکے کے بعد ہم باعزت ائیرپورٹ کے باہر نکل گئے۔ البتہ ایک زندہ داری ایمیگریشن والوں نے ہمارے سر کر دی، اور وہ یہ کہ پاسپورٹ پر اندر اراج کا ٹپہ لگانے والوں کو ایڈی یلڈ میں ہماری رہائش گاہ کا پتہ درکار تھا۔ اس وقت تو کوئی پتہ ہمارے پاس تھا نہیں، کیونکہ ہوٹل بک کرنے والی ایجنسیاں تو ایمیگریشن اور کشم وغیرہ گزرنے کے بعد ہی ہوتی ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ہم تینوں کو ایک ایک لفافہ تھما دیا۔ جس پر ایمیگریشن کا پتہ بھی چھپا ہوا تھا اور ڈاک کے نکٹ بھی لگے ہوئے تھے۔ شرپنچے کے بعد اپنے ہوٹل کا پتہ لکھ کر اس لفافے میں ڈال کر پوسٹ کرنے کی زندہ داری ہماری تھی۔

سکھ مرد تو موروں کی طرح بڑے خوبرو ہوتے ہیں۔ لیکن سکھ عورتیں مورنوں کی طرح اکثر صرف گزارہ ہی ہوتی ہیں۔ تاہم سردار جی کی بیٹی جو انہیں ائیرپورٹ پر لینے آئی تھی سرپا حصہ اور شباب تھی۔ شاید اسی لئے دل پھینک درویش اول جھٹ سے سردار جی کے گرد منڈلانے لگا تاکہ ان کی بیٹی سے تعارف ہو سکے۔ اور تعارف یقیناً ہوا۔ سردار جی نے اپنی بیٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے درویش اول سے کہا۔

”میٹ یور سسٹر کلیفت۔“ یعنی اپنی بیٹی بننے کی لیگیت سے ملو۔ درویش اول کا مصانعے کے لئے بڑھا ہوا ہاتھ ایکدم بخ ہو گیا اور اس کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ درویش دوم اور میں تو محفوظ قاطلے پر کھڑے رہے تاکہ کلیفت کا بھائی کملانے سے فوج نکلیں اور خدا کا شکر ہے کہ ہم دونوں بال بال بخ گئے۔ شاید اس بات کا بھی درویش اول کو شدید غم تھا۔ مگر یہ تو درویش اول کے غنوں کی صرف ابتداء تھی۔ جب سردار جی نے اپنی گاڑی میں شرپنچا نے کے لئے لفت دی تو کھیانے سے درویش اول کو سردار جی کے

دستی سامان، جگا وزن ایک من ہو گا، گھینٹتے ہوئے ہمارے پاس بخ گئے اور آدمی آسمان کی اوپرچاری سے بولے ”اوکی گل آشنزا دیو،“ ایتنے رک گئے او.... کہتے آشٹیلیا دا ویجا لیتا تے نئیں بھل گئے؟۔“ نہیں سردار جی ایسہ گل نئیں .... ساڑا ایسہ یار اپنے نال تاج پھل لیا بیٹھا اے ....“ میں نے اپنا ماجرا سناتے ہوئے سردار جی کی طرف مشورہ طلب نگاہوں سے دیکھا۔

”کوئی گل نئیں کاکا“ سردار جی نے درویش دوم کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”فل ایں ڈبے وچ سٹ دے۔“ درویش دوم نے جھلا کر کہا۔ ”سردار جی پھل ہوں تو پھینکو۔“

”او جھیلو جد فل نئیں تے فیر فکر کا دا“ درویش دوم نے مزید تملکا کر کہا۔ فکر جسمانے کا ہے سردار صاحب اس لئے کہ پھل ہیں -- اب سردار جی کو بھی تیش آگیا اور مجھے یقین ہے کہ اگر اسے میرے فارمانیست ہونے کا لحاظ نہ ہوتا تو وہ درویش دوم کی اس احمقانہ گفتگو پر اسے اپنے سامان کے ساتھ کھیستا ہو اے جاتا۔ مگر انہوں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے درویش دوم سے پوچھا ”اوے کاکا! اک گل دس فل تیرے کوں ہے کہ نئیں؟“

سردار جی کے غصے سے مرعوب ہو کر درویش دوم نے تقریباً ”گز گزاتے ہوئے جواب دیا ”سردار جی پھل تو ہیں۔ مگر وہ میرے بیگ میں ہیں اور وہ بیگ کشم کے احاطے میں آئے گا۔ اب آپ ہی تائیں میں پھل اس ڈبے میں کیسے پھینک دوں؟“ درویش دوم کی یہ معصوم اور کھنی بات شاکن سردار جی کو موم کر گئی اور انہوں نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”پت جی! فیر فکر دی کوئی گل نئیں۔“ اور اس کے بعد واقعی فکر کی کوئی بات نہ رہی۔ کیونکہ جو نہی درویش دوم کا سامان کشٹر کے احاطے میں پنچا۔ سردار جی نے اسے انہاں نکالنے کو کہا۔ درویش دوم نے ڈرتے ڈرتے پھل نکالے اور سردار جی کے حوالے کر دیئے۔ انہوں نے بڑی ہی چا بدستی

ایک طاڑانہ نگاہ ڈالی جاسکتی ہے، سو یہم نے کیا اور شر سے جان چھڑا لی۔ ہاں ایک جگہ جو ہم بڑے شوق سے دیکھنے گئے وہ وہاں کی نور زم یونیورسٹی ہے۔ نور زم یونیورسٹی ہمارے لئے بڑی حیرانی کی بات تھی کہ آخر سیر پائلے میں پڑھانے لکھانے والی کیا بات ہے۔ سیر تو کورا ان پڑھ بندہ بھی کر سکتا ہے پھر اس میں علامہ ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ چنانچہ ہم یونیورسٹی کے شعبہ پلک ریلیشنز میں جا پہنچے۔ درویش اول نے وہی پرانا پی۔ آئی۔ اے والا راگ چھیڑ دیا۔ حالانکہ اس قسم کے ڈرامے کی وہاں کوئی ضرورت نہ تھی۔ کیونکہ یونیورسٹی کی پلک ریلیشنز فیپارٹمنٹ تھی ہی اس لئے کہ جو لوگ یونیورسٹی دیکھنا چاہیں یا اسکے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہیں وہ سب ان کو فراہم کرے۔

چنانچہ یونیورسٹی دکھانے کے لئے اور یونیورسٹی کے بارے میں کچھ بتانے کے لئے میرلن ہماری گھینڈ تھی۔ میرلن سے ملاقات کیوجہ سے ہمیں کئی فائدے ہوئے۔ یونیورسٹی کے بارے میں دلچسپ اکشافات تو ہوئے، اس کے علاوہ وہ لڑکی بذات خود بڑی دلچسپ ثابت ہوئی۔ وہ آسٹریلیا جانوروں کا مرکب سائگتی تھی۔ گردن ررافد جیسی، چال کیکنو جیسی اور چلن چل چلا۔ چنانچہ چند ہی لمحوں میں درویش اول اور دوم نے اس سے پکا وعدہ لے لیا کہ وہ شام کو انہیں کیسینوں یعنی جوئے خانے لے جائے گی۔

میرلن گوشکل سے تو پیدل ہی تھی مگر سیاحت پر پورا عبور رکھتی تھی، اور جب اپنے علم کی روائی میں آئی تو اس نے سیاحت کے بارے میں ایسے اکشافات کئے کہ ہم دیگر رہ گئے۔ سیاحت جسے ہمارے ملک میں سیر پائلے سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں دی جاتی اور جو لوگ سیر کے شو قین ہوں انہیں اکثر آوارہ گرد بھی کہا جاتا ہے درحقیقت ایک بہت بڑی صنعت ہے جو موجودہ صدی میں تو دنیا کی دوسری تمام صنعتوں کے مقابلے میں دوسرے نمبر پر آتی ہے، مگر اکیسویں صدی میں صرف اول کی صنعت ہو جائے گی۔ ترقی یافتہ ممالک میں ۸۰ فی صد لوگ ہر سال سیاحت کے لئے

پہلو میں اگلی سیٹ پر جگہ ملی اور ہم دونوں کو کلیجت کے پہلو میں پچھلی سیٹ پر۔ ادھر سردار جی درویش کا انٹرویو لیتے رہے ادھر ہم کلیجت کا انٹرویو لیتے رہے۔ اور یہ معلومات حاصل کر لیں کہ سردار جی کے ریستوران کا نام بینگل ہے اور کلیجت اس ریستوران کی فیbrig ہے۔ وہ صبح دس بجے سے دوپہر چار بجے تک اور شام سات بجے سے رات بارہ بجے تک ریستوران میں ہوتی ہے۔ ہم نے تو چکے سے ریستوران کا ٹیکنی فون نمبر بھی لے لیا۔ درویش اول کلیجت سے ہماری کھسپہ سرپر بڑے پیچ و تاب کھا رہا تھا، مگر وہ سردار جی کی باتیں سننے پر مجبور تھا اور ہم اسکی مجبوری سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہے تھے۔ کوئی آدھے گھنٹے کی ڈرائیور کے بعد ہم ایڈی میلڈ کی میں شاہراہ کنگ ولیم سٹریٹ پر تھے۔ مگر یقین جانے کلیجت کی قربت میں وہ آدھا گھنٹہ پانچ منٹ میں گزر گیا۔ اور جب کلیجت گئی تو ایسا لگا جیسے گل دل جیت گئی۔

جب تک ہم لوگ ایڈی میلڈ پیچے تک ہماری چھیٹیاں بھی آدمی ختم ہو چکی تھیں اور خرچے بھی۔ چنانچہ درویشوں کی تین رکنی کابینہ نے ہنگامی اجلاس طلب کیا تاکہ باقی چھیٹوں کی منصوبہ بندی ہو سکے اور خرچے کا بجٹ بن سکے۔ نئے منصوبے کے تحت ایڈی میلڈ کے حصے صرف دو دن آئے۔ حالانکہ درویش دوم اور میں نے بڑی کوشش کی کہ یہاں قیام میں کچھ اضافہ ہو سکے، مگر درویش اول نے ڈٹ کر مخالفت کی۔ اور حیرت کی بات یہ ہے کہ اس سارے جھگڑے فادا کی جڑ کلیجت تھی۔

ویسے بھی ایڈی میلڈ کو ایک میل کا شہر کہا جاتا ہے۔ کیونکہ دس لاکھ کی آبادی کے اس شہر میں ہر کام کی شے اسی ایک میل کے اندر اندر فراہم ہو جاتی ہے۔ جہاں تک تاریخی مقامات کا تعلق ہے وہ بھی میں شاہراہ کنگ ولیم سٹریٹ اور کٹوریہ چوک کے گرد و نواح میں واقع ہیں۔ اور تاریخی مقامات بھی کیا ہیں۔ جس شہر نے خود ۱۸۳۷ء میں جنم لیا ہو وہاں آثار قدیمه تو ہونے سے رہے۔ البتہ چند بار عرب قسم کی ٹھوس عمارتیں ضرور نظر آتی ہیں۔ جن میں ناؤن ہاں، جزل پوٹ آفس، پرمیم کوٹ اور چرچ شامل ہیں۔ مگر ان عمارتوں کی سیر تو نہیں کی جاسکتی بس سڑک سے گزرتے ہوئے

اور تو سکول ہیں، جہاں سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں طلبہ کو سیاحت کی تعلیم دی جاتی ہے۔ بد قسمتی سے پاکستان میں اس صنعت کی کوئی وقعت نہیں۔ نہ عوام اسکو سمجھتے ہیں نہ ہیر و کریش اس کو سمجھتے ہیں اور نہ ہی سیاسی راہنماء۔ شام کو ہماری منزلیں جدا جدا تھیں۔ درویش دوم قمار اور جوئے کا شیدائی تھا۔ درویش اول اگرچہ لڑکوں کا شیدائی تھا، مگر ایڈیٹ میلڈ میں آمد پر ہی چونکہ اسے کلیت کا بھائی بننا پڑ گیا تھا اس لئے اس نے پرانے فارموں لے *Unlucky in love* *lucky In Gambling* یعنی محبت کا بد قسمت جوئے کا دھنی ہوتا ہے، پر عمل کرتے ہوئے میرلن کے ساتھ کیسینوں کا پروگرام بنایا۔ میرے لئے کیسینوں کوئی نئی بات نہیں، کیونکہ میں بہت پہلے مانی کارلو کے کیسینوں میں ایک مرتبہ قسمت آزمائی کر چکا تھا۔ اور پچی بات یہ ہے کہ ایڈیٹ میلڈ میں اگر میں کیس اور کسی پر قسمت آزمائی کرنا چاہتا تھا تو وہ کلیت اور اسکا ریستوران تھا۔ چنانچہ شام ڈھنے جب درویش اول اور دوم میرلن کا انتظار کرنے لگے تو میں کلیت کے جسم و جوانی کے بارے میں دھنک رنگ منصوبے بنانے لگا۔ آخر میرلن آئی۔ اس نے دونوں درویشوں کو خوش کرنے کے لئے سازھی پہن رکھی تھی۔ وہ تو دونوں درویشوں کو ہائکٹی ہوئی کیسینوں لے گئی اور میں چل دیا۔ بینگل ریستوران۔

بینگل ریستوران کی زیارت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اسکی چھت سے رنگ برنگ کا نجخی کی چوڑیوں کے سمجھے لٹکے ہوئے تھے اور ان گچھوں میں بھل کے قمیتے اس انداز سے چھپائے گئے تھے کہ روشنی کے روشنی کے کافی تابنے کے برق، چیکر میں روٹیاں، دسکی کھنڈی کے کپڑے کے میز پوشاں اور نیپکن۔ غرہنک پورا کا پورا ماہول دسی اور دسی ماہول کے سونے پر سوہاگن کلیت نے ائیر پورٹ والی جیزز اور بلاوز کی جگہ شلوار قیض پہن رکھی تھی۔ گودہ کناری والا دوپٹہ اور بالوں کی سیاہ زلفوں کو سیلیتے سے سیئنے والا شہری پراندہ۔ اگر کوئی ہیر ہوگی تو کلیت سے بہتر نہ ہوگی۔ کلیت کی چال

نکلتے ہیں اور ایک معقول رقم خرچ کرتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق سیاحت کی صنعت میں خرچ کی گئی سالانہ رقم سامان جنگ پر خرچ کی گئی رقم سے کہیں زیادہ ہے۔ خدا کرے دنیا میں ایسا وقت آئے کہ دنیا کی ہر صنعت سامان جنگ سازی کی صنعت سے آگے نکل جائے، کیونکہ اسی میں انسانیت کی بقا ہے۔

ایڈیٹ میلڈ کی نور زم کی یونیورسٹی میں تین سال کا ٹپومہ کورس اور پانچ سال کا ڈگری کورس دیا جاتا ہے جس میں سیاحت کے مختلف شعبوں کے بارے میں بڑے جدید خطوط پر تعلیم دی جاتی ہے۔ اور اس تعلیم کو حاصل کرنے کے لئے دور دراز کے ممالک سے طلبہ آتے ہیں۔ ہمارے پڑوی ملک چین میں بھی سیاحت کی دو یونیورسٹیاں



ہوئے اس ہوائی پل صراط کو پار کر گئے۔ گو سڈنی آئریلیا کا سب سے قائم اور آبادی کے لحاظ سے بڑا شہر ہے، مگر ایڈیلیڈ کی طرح ہوائی اڈہ سیدھا سادہ سا ہے۔ بنیادی سوتیں اور ضرورتیں تو سب پوری کرتا ہے مگر ہوائی اڈوں والی شوشا نیں دکھائی دیتی۔ مثلاً پاکستانی ہوائی اڈوں پر جائیں تو مسافروں اور مسافروں کے وارثوں پر باقاعدہ رعب اور دبدبہ پڑتا ہے۔ ہماری شاہین نگاہ سیکیورٹی فورس کی ایکسرے کرتی آنکھوں سے نج کر کوئی نہیں نکل سکتا۔ خصوصاً معموم اور شریف شری تو ادھرن گاؤں میں جاسکتے ہیں اور نہ پیدل۔ کیونکہ ہماری حکومت نے ہمارے لئے دنیا ہی میں پل صراط پار کرنے کی رسیسل کا بندوبست کر دیا ہے۔ اس لئے جب تک مسافر جزا تک پہنچتا ہے اس کے سب پاپ دھل جاتے ہیں۔ سامان اور جسم ہلاک ہو جاتا ہے اور اس طرح وہ خوشی خوشی اپنی منزل کو روانہ ہو جاتا ہے۔

گو ہسپانوی اور پرتگالی ممم بوجو آئریلیا کے مغربی اور جنوبی ساحلوں پر برطانوی کیپشن گک سے بہت پسلے پہنچے تھے مگر وہ ساحل چونکہ بالکل غیر آباد تھے اس لئے وہ لوٹ گئے۔ خوش قسمتی سے کیپشن گک آئریلیا کے مشتری ساحل پر پہنچا جہاں سبزہ بھی تھا اور پانی بھی۔ چنانچہ وہ موجودہ سڈنی کے ساحل پر لنگر انداز ہوا۔ بندرگاہ کا نام بیکسن اور آبادی کا نام سڈنی رکھا اور یوں ایک نئے ملک کی بنیاد ڈال دی۔ اسی دور میں امریکہ، برطانیہ کے چنگل سے آزاد ہوا اور برطانیہ کے خطہ باک مجمموں کو دیں۔ کنالا دینے کے لئے نئے علاقے کی تلاش تھی جو آئریلیا کی دریافت نے پوری کر دی۔ لہذا آئریلیا دریافت ہونے کے صرف اٹھارہ سال بعد یعنی ۱۸۸۷ء میں مجمموں کا پہلا جہاز فرست فلیٹ سڈنی میں بیکسن کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا اور یوں سرکار برطانیہ کا اس نئے خطے سے رشتہ جڑ گیا۔ سڈنی کے شرکو بندرگاہ نے دو حصوں میانگ اور جنوب میں تقسیم کر دیا ہے اور دونوں حصوں کا ملکاپ ہاربر برج کے ذریعے سے ہوتا ہے جو ۱۹۳۲ء میں تعمیر کیا گیا۔ یہ اتنا بڑا پل ہے کہ اسے سمندر کی مرطوب ہوا کے سبب زنگ سے بچانے کے لئے رنگ ساز متواتر رنگ کرتے رہتے ہیں اور جو نی پل کے

میں بیٹھ دیا گئی کی روائی تھی۔ اور مجھے یقین ہے کہ ریسٹوران میں بیٹھے ہوئے بت سے نوجوان گلگیت کے لئے کان چھدوا کر رانجھا بننے کو تیار ہوں گے۔ کیونکہ ریسٹوران فل تھا۔ مجھے بھی اس نے کاؤنٹر کے قریب ایک سٹول پر بٹھا دیا اور زیرہ پانی کا گلاس تھا تھے ہوئے کہا۔ ”یہ اپنائنازر ہے اس سے بھوک بڑھتی ہے۔“ اسکے بعد وہ مجھے مسلسل زیرہ پانی پلاتی رہی۔۔۔ بھوک اور پیاس بڑھاتی رہی۔۔۔ ریسٹوران بند ہوتا رہا کھلتا رہا۔۔۔ میں آتا رہا جاتا رہا۔۔۔ اور ایڈیلیڈ میں مختصرے قیام کے دوران میں نے گلگیت کے لئے بینٹل ریسٹوران کے اتنے پھیرے لگائے کہ مجھے یقین ہے کہ اس کے پھیرے لینے والا بھی اتنے پھیرے نہیں لگائے گا۔

بھالو نما درویش دوم اور کینگڈ نما میرلن ایک دوسرے سے اتنے ماوس ہوئے کہ وہ سڈنی روائی کے وقت ائیپورٹ پر نظر آئے۔ درویش اول نے محبت میں تو مات کھائی مگر کیسینوں میں اس قدر کامیاب رہا کہ ہمارے باقی سفر کا بجٹ ورلڈ بک اور آئی ایف IMF سے قرضہ لئے بغیر ہی معمول ہو گیا۔ اس شر میں اگر کوئی خسارے میں رہا تو وہ میں تھا۔ کیونکہ زیرہ پانی پی کر میں پاکل ہو گیا۔ اور مجھے جب ایڈیلیڈ کی بیاد آتی ہے تو زیرہ پانی کی بیاد آتی ہے۔

چند گھنٹوں کی پرواز کے بعد ہم سڈنی کے کنگز فورڈ سمنٹ ائیپورٹ پر اترنے کی تیاری کر رہے تھے۔ اترتے وقت شر کے خوب نظارے تھے۔ بہرہ زار میں گھرے ہوئے سرخ چھتوں والے گھر۔۔۔ نمانے کے تالاب۔۔۔ میں کے گراونڈ اور کھللوں کے وسیع میدان۔۔۔ درختوں کے جھنڈ اور پارک۔۔۔ سرخ، سبز اور نیلا سمندر۔۔۔ سمندر کے اندر تک بننے ہوئے ”رن وے“ پر اترے تو کچھ لمحوں کے لئے تو ایسا محسوس ہوا کہ پاٹک نے غلطی سے جہاز سمندر میں اتار دیا ہے۔ درویش اول نے سیٹ کے نیچے رکھی ہوئی لائف جیکٹ تک سنجال لی۔ مگر دوسرے ہی لمحے ہوائی اڈے کی عمارت سامنے تھی اور ہماری سب گلگریں کافور ہو گئیں۔ چونکہ یہ اندر وون ملک پرواز تھی اس لئے ہمیں نہ کشم کا ڈر تھا نہ ایمگریشن کا خوف۔ چنانچہ ہم دنہاتے

ایک سرے سے دوسرے سرے تک رکنا ختم کرتے ہیں تو انہیں پھر سے وہ عمل  
دہرانا پڑتا ہے اور یوں زنگ اور رنگ کی جنگ جاری رہتی ہے۔

سگنر کراس، سٹنی میں گناہوں کی بستی ہے جہاں گناہ بے لذت بھی ہوتے ہیں  
اور بالذات بھی۔ ڈارلینگ ہرست گناہوں کی اس بستی کی بدنام گلی ہے اور پلازہ ہوٹل  
گناہوں کی بستی کی اس بدنام ترین گلی میں واقع ہے۔ جس ہوٹل میں درویش اول  
نے ایپورٹ کی ابجنسی سے ہمارے لئے کمرے بک کروائے ہاں ہوٹل میں واغہ میں  
روڈ کی بجائے ایک ننگ و تاریک گلی سے ہوتا ہے، جس سے اس ہوٹل میں قیام پذیر  
ہونے والے لوگوں کی نیتوں اور حرکتوں کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ہم نے دو  
راتوں کے لئے دو کمرے بک کرائے تو کمرے اور ناشتے کا مل پیشی ادا کرنا پڑا، کیونکہ  
ہوٹل والے جانتے ہیں کہ گناہوں کے سوداگر راتوں کو اکثر چپکے سے لوٹ لئے جاتے  
ہیں۔ چنانچہ پوچھی لئے سے پہلے وہ اپنا کرایہ وصول کر لیتے ہیں۔ کمرے میں پہنچتے ہی  
درویش اول نے میلیوں گھمایا۔ کسی سے اردو میں بات کی اور دو گھنٹے میں ملاقات کا  
 وعدہ کر کے میلیوں بند کر دیا۔ ہم دونوں کی سوالیہ نگاہوں کا جواب دیتے ہوئے  
درویش اول نے کہا۔ ”بھتی کراچی میں کسی دوست نے میں بھائی کا میلیوں نمبر دیا تھا  
اور کہا تھا کہ فون کر لینا وہ تمہیں سٹنی کی سیر کردارے گا۔ میں بھائی دو گھنٹے میں پہنچنے  
والے ہیں۔ اس لئے تم جلدی سے تیار ہو جاؤ تو سیر کو نکلتے ہیں۔“ چنانچہ ہم جلدی  
سے تیار ہو گئے۔

آسٹریلیا میں اخبارہ سال کی رہائش نے میں بھائی کے ٹیکے پر ذرہ برابر اڑنہ کیا  
تھا۔ باچھوں سے بھتی ہوئی پان کی پیک، سرپر محمل کی دوپلی نوپی، پاجامہ نما سفید پتلون،  
بلنچ نما پاپوں میں ستری چپل اور بھکے مارٹی ہوئی عطر کی خوشبو۔ میں بھائی ہم سب سے  
یوں بغلگیر ہوئے گویا صدیوں کے پھرے ساتھی مل رہے ہوں۔ حالانکہ ان سے  
ملاقات محض چند لمحے پیشتر ہوئی تھی۔ میں بھائی کے خلوص کی طرح ان کے عطر کی  
مہک بھی ہم سے یوں بغلگیر ہوئی کہ پچھا چھڑانا دشوار ہو گیا۔ سٹنی کی سیر میں بھائی

کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھی، کیونکہ ایک تو ہر شر میں چند ایک مقامات ہی ایسے ہوتے  
ہیں جو ہر سیاح کو قسمی طور پر دیکھنے پڑتے ہیں۔ دوسرے میں بھائی کے اخبارہ سالہ  
قیام میں سیکنڈوں ہمارے جیسے پاکستانی سٹنی آئے ہوئے جن کے پاس کراچی کے  
دوست کا دیا ہوا سفارٹی سیاحتی رقمہ ہو گا، جس کے سبب انہیں سٹنی کی سیر کرانی پڑی  
ہو گی چنانچہ انہوں نے لمبی تمهید باندھے بغیر ہی ہمیں شام تک کا پروگرام بتایا اور وقت  
ضائع کے بغیر ہی اپنے ساتھ لے کر چل دیئے۔

میں بھائی کی گاڑی کی ایک چلتا پھرتا شور تھی جس میں باستی چاولوں کے تھیلے،  
گرم مالے، سرخ مرچیں، چائے کے ڈبے، اچار کی بوتلیں اور پلاسٹک کے تھیلیوں  
میں بند حلال کی ہوئی مرغیاں ٹھنڈی ہوئی تھیں۔ درویش دوم اور مجھے اس بند پک  
اپ کے پچھلے حصے میں بند ہونا پڑا۔ سیٹوں کے نیچے اور اوپر ہر سو اور ہر جا سامان ہی  
سامان تھا۔ مجبوراً ہمیں سامان کے اوپر ہی بیٹھنا پڑا۔ درویش دوم کو تو باستی چاولوں  
کی سیٹ ملی اور مجھے حلال مرغیوں پر بیٹھنا پڑا۔ شور کی حفاظت کے طور پر میں بھائی  
نے پک اپ کے پچھلے حصے کے شیشے کھڑکیاں بند کروا دیں تھیں۔ چنانچہ جب انہوں  
نے ہملا دروازہ بند کیا تو ہم پر قرسا اندر ہمراچا گیا۔ البتہ ہمارے اور پک اپ کی  
اگلی سیٹ کے درمیان لو ہے کی ایک مضبوط جالی تھی۔ جس کے سبب ہم تک روشنی  
بھی پہنچ رہی تھی اور ہوا بھی۔ اور درویش اول جو نبی میں بھائی کے ساتھ اگلی سیٹ  
پر بیٹھنے لگا تو مرغیوں نے کرام مچا دیا۔ درویش اول اچھل کر گاڑی سے باہر کو دیکھا۔  
ذرع شدہ مرغیاں کیونکہ زندہ ہو گئیں؟ ہم تینوں جیزان تھے۔ گر میں بھائی نے تسلی  
دیتے ہوئے کہا۔ ”گھبرانے کی کوئی بات نہیں، یہ زندہ مرغیاں تو یہاں قریب ہی ایک  
resturant میں پہنچانی ہیں۔ اسکے بعد پوری سیٹ خالی ہو جائے گی۔“ اور کسی کو ہونہ  
ہو مجھے تو میں بھائی کی بات سے فوراً تسلی بھی ہو گئی اور خوشی بھی، کیونکہ درویش اول  
مرغیوں کے جھرمت میں تھا۔

سٹنی کی اس انوکھی سیر کے دوران انکشاف ہوا کہ میں بھائی درحقیقت شر

اور درویش اول سُنْفی کے ریستورانوں میں مرغیاں پائٹے کی نہادت میں جھکا ہوا تھا۔ دیسے لگ یوں رہا تھا کہ ہم لوگ ٹکلٹک میں جھکے ہوئے ہیں۔ ٹکلٹک تو گیا بھاڑ میں ہمیں میمن بھائی سے جان چھڑانے کے لائے پڑے ہوئے تھے۔ مگر خاموش صرف اس لئے تھے کہ میمن بھائی کا گودام خدا خبر سُنْفی کے کونے ویران کونے میں واقع تھا جہاں سے ہوش تک پیختے کے لئے انکی راہنمائی لازمی تھی۔ لہذا ہم چپ سادھے سولی پر چڑھ گئے۔ فلیٹ میں پیختے ہی خود تو وہ کھانا تیار کرنے میں مصروف ہو گئے اور اپنے چار سالہ بیٹے رب نواز اللہ والا کو ہماری خاطر تواضع پر مامور کر دیا۔ اس ہونماں پیکے نے نرسری کی ساری نظمیں، اکائی دہائی کے پھاڑے اور دنیا بھر کے لٹینے اور کہانیاں ہمیں سنائیں، اور ہم نے پوری توجہ سے سنیں۔ گودام ہمارا یہ چاہ رہا تھا کہ یا خود بھرے ہو جائیں اور یا اسکا گلا دیا دیں۔ ابھی ہم اسکی پہلی یلغاری سے نہ سنبھلے تھے کہ اس ست مریض نے درویش اول پر خاطر تواضع کا ایک اور وار کیا۔ اب تک میمن بھائی بھی پیلے رنگ کے شرپت کے گلاس ہمارے ہاتھوں میں تھا جکے تھے۔ ان کے عطر کی طرح اسکے شرپت کی مٹھاس بھی بن پئے ہی محسوس ہو رہی تھی۔ ہاں تو بات رب نواز اللہ والا کی ہو رہی تھی۔ وہ معلوم، درویش اول کے چونوں میں بیٹھ کر ان کے جوتے اتارنے گا۔ درویش اول نے پاؤں ادھرا دھر سر کانے کی کوشش کی تو میمن بھائی نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ جوتے اور جراں میں اتارنا پچے کا مشغله ہے اور اگر اسے ایسا کرنے سے منع کیا جائے تو وہ بہت روتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ پچے کا مشغله صرف جوتے اور جراں ہی اتارنے تک محدود تھا۔

شام ڈھل چکی تھی جب میمن بھائی سے ہم نے خلاصی پائی۔ وہ تو دوسرے دن سُنْفی کے گرد و نواح کے علاقے میں سیر کی دعوت دے رہے تھے مگر ہم نے گڑ گڑا کر الجا کی کہ کل ہمیں پی آئی اے کے میغیر سے ملتا ہے اس لئے ان کی سیر کی دعوت کسی صورت قبول نہیں کر سکتے۔ جس پر مايوس میمن بھائی نے وعدہ لے لیا کہ کبھی آئندہ سُنْفی آئیں تو ضرور فون کریں گے۔

کے مختلف ریستورانوں کو سامان پلاٹی کرتے ہیں اور یوں پورے شر میں گھوم کر ڈبلوری دینا ان کا روز کا معمول تھا۔ چنانچہ پلاٹاپ آیا تو میمن بھائی نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے درویش اول کو اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”بھائی صاحب اگر تکلیف نہ ہو تو سڑک کے اس پار وہ سامنے ریستوران میں دس مرغیاں پہنچا دیں۔ دیسے میں خود چلا جاتا مگر یہاں سالا پارکنگ کا بیرا لفڑا ہے۔“ اس سفر میں بار بہداری کا کام صرف مجھ سے لیا جاتا تھا۔ نخیلا درویش اول تو بریف کیس اٹھانے پر بھی لاکھ خرخے کرتا تھا۔ اب اسے مرغیاں اٹھانی پڑ رہی تھیں اور مرغیاں بھی زندہ، جن کے شور و ہنگامے نے ہر را گہر کو درویش اول کی طرف متوجہ کر دیا، جو درویش اول کے لئے شرم سے ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ شاید اسی بوکھاہت میں وہ بلا جھبک بتتے ٹریفک کے باوجود سڑک پار کر گیا۔ حالانکہ سڑک پار کرنا درویش اول کی زندگی کا اہم ترین مسئلہ تھا۔ میمن بھائی کو وقت پر ڈبلوری پہنچانے کی جلدی تھی۔ چنانچہ وہ کلی دبائے جا رہا تھا۔ ہم دونوں پک اپ کے پیچھے کبھی آپس میں اور کبھی سامان سے گھنٹم گھنٹا ہو جاتے تھے۔ شرم سے شرابور اگلی سیٹ پر درویش اول آئکھیں جھکائے بیٹھا تھا۔ سُنْفی کی شاہراہیں، گلی کوچے اور بازار پلک بھکتے میں گزر رہے تھے۔ ایک جھلکی سُنْفی کی موجودہ پچان اوپرہا ہاؤس کی دکھائی دی۔ اوپرہا ہاؤس کی عمارت مجھے تو پکھا ایسے گلی جیسے تین دیو قامت کچھوے ایک دوسرے کے اوپر سوار ہو کر سمندر کی لمبیں گن رہے ہوں۔ پھر ہار بر برج سے گزر ہوا اور بڑی دیر تک گزر ہوتا رہا، کیونکہ یہ پل کم بجنت ختم ہونے ہی میں نہ آتا تھا۔ ۳۲۹۸ سے پہلے جب اوپرہا ہاؤس کا اقتتاح نہیں ہوا تھا تو ہار بر برج ہی کو سُنْفی کی پچان تصور کیا جاتا تھا۔ خدا خدا کر کے ہار بر برج بھی ختم ہوا، میمن بھائی کی سُنْفی بھی ختم ہوئی اور ہماری سیر بھی۔ مگر ہماری دشواری ابھی باقی تھی، کیونکہ میمن بھائی نے اپنا موبائل جذل شور اپنے گودام پر لا کھڑا کیا۔ اسی گودام کی بالائی منزل پر میمن بھائی کا گھر تھا، جہاں وہ ہماری خاطر تواضع کرنے کے لئے ہمیں لے گئے۔ درویش دوم اور میں تو دیگن کی سواری کی تکلیف سے جھکے ہوئے تھے

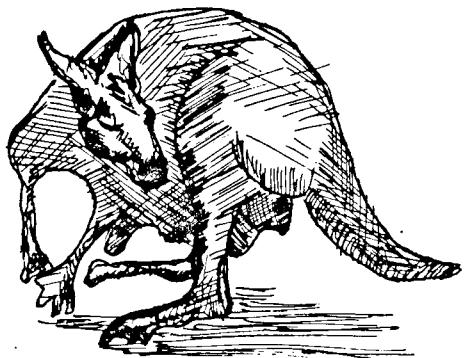
رن پڑا۔ جنگوں میں صرف درندگی کی فتح ہوتی ہے۔ انسانیت تو ہر صورت میں مغلست ہی کھاتی ہے۔ اس جنگ کی یاد میں ایل این کے مقام پر جرمنوں، اطالویوں اور اتحادیوں کی یادگاریں ہیں، جہاں کتوں پر ہزاروں مخصوصوں کے نام ہیں جو درندگی کا شکار ہوئے۔ اپنے برطانوی آقاوں کی خاطر سینکنڈوں پاک و ہند کے نوجوانوں نے بھی دہاں جانیں قربان کیں۔ ممکن ہے ایل این کی جنگ میں کچھ آشہلوی بھی شامل ہوئے ہوں، جن کی یاد میں ایل این کا فوارہ سینکنڈ کراس میں بنایا گیا ہو۔

مجھے سینکنڈ دیکھنے کا شوق تھا اور درویش دوم کو شاپنگ کا۔ میں بھائی کے ہاتھوں سیر کی رسوائی ہونے پر درویش اول اس قدر نادم تھا کہ اس نے بعیت کی ناسازی کا بہانہ بنا کر ہوٹل ہی میں آرام کرنے کا اعلان کیا۔ چنانچہ میں نے تو ہوٹل کے کاؤنٹر سے چالمرز ٹریول کمپنی کا گورنگ گائی نیشنل پارک کا ٹور بک کیا اور ہنری سٹریٹ پر کمپنی کے دفتر پہنچ گیا۔ جہاں سے بس کو روانہ ہونا تھا۔ ویسے اگر باعزت ہوٹلوں میں قیام گاہ ہو تو بس والے ٹورسٹوں کو ان کے ہوٹل سے بھی اٹھاتے ہیں۔ ظاہر ہے پلازہ ہوٹل میں اٹھانے کے لئے بھلا کس کو آنا تھا۔ ہماری آرام دہ ائمہ کنڈیش بس میں ہمارے علاوہ اور اکیس سیاح تھے جن میں پندرہ سولہ تو جاپانی تھے۔ یہ جاپانی بھی عجیب مخلوق ہیں۔ دنیا کے ہر کونے میں پائے جاتے ہیں اور بھیڑوں کے رویڑ کی طرح اپنے گذریے کے اشاروں پر چلتے رہتے ہیں۔ باقی سیاحوں میں کچھ امریکن، کچھ جرمن، کچھ اطالوی اور کچھ برطانوی تھے۔ مگر مزے کی بات یہ تھی کہ میں واحد دسی سیاح تھا۔ جو دوسرے سیاحوں کے لئے بڑی دلچسپی کی بات بنا ہوا تھا اور وہ تو درحقیقت ایک نکٹ میں دو دنے لے رہے تھے۔ ویسے ہم پاکستانیوں کے لئے قدرتی نظارے کوئی کشش نہیں رکھتے، کیونکہ ہم میں سے کثیر تعداد ایسے لوگوں کی ہے جنہیں اپنے ملک کی سربراہ پہاڑی چوٹیاں، سربراہ دیاں، گلستانے ہوئے چیزوں، شیش نما جھیلیں، لکارتے ہوئے برفلی دیا، گلیشیز اور حد نظر تک پھیلے ہوئے صمرا اور سمندر کبھی نہیں بھاتے۔ ہم جب جاتے ہیں اور جہاں جاتے صرف شاپنگ کے لئے ہی

سینکنڈ کراس کی گناہوں کی بستی پورے جوین پر تھی۔ امریکی بھرپور کے ملاح غول در غول ڈارلنگ ہر سٹ سٹوٹ میں ہر سو پھیلے ہوئے تھے۔ جب کوئی امریکن جہاز سڑنی کی بندرگاہ میں لنگر انداز ہوتا ہے تو گناہوں کا کاروبار چک اٹھتا ہے۔ ہم کرے کی سکین گاہ سے گناہ بے لذت اٹھا رہے تھے۔ یچے رنگ برنگ جلتے بجھتے نیو ان سائینوں کے سائے میں نیم بہنہ جسم جس کا اشتخار بنے کھڑے تھے۔ کیس پیپ شو، کیس جنسی قلمیں اور کیس سچ پر جنسی کھیل، تماشا یوں کو جنسی اشتغال دلا رہے تھے تاکہ وہ کرائے کے جسم خرید سکیں۔ پھر کیس پھکرے آرٹسٹ بیر کی بوتل کے بدله پورٹریٹ ہنارہ ہے تھے۔ کیس جادو گر منہ سے آگ نکال کر پیٹ کی آگ بخانے کے لئے کرتے کر رہے تھے۔ کیس جسموں کے اس بازار میں بازیگر جسموں کے کرتب دکھا رہے تھے۔ کیس جپی عورتیں را گیروں کو گھیرا ڈالے قسمت کے حال بتانے میں مصروف تھیں۔ کیس کوئی مویقار فٹ پاٹھ پر کپڑا بچھائے اس بے ہمت مخلوق کو مویقی کی دھنیں ناکر سکے وصول کرنے کی تگ و دو میں تھا۔ کیس کوئی آسٹریلین بوزھا اپنے کندھوں پر عمر اور گناہوں کا بوجھ اٹھائے شراب میں دھت لڑکھرا تا پھر رہا تھا۔ پھر اک سمت سے شور اٹھا۔ کچھ بدست ملاحوں کی آپس میں مٹھ بھیڑ ہو گئی۔ شراب کی خالی بو تلیں ہتھیار بن گئیں۔ کچھ چڑے سرخ ہو گئے کچھ جسم نیلے ہو گئے۔ اتنے میں یہیں بھاٹی پولیس پہنچ گئی۔ حالات پھر جوں کے توں ہو گئے۔ پوچھتے ہی گناہوں کی اس بستی کی آنکھیں چند ہیانے لگیں۔ ملاح اپنے اپنے جمازوں کو لوٹ گئے۔ جسموں کی جفاکش جس کے پیسے پونچھ کر اپنے اپنے فلیوں میں لوث گئی۔ نیم محرومی، شراب کی بو اور دھوئیں کی مٹک اڑا لے گئی۔ ڈارلنگ ہر سٹ کا کاروبار بند ہو گیا، لیکن ایل این کا فوارہ ابھی تک چل رہا تھا۔ بھلا ڈارلنگ ہر سٹ کے موڑ پر ابتدے اس فوارے اور مصر کے شر سکندریہ سے سو میل دور ایل این کے قبے میں کیا رشتہ ہو سکتا ہے؟ دوسری جنگ عظیم میں ایک طرف جزل رو میل کے جرمن نیک تھے اور دوسری طرف اتحادیوں کے جری جوان۔ ایل این کے صحرائیں گھسان کا

چھاگ لگ سکتا ہے۔ وہ خطرے کے وقت اپنے بچے کو بیٹ کے نیچے نہیں ہوئی تھیں میں ڈال کر بڑی تیری سے بھاگ جاتا ہے۔ مگر اس پارک کے کیکنو بڑے ہی مغار تھے۔ خاص طور پر بچوں سے تو ان کو خاصی الفت دکھائی دیتی تھی۔ گو کیکنو عام حالات میں تصویر کھنپوانے کو برا نہیں سمجھتا اور اچھے خاصے پوز ہاتا رہتا ہے، مگر ہمارے جاپانی گردپ کی فلیش گنوں اور کیمروں کے تابوتوڑ حملوں کی تاب نہ لاسکا اور وہاں سے کھک گیا۔ چنانچہ ہم لوگ بھی وہاں سے کھکے اور بس تک چنپنے کے لئے ڈھل مارچ شروع کی۔ اس سیر میں ایک تو میں نے کیکنو سے ملاقات کی اور دوسرے ہاکامورا سان، سے جنوں نے ٹوکیو کے بارے میں بولے ہی کار آمد اور قیمتی مشورے دیئے۔

سُنْنی میں رات گزارنا ہمارے لئے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ چنانچہ ہم تینوں اپنے کمرے کی کمین گاہ میں مورچے سنبھال کر بیٹھ گئے اور رات بھر گناہ بے لذت سے لطف اٹھاتے رہے۔ صبح سوریے سامان سمیٹنا اور ایئرپورٹ کی راہ اختیار کی، جہاں سے جہاز میں بیٹھ کر جاپان کے شرٹوکیو جانا تھا۔



جاتے ہیں اور وہی کام میرا دوست درویش دوم کر رہا تھا۔ کیونکہ قدرتی نظاروں اور جانوروں سے کمیں زیادہ اسے پٹ جو رج سٹریٹ کے سوروں میں دچھپی تھی۔ ادھر ہماری بس جب روانہ ہوئی تو ہماری گائیڈ نے معلوماتی اور واقعیاتی علم کا ایک سمندر ہمارے سامنے پھیلا دیا۔ ہاربر برج سے میں بھائی کی تنگ و تاریک پک آپ میں بھی گزرے تھے، مگر اب میں اور تب میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ میں نے جاپانی گردپ کے لیڈر ناکامورا سے دوستی کر لی، کیونکہ اسکے گردپ میں زیادہ تر زنانہ ریز گاری تھی۔ باقیوں میں ہماری جمہن بانڈ خصلت کے سبب یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ آسٹریلیا میں ان کا آخری دن تھا اور وہ ہماری طرح دوسرے دن جاپان ایسٹ لائنز کی پرواز سے ٹوکیو جا رہے تھے۔ چنانچہ اپنے ٹوکیو کے پروگرام کو رنگین بنانے کے لئے میں ناکامورا سان سے نتھی ہو گیا۔ سان جاپانی زبان میں مسٹریا جناب کی جگہ استعمال ہوتا ہے۔

سُنْنی کے شمال میں ۲۲ کلو میٹر کے فاصلے کو طے کرنے کے بعد گورنگ گاتی کا نیشنل پارک آتا ہے۔ مگر وہاں پہنچنے پہنچنے ساحل اور سمندر کے بولے ہی پر کشش نظارے ہیں۔ بجھے او قیانوس کے نیلگوں بننے کو چیرتے ہوئے بھری جماں آن جان منزوں کو روایا دواں تھے۔ ادھر پارک کی گلابی پیلی پھریلی زمین میں چھوٹی چھوٹی خاردار جھاڑیاں آگئی ہیں اور یا دیو قامت سفیدے۔ یہ سفیدے کے درخت پاکستان میں بھی آسٹریلیا ہی سے لائے گئے ہیں۔ اس وسیع پارک میں پیدل چلنے کے لئے کمی گزر گاہیں بنائی گئی ہیں، جن میں کئی ایک پر تو ہمارے گردپ نے بھی سفر کیا۔ آخر کار میں اس جگہ پہنچا جو میرے من پسند جانور کیکنووں کے لئے مخصوص تھی۔ وہاں ہمارے گائیڈ نے گردپ کو پارک کے ریخیز کے حوالے کر دیا، جنوں نے ہمیں کیکنو اور دوسرے جانوروں کے بارے میں تفصیل بتائی۔ ان کے مطابق کیکنو کی پچاس مختلف نسلیں ہیں۔ ان میں سات فٹ اونچا کیکنو بھی ہوتا ہے اور تقریباً چوہے جتنا کیکنو بھی ہوتا ہے۔ بڑا کیکنو چالیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑ سکتا ہے اور پچھیں فٹ لمی

# جاپان



درویش اول نے جو نی جاپان ایئر لائنز کے جہاز میں قدم رکھا اسکی لالپی نگاہیں  
 چمک اٹھیں۔ کیونکہ جدھر بھی نگاہ اٹھتی تھی لڑکیاں ہی لڑکیاں دکھائی دیتی تھیں۔ نیلی  
 اور سرخ وردی والی فضائی میزبانوں کا تو ایک شکر کا شکر تھا جو سامان سے لدے  
 پہنندے بد خواں مسافروں کو مسکراہٹیں بھی بانٹ رہی تھیں، ان کی مخصوص نشتوں  
 تک پہنچنے میں راہنمائی بھی کر رہی تھیں اور تکنے بھی بانٹ رہی تھیں۔ عیار درویش  
 اول نے اک تتلی نما ایئر ہو ٹیس کو اپنا بورڈنگ کارڈ دکھایا اور وہ ہم ٹینوں کی راہنمائی  
 کرتی ہوئی ہمیں ہماری سیٹوں تک لے گئی۔ درویش دوم نے جھٹ سے اپنی جدی  
 پہشتی کھڑکی والی سیٹ پر قبضہ جمالیا۔ درویش اول نے سامان سمیت مجھے درمیان والی  
 سیٹ پر دھکیلتے ہوئے خود آئیں سیٹ سنبھال لی اور بیٹھتے ہی ایئر ہو ٹیس سے تکنے  
 لانے کا مطالبہ کیا جو وہ تتلی پلک جھکتے میں لے آئی۔ کھڑکی کے قریب بیٹھے درویش  
 دوم نے اس طرح جھٹ کر تکیہ گھینیا کہ اگر میں راستے میں نہ ہوتا تو یقیناً "وہ ایئر  
 ہو ٹیس اسکے پلو میں آگرتی۔ شکر ہے درویش دوم کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی اور وہ  
 کھیانہ سا ہو کر کھڑکی کے باہر سڑنی کے ہوائی اڑے کے نظارے لینے لگا۔ نظاروں  
 کے معاملے میں درمیان والی سیٹ جس پر مجھے ہمیشہ بیٹھتا پڑتا تھا، بہت گھٹیا ہوتی ہے،  
 کیونکہ یہاں سے نہ باہر کے نظارے ملتے ہیں اور نہ اندر کے۔ سفر لمبا ہو تو دل

ہزاروں بھیڑوں میں سے اپنی بھیڑس تلاش کر لیتے ہیں بھلا مس کاتو کو تلاش کرنا میرے لئے کیا مسئلہ تھا۔ چنانچہ میں سیٹ سیٹ گھونٹنے لگا۔ مشروبات سے بھری ڑالیاں کھچنی ہوئی ائمہر ہو شیں میرے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ تھیں۔ پہلی رکاوٹ پر میں نے ”ایکسیوز می“ کما۔ ڈالی سے دامن بچایا، لڑکھڑایا، ائمہر ہو شیں سے گلرایا تو برا منہ آیا۔ اور پھر رکاوٹیں پار کرنے کا ایسا چکالا کہ میں مس کاتو کو بھول بھال کر اسی کام پر لگ گیا۔ آخر کار جہاز کے ایک حصے میں ناکامورا اسان کی کپینی ”دکی ورلڈ“ کے بیچ دکھائی دیئے اور میں مس کاتو تک جا پہنچا۔ وہ زنانہ کچھا ایک قطار میں بیٹھا تھا۔ ان کی بہت سی چھوٹی چھوٹی ترجیحی آنکھوں نے مجھے دیکھا۔ ان سب آنکھوں کو جمع کر کے یقینے ایک غزالی آنکھ تو بنتی ہو گی۔ پہلے تو ان شریملی سی بیبیوں نے آپس میں کچھ کھسر پھر کی، پھر اپنی نازک سی پیلی ہتھیلیوں میں چہرے چھا کر بہت شروع کیا۔ جاپانی لڑکیاں اکثر ہنستے وقت اپنے چہرے ہتھیلیوں کے پیچھے چھا لتی ہیں۔ دیے بھی جہڑے کھول کر بہت نا تو گنواروں کا کام ہے۔ جاپانی لڑکیوں میں نسوانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ ان کی ادا اور آواز سے ہی ہم جیسے نوارہ لڑکے اور لڑکی میں امتیاز کر سکتے ہیں۔ کیونکہ ان کے جسم کی پیلی ملائم جلد تو اکثر یکساں ہوتی ہے۔ پھر ہم تو عادی ہی ہیں درویش دوم جیسے بھالو نما جسموں کے، جو بالوں کے جنگل میں گھرے ہوتے ہیں۔ ادھر جاپانی مردوں کے جسموں پر کم بخت بال بھی تو نہیں ہوتے۔ ہاں تو بات مس کاتو اور اس کی سیلیوں کی ہو رہی تھی جو ابھی تک اپنی پیلی ہتھیلیوں میں چہرے چھا کے ہنس رہی تھیں۔ دیے جاپانی والدین کو اپنی بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کرنے کی چند اس فکر نہ ہوتی ہو گی، کیونکہ وہ قدرتی پیلے ہوتے ہیں۔ ان کی بھی کا دورہ ختم ہوا تو میری گفتگو شروع ہوئی اور ہم ٹھہرے گفتار کے غازی۔ چنانچہ گفتار کی ایسی یلغار کی کہ مس کاتو کے پہلو میں سیٹ بھی پائی اور کپینی سنانے کے لئے ایک زنانہ مجمع بھی فراہم ہو گیا۔ کرشن جی کو گوپیوں اور رادھا کے سوا کیا چاہئے، حسفنہ میں پسند ہوں تو گھنٹوں کا سفر منوں میں گزر جاتا ہے۔ پھر مس کاتو کے

پشوری کرنے کے لئے آئیں یعنی را گہرے والی سیٹ بہت موزوں ہوتی ہے۔ باخصوص اگر را گہرے گزرنے والیاں جاندار بھی ہوں اور جوان بھی تو ہر ہر قدم پر زاویے بھی بدلتے ہیں اور نظارے بھی۔ مگر جاپان ائمہر لائز کے جہاز میں اس طرح کے خون گرمادینے والے نظاروں کی امید بہت ہی کم تھی۔ کیونکہ جسمانی لحاظ سے تو جاپانی لڑکیاں صرف اندازے سے ہی لڑکیاں تصور کی جاسکتی ہیں۔ ان کے استری شدہ جسموں میں جوانی کی نموکے آثار تو ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بھر پور جسموں کی آرزوں میں جاپانی مرد ملک ملک گھومنتے ہیں۔ اور جاپانی جتنے یورپیں اور امریکن میکنالوجی کے ماح ہیں اس سے کہیں زیادہ وہاں کے بھر پور جسموں کے ماح ہیں۔ ویسے جاپانیوں کی نئی نسل جدید سرجری کا بھر پور فائدہ اٹھا رہی ہے۔ اور اب وہاں کئی چہرے و کھائی دیتے ہیں جن پر ناک بھی چپنی نہیں ہوتی اور آنکھیں بھی ترجیح نہیں ہوتیں۔ اسی طرح پلاسٹک سرجری کے کرشنے سے جسموں میں قوسیں بھی نمایاں ہیں۔ لیکن اس جہاز میں ہمیں کوئی ایسی بی بی و کھائی نہ دی جو سرجری کی سولت سے مستفید ہوئی ہو۔

جونی جہاز اپنی مخصوص بلندی پر پہنچا تو میخاروں کے حفاظتی بند بھی کھل گئے اور میخانوں کے در بھی۔ میں نے بھی اپنی حفاظتی بیٹ کھولی اور دونوں درویشوں سے چھکارا پایا اور مس کاتو کی تلاش میں نکل پڑا۔ سذنی کے نیشنل پارک میں ناکامورا سان کے جس جاپانی گروپ سے میری ملاقات ہوئی تھی اس میں مس کاتو بھی تھی اور وہ اس گروپ کی واحد لڑکی تھی جس کو کچھ انگریزی آتی تھی۔ چنانچہ ٹوکیو کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے بھانے میں اسکی جگتو میں نکلا۔ مگر جب جو جیٹ میں کسی کو تلاش کرنا اتنا آسان نہ نہیں ہوتا۔ پھر ہمیں تو سب جاپانی ایک سے لکتے ہیں۔ ویسے میرا خیال ہے کہ جاپانیوں کو بھی سب جاپانی ایک سے لکتے ہوئے۔ شاید اسی لئے اکثر جاپانی سیاحوں نے ان مخصوص کپینیوں کے بیچ لگا رکھے تھے جن کپینیوں کے ذریعے بک ہو کر وہ سیر کو نکلے تھے۔ میں ٹھہرا صحراء کا بندہ۔ ہمارے چولستان کے گذریے تو سینکڑوں

کے دونوں درویشوں کو مرعوب کروں گا۔ البتہ ایک ایسا نسخہ میں نے مس کاتو سے حاصل کر لیا تھا جو اس معلوماتی فلم میں نہیں تھا، اور وہ نسخہ تھا ہوٹل میں قیام اور ہوٹل تک مفت رسائی کا۔ مس کاتو نے دو ہوٹلوں کی سفارش کی تھی۔ ان میں ایک ہوٹل ٹاکا ناوا تھا اور دوسرا ٹاکا ناوا پرنس۔ پہلا روتی اور ستا تھا اور دوسرا جدید اور منگا۔ دونوں ہوٹل بکی ورلڈ کے دفتر کے قریب تھے جہاں اس کمپنی کی بس نے اپنے گرد پ کو آتارتا تھا۔ چنانچہ ان لڑکیوں نے مجھ سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ ٹاکا مورا سان سے سفارش کریں گی کہ وہ تینوں درویشوں کو بھی بس میں بیٹھنے کی اجازت دیدیں۔ یہ اس سفر میں میری پہلی کامیابی تھی۔ رہا ہوٹل کا انتخاب تو وہ اتنا دشوار نہ تھا۔ کیونکہ سے ہوٹلوں میں ٹھہرنا ہماری مجبوری تھی اور اس مجبوری کو ہم نے روایت پسندی کا رنگ دیکر اپنی غربت کی لاج رکھ لی۔ ویسے ہم خود بھی تو پرنس تھے، اس نے ٹاکا ناوا پرنس میں ٹھہرنے کی بھلا ہمیں کیا ضرورت تھی۔

امیگریشن کی درجنوں لمبی لمبی قطاریں تھیں۔ جاپانیوں اور غیر ملکیوں کے لئے علیحدہ علیحدہ کاؤنٹر تھے۔ یہ امتیاز دنیا کی ہر ایپرورٹ پر ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ کراچی ایپرورٹ پر بھی غیر ملکیوں اور ملکیوں کے لئے علیحدہ علیحدہ کاؤنٹروں کا انتظام کیا گیا ہے۔ بیچارے پاکستانیوں کے لئے اپنے شرکراچی میں بھی ایک ہی قطار اور وہ بھی لمبی ہے۔ قطار میں کھڑے ہو کر ایمیگریشن سے گزرنا پڑتا ہے۔ گھو ایمیگریشن کی موٹی توندو والے افراد کی نفری تو وافر ہوتی ہے گروہ کاؤنٹر پر کام کرنے کے بجائے پانچ باتے چباتے لائن میں کھڑے مسافروں کے ارد گرد شکروں کی طرح منڈلاتے رہتے ہیں تاکہ کوئی نہ ماں سافران کے ہتھے چڑھ جائے اور وہ اس سے مالی یا جسمانی نیکیں وصول کر سکیں۔ سری نکا، تھائی لینڈ، فلپائنز اور بنگلہ دیش کی خادماں میں اور زمیں میں ایسٹ سے واپسی پر یا روانگی میں جاتے ہوئے ٹرائیسٹ میں ان باوردی شکروں کے ہتھے چڑھ جائیں تو ان کی خیر نہیں ہوتی۔ وہ بیچاری کچھ نہ کچھ دے کر ہی جان چھڑاتی ہیں۔ گرفتار کے ہوائی اڈے پر اس طرح کا کوئی خطرو نہیں ہوتا۔ اگر کاغذات صحیح ہوں تو ایمیگریشن سے

پاس تو جیلان کے متعلق معلومات کا ایک خزانہ تھا جو وہ مفت لٹانے کو تیار تھی اور بقیہ میں لوٹنے کو آمادہ تھا۔ اور وہ گرانقدر معلومات میں کیوں نہ حاصل کرتا کہ کسی اجنبی شر اور وہ بھی نوکیوں جیسے شر میں بغیر تیاری کے داخل ہونا خود کشی کرنے سے بھی بدتر ہے۔ کیونکہ ایسے بھیڑ بھاڑ والے صنعتی شرکوں میں آپ کی داد فریاد سننے والا کوئی نہیں ہوتا، اور اگر کوئی سننے والا مل بھی جائے تو وہ آپ کی بات سمجھ نہیں پاتا۔ چنانچہ نہایت ایپرورٹ سے نوکیوں میں ہوٹل تک آسانی سے رسائی پانے کے لئے میں نے سُننی سے نوکیوں تک کا ہوائی سفر ان جاپانی لڑکیوں کے نام کر دیا۔

نہایت ایپرورٹ نوکیوں شرکے مشرق میں ۲۶ گلو میٹر کے فاصلے پر تعمیر کیا گیا ہے۔ یا یوں کہیے کہ سینکڑوں کسانوں کے لامبائتے کھیتوں کو دفن کر کے ان پر سینٹ اور کریٹ کی طویل قبر بنائی گئی ہے، جس پر جبو جیٹ پچھاڑتے ہوئے اترتے ہیں اور جاپانی کسانوں کی احتجاج بھری آوازوں کو اپنے کرخت شور میں دبا دیتے ہیں۔ نہایت دنیا کا واحد ہوائی اڈہ ہے جہاں تک رسائی کے لئے میلوں دور ہی سے حفاظتی رکاوٹوں سے گزرنما پڑتا ہے اور سامان کی باقاعدہ جانچ پڑتاں کروانی پڑتی ہے۔ اس بے جا حفاظتی اقدام کا اصل سبب وہ نا انسانی ہے جو حکومت نے ہوائی اڈہ بناتے وقت کسانوں کے ساتھ کی اور اب انہیں متواتر یہ خطرہ لاحق رہتا ہے کہ کہیں وہ احتجاج اڈے کو کھڈے میں نہ بدل دے۔ مگر اس وقت ہمارے مسائل حفاظتی رکاوٹیں نہ تھیں بلکہ نوکیوں میں آمد کی اجنبیں تھیں جو مس کاتو کے علاوہ جیلان ایسٹ لائز نے معلوماتی فلم دکھا کر ختم کر دیں۔ اس فلم میں ایمیگریشن اور کشم کے قوانین، کرنی بدلنے کے کاؤنٹر، شرک تک رسائی کے لئے بسوں، ٹنبوں اور نیکیوں کے کراچے اور انہیں حاصل کرنے کے شاپ کے علاوہ ہوٹلوں وغیرہ کے بارے میں پوری پوری تفصیلات تھیں۔ یہ معلومات دوسرے مسافروں کے لئے تو بڑی کار آمد ثابت ہوئیں، مگر یہ فلم ریکھنے کے بعد میں بالکل بیکار ہو گیا۔ کیونکہ میں اس امید پر جاپانی لڑکیوں سے معلومات حاصل کرتا ہوا تھا

اور باغات تھے جو پلاٹ کے بنے ہوئے ہی دکھائی دیتے ہیں۔ اسکی اسقدر صفائی اور نفاست سے کثائی ہوتی ہے کہ ایک شاخ بھی فالتو دکھائی نہیں دیتی۔ مجھے یقین ہے کہ پھلوں کے درخت اور بیزوں کے پودے اور نیلیں باقاعدہ کپیوڑ کے پروگرام کے مطابق پھلتے پھولتے ہوئے اور کوئی عجب نہیں کہ اپنے مخصوص پروگرام کے مطابق پودا خود ہی مالک کے پاس آگراپنا پھل یا سبزی اسے دے جاتا ہو گا۔

شہرہا پر ہر جا سائیں بورڈ اور اشتخار صرف جاپانی زبان ہی میں لکھے ہوئے تھے۔ جاپان میں یہ بہت بڑا مسئلہ ہے۔ کیونکہ سڑکوں پر، چوکوں پر اور بلڈنگوں پر صرف نمبر ہی انگریزی میں لکھے ہوتے ہیں باقی ہر عبارت جاپانی میں لکھی ہوتی ہے۔ اسی لئے وہاں انگریزی والے نقشے یا شیلیں بالکل بیکار ہو جاتے ہیں کیونکہ جو چیز آپ نقشے میں پڑھ رہے ہیں وہ سڑک پر نہیں پڑھ سکتے۔ لہذا کوئی جگہ تلاش کریں تو کیسے؟ البتہ ایک عبارت بڑے واضح اور جلی الفاظ میں انگریزی میں لکھی دکھائی دی اور وہ شاہراہوں پر اس جگہ دکھائی دی، جہاں پر ٹول نیکس ادا کرنا پڑتا ہے۔ وہ شاید اس لئے بھی کہ اکثر شاہراہیں پرائیویٹ کمپنیوں کی ملکیت ہیں اور وہ ٹول نیکس کی آمنی سے ہی سب خرچ پورے کرتی ہیں۔ اس لئے وہ غیر ملکی ڈرائیوروں کی سولت کے لئے پوری عبارت انگریزی میں لکھتے ہیں تاکہ وہ ٹول نیکس ادا کرتے وقت کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔ مگر ہم تنہوں ٹول نیکس کی فکر سے آزاد مزے میں سفر کر رہے تھے۔ درویش اول ائمپورٹ کی رسوائی تقریباً بھول چکا تھا اور مس کاؤ سے آنے بھانے گفتگو کو پھیلاتا جا رہا تھا جو خطرے سے غالی نہ تھا، کیونکہ درویش اول کے لئے عشق میں پھنسنا اور کیلے کے چپکلے سے پھسلنا تقریباً یکساں تھا۔ اور مس کاؤ تھی کہ وہ آنکھوں سے مجھے تلی دے رہی تھی اور باتوں سے درویش اول کو۔ ہوئی پہنچنے تک ایک جاپانی اور باتوں کا سلسلہ جاری رہا اور آخر جاتے جاتے مس کاؤ درویش اول کے ہاتھ میں ایک چٹ تھا گئی اور میں غالی ہاتھ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھتا رہ گیا۔ اگرچہ واقف وہ میری تھی مگر خفیہ پیغام درویش اول کی مٹھی میں تھا۔

گزرنا کوئی مسئلہ نہیں۔ مگر اس کے باوجود درویش اول کی جاپانی ایمگریشن والے سے مدد بھیڑ ہو گئی۔ ان امتیازی کاؤنٹراؤں اور قطاروں کے باوجود درویش اول اک جاپانی بیانی سے کھرپھر کرتا جاپانیوں کی قطار میں جا کھڑا ہوا۔ جیسے کے لحاظ سے تو ممکن ہے وہ کسی جاپانی پسلوان کا پٹھا دکھائی دیتا ہو، مگر جاپانی سرخ پاسپورٹوں میں پاکستانی سبز پاسپورٹ بھلا کیسے چھپتا؟ چنانچہ درویش اول کی کوشش اور اسکی جاپانی ساتھی کی سفارش کے باوجود ایمگریشن افسرنے اسکے پاسپورٹ پر ٹمپہ لگانے سے صاف انکار کر دیا۔ جاپانی تہذیب یافتہ قوم ہے وہ انکار بھی کرتے ہیں تو بڑی عاجزی کے ساتھ اور ہم ٹھہرے عادی دھینگا مشتی کے۔ چنانچہ اپنی نئی نویلی گرل فرینڈ پر اپنی مردگانی کا رعب ڈالنے اور ایمگریشن والے کی مہذب گفتگو کو اسکی کمزوری سمجھتے ہوئے درویش اول نے اپنا پاسپورٹ دوبارہ اسکے سامنے چھکتے ہوئے بہ زبان انگریزی اور با آواز بلند ٹمپہ لگانے پر اصرار کیا۔ اردو گرد کھڑے جاپانی اپنی چھوٹی چھوٹی ترجیحی ترجیحی آنکھوں سے حیران پریشان یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ جماں میں ملاقات پانے والی وہ جاپانی لڑکی بھرے ہوئے درویش اول سے اسقدر پریشان ہوئی کہ وہ فوراً وہاں سے غائب ہو گئی۔ ایمگریشن والے نے خدا خطرے کا کیسا بیٹن دیایا کہ پلک جھکتے ہی کمانڈوز کی ایک پلٹن نمودار ہو گئی۔ ان میں سے کچھ نے شین گنیں تھام رکھی تھیں اور کچھ کے ساتھ خونخوار کتے تھے۔ خطرہ بھانپتے ہی درویش اول ”سوری“ کہتے کہتے بڑی تیزی سے غائب ہوا اور غیر ملکیوں کی سب سے دور اور سب سے لمبی قطار کے آخر میں جا کر پناہ لی۔ اور ہر درویش دو مسٹریز کے احاطے میں انک کر رہ گیا تھا۔ کیونکہ کشم والے اسکا بکس کھلوانا چاہتے تھے۔ اس بکس کی چابی درویش اول کے بریف کیس میں تھی اور وہ بریف کیس سمیت قطار کے آخر میں تھا۔

جاپان میں بھی ہماری طرح ٹرینک بائیس ہاتھ کو چلتی ہے۔ اسی لئے تو جاپان میں چلائی جانے والی کاریں ری کنٹریشن کر کے پاکستان بھیج دی جاتی ہیں۔ کلی دریڈ کی بس شاہراہ پر ٹوکیو کی جانب روائی دوں تھی۔ شاہراہ کے دونوں جانب جاپانیوں کے کھیت

پسند کا تردہ ہرگز نہ کرتیں، کیونکہ اس ہوائی دور میں بھی اس لباس کو پہننے اور بننے سنورنے میں گھنٹوں لگتے ہیں البتہ اتر آسمانی سے جاتا ہے۔ پھر مصیبت یہ ہے کہ کنواری لڑکوں کے لئے اور کیونو ہوتا ہے اور شادی شدہ عورتوں کے لئے اور۔ شادی بیاہ کے لئے مختلف کیونو ہوتا ہے اور پارٹیوں کے لئے مختلف۔ غرمنکہ یہ لباس ایک اچھی خاصی سامنس بن گیا ہے۔ پھر اسکو پہن کر اٹھنے پیشے اور چلنے پھرنے کے مختلف آداب بھی ہیں اور انداز بھی۔ بروکیڈ، سلک اور سینٹ کے خوش رنگ ڈیرائینوں والا یہ لباس ظاہراً "تو ایک گاؤں نما ہوتا ہے جسے اوڑھ کر کر کے اردو گرد ای کپڑے کی ایک چوڑی پٹی باندھ لی جاتی ہے، مگر یہ سب اتنا آسان نہیں ہوتا۔ کیونکہ پاؤں کے سلپر سے سر کی سجاوٹ تک اور ہاتھ کے پکھے سے اوڑھنے کی چھتری تک ہر چیز میں ایک رشتہ ہوتا ہے اور جس خوش اسلوبی سے یہ رشتہ جوڑا جاتا ہے وہی کیونو کا روایتی حسن ہے۔ البتہ جو کیونو ہوئیں والے اپنے گاہکوں کے لئے کروں میں رکھتے ہیں وہ صوتی کپڑے کے بالکل سادہ سے گاؤں ہوتے ہیں، جنہیں اوڑھ کر کپڑے کی بیٹھ سے باندھ لیا جاتا ہے۔ مگر وہ پہن کر آپ کرے اور عسل خانے تک ہی محدود ہو جاتے ہیں۔ شانگ یا سیر وغیرہ کو نہیں نکل سکتے۔ لڑکوں کے چال چلن پر تو ہم دیے ہی گھری نظر رکھتے ہیں۔ مگر کیونو پہنے والی لڑکوں پر ہم نے بطور خاص نظر رکھی اور اس نظر میں اکشاف ہوا کہ چلتے وقت وہ لڑکیاں زمین پر پورا پاؤں نہیں جاتیں بلکہ بچپوں کے مل چلتی ہیں اور اپنے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر یوں چلتی ہیں گویا تیرتی چلی جا رہی ہوں۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ ۱۹۲۳ء میں جب نوکر میں زوالہ آیا اور جسکے نتیجے میں آگ لگی اور ایک لاکھ کے لگ بھگ لوگ لفڑے اجل ہوئے تو غالباً" اسکا اصل سبب کیونو ہی تھے۔ کیونکہ کیونو میں ملبوس باوقار جاپانی لڑکیاں زوالے اور آگ کے باوجود جان بچانے کی خاطر بھائی ہرگز نہ ہو گئی۔ صرف روایتی انداز میں دھیرے دھیرے چل پھر رہی ہو گئی کہ آگ نے آن دیوچا ہو گا اور وہ اپنے رنگ برنگ کیونو میں کمی سیاہ را کھہ ہو گئی ہو گئی۔ دیے کیونو پہن کر بھائی لڑکیاں لگیں بھی تو بت عجیب سی۔

ہوئی تاکتاوا روایتی کم اور کفارتی زیادہ لگا۔ مگر کفایت کرائے میں ہرگز نہ تھی سرف کروں کے سائز میں کی گئی تھی۔ مثلاً جس کرے میں درویش دوم اور مجھے تمہرنا تھا اس کمرے میں کوئی نارمل آدمی انگوٹی تو کیا پورا منہ کھول کر جمالی بھی نہیں لے سکتا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اس شاعر نے اسی کمرے میں بیٹھ کر اپنے محبوب کے بارے میں لکھا ہو گا کہ سہ انگوٹی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ..... بھلا ہاتھ اٹھاتے بھی کیسے؟ کمرے کی چھت تو تالو سے گئی ہوئی تھی۔ ماچس کی ڈیبا نما اس کمرے میں البتہ آرام و آسائش کا بہب سامان موجود تھا۔ بستر تو ہر کمرے میں ہوتے ہی ہیں۔ مگر اس کمرے میں کپڑے لٹکانے کے لئے دو الماریاں، اٹی۔ وہ جو چھت سے نیچے جھانک رہا تھا، فرج جس میں صرف بونے سائز کی بوتلیں ہی فٹ ہو سکتی تھیں، استری اور کپڑے پھیلانے کے لئے بورڈ، شیوکے یہ شیشہ، شاور اور عسل خانہ بقلم خود، تو لئے لٹکانے کے لئے شینڈ اور گاہوں کے آرام کے لئے جاپان کے مخصوص، لباس کیونوں کے جوڑے اور سلپر رکھے ہوئے تھے۔ اس کمرے کو دیکھتے ہی مجھے تو جاپانی قوم کی کامیابی کا اصل راز سمجھ میں آگیا۔ کیونکہ جو قوم اتنی مختصری جگہ کو اتنی خوش اسلوبی سے استعمال کر سکتی ہے وہ یقیناً دنیا میں کچھ بھی کر سکتی ہے۔ مگر ہم درویشوں کے لئے صرف ایک ہی مسئلہ تھا اور وہ تھا اپنے بھاری بھر کم اور بھدے بیگوں کو ان کروں میں سونا۔ وہ مسئلہ ہم نے بڑی خوش اسلوبی سے حل کیا۔ مگر جتنا میں گے صرف اس لئے نہیں کہ وہ راز حکیموں کے نخوں کی طرح ہمارے سینوں میں دفن ہے اور ہمارے ساتھ ہی دفن ہو جائے گا۔

درویش اول کیونو پہن کر کیا لگ رہا تھا اسکی تو ہمیں خبر نہیں البتہ درویش دوم کیونو پہن کر بت ہی چند لگ رہا تھا۔ کیونو تو میں نے بھی پہنا اور مجھے یقین ہے کہ وہ جاپانی لباس مجھے پرچ بھی رہا ہو گا۔ مگر احتیاطاً" میں نے اپنے آپکو آئینے میں نہ دیکھا۔ جاپان کا یہ روایتی لباس کیونو دیکھنے میں تو بت جاذب نظر ہوتا ہے مگر پہنے میں نہایت کمیں۔ اگر جاپانی خواتین میں تحمل نہ ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ وہ اس لباس کو

میں کیمونو والی لڑکوں کے بارے میں سوچ کے خوش رنگ تانے بانے بن رہا تھا کہ ہمارے کمرے کے کیپسول نما غسل خانے سے شور اٹھا۔ یقیناً ورویش دوم کی مشکل میں ہو گا اور وہ مشکل میں تھا۔ مشکل بھی ایسی کہ کچھ نہ پوچھتے۔ وہ تیچارہ جھاگ کا گولہ سا بنا غسل خانے میں گرے صابن کو اٹھانے کی تگ دو کر رہا تھا۔ آنکھیں کھولاتا تو آنکھوں میں صابن کا جھاگ جانا۔ آنکھیں بند کئے صابن تلاش کرتا تو بھی پلاسٹک کی دیوار سے نکراتا جس کے ٹوٹنے کا سو فیصد خطرہ تھا، اور کبھی آئینے سے، اور آئینہ تو پلاسٹک سے زیادہ نازک بھی ہوتا ہے اور منگا بھی۔ دیے اس غسل خانے میں جھکنے کی ٹھنڈائش تو تھی ہی نہیں ہر کام کھڑے کھڑے ہی کرنے کے لئے یہ بنا یا گیا تھا۔ چنانچہ غسل خانے کے حدود اربعہ میں محدود رہتے ہوئے میں نے جھاگ میں چھپے بہمنہ درویش دوم کو غسل خانے سے باہر گھسیتا اور اس بند آنکھوں والے نقیر کے کھلے ہاتھوں میں صابن کی نکیر کی بھیک ڈال دی۔

جاپان مشرق کا واحد ملک ہے جس پر مشرق والے بھی فخر کرتے ہیں اور مغرب والے بھی۔ اس زبردست مقبولیت کا اصل سبب انکی بے بہا دولت ہے۔ وہ دولت جو اس قوم کو نہ تو درٹے میں ملی ہے نہ انہوں نے کہیں سے لوٹی ہے اور نہ ہی زمین سے ابٹتے ہوئے سیاہ سونے یعنی تمل سے حاصل کی ہے۔ بلکہ صرف اپنی محنت، ایمانداری اور ہنرمندی سے حاصل کی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے نتکت خورده اور ایٹھ بھوں سے تباہ شدہ اس ملک کی اسوقت معاشری قوت اس قدر مضبوط ہے کہ دنیا کے بڑے سے بڑے ملک دل میں جاپانیوں سے خوفزدہ ہیں اور شاید اسی لئے جاپانیوں سے دوستی کے بندھن باندھنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ موجودہ دور میں جاپان اور پاکستان نے ایک سے حالات میں ساتھ ساتھ قدم رکھے۔ وہ آج ایک صنعتی مجذہ ہیں اور ہم ابھی تک ترقی پذیر۔ جبکہ دونوں کے پاس قوت بازو کی وافر مقدار تھی۔ انہی قوت کے علاوہ دونوں ممالک کے پاس اور کچھ نہ تھا۔ کیونکہ جاپان کو دوسری جنگ عظیم نے جاہ کر دیا تھا اور پاکستان برطانیہ کی عیاری اور ہندو کے تعصب کی سیاہ گھناؤں

سے نکل کر دنیا کے نقشے پر نمودار ہوا تھا۔ ادھر جاپان کے دو شرلوں یعنی ہیرو شیما اور ٹاگا ساکی پر قیامت کی رسروں ایٹھ بھوں کی صورت میں کی جا پہنچی تھی اور توکیو دوسری جنگ عظیم میں آتشیں بھوں سے برسنے والی آگ کے سبب ابھی تک راکھ کا ڈھیر تھا۔ اسی طرح پاکستان بھی کشت و خون کی ہولی کے بعد اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ چنانچہ دونوں ممالک کے راہنماؤں اور سیاستدانوں کے لئے اپنے اپنے ملک کی تغیریں اور عوام کی آباد کاری ایک بہت بڑا چیلنج تھا۔ پوری دنیا کی نگاہیں ان دونوں ملکوں پر جی ہوئی تھیں۔ ہمارے راہنماؤں اور سیاستدانوں کی کارکردگی کے نتائج دیے تو اتنے واضح ہیں کہ کچھ کہنے سننے کی ٹھنڈائش نہیں۔ مگر دونوں ممالک میں بنیادی چیزیں یکساں ہونے کے باوجود استقرار مختلف ہیں کہ کچھ کے بغیر گزارہ نہیں۔ ہمارے ملک میں اس مقدس امتحان میں کون فیل ہوا؟ راہنمایا عوام....؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو ہمارے راہنماؤں اور عوام دونوں کے لئے لمحہ فکریہ ہوتا چاہیے۔ مگر بد قسمتی سے راہنماؤں اور سیاستدانوں کو تو اس ملک کی دولت بثورنے سے فرصت ہی نہیں اور عوام کو زندہ رہنے کے لئے روٹی کمائے سے فرصت نہیں.... پھر ہماری بات نہیں گا تو کون؟

جاپان بیسویں صدی کا صنعتی مجذہ ہے جو کسی پیغمبر کے سبب نہیں ہوا بلکہ عام انسانوں نے کر دکھایا ہے۔ ایسے مجذے صرف اسی صورت میں رونما ہو سکتے ہیں جب انفرادی خود غرضی ختم کر کے اجتماعی ترقی کو ترجیح دی جائے۔ مگر جن قوموں کے راہنماؤں نے صرف ذاتی مفاد کو بروئے کار لاتے ہوئے قوم کے خزانے لوٹے وہ قوم تو غریب ہی رہی مگر خود غرضی سے لوٹی ہوئی وہ دولت ان کے کام بھی نہ آسکی۔ بیسویں صدی کا فرعون شاہ ایران اور فلپائنیز کا آمر جزل مارکوس اس دلیل کا زندہ ثبوت ہیں۔ رہی جاپان اور پاکستان کی صنعتی ترقی کی دوڑ، جس میں جاپان نے تو گولڈ میڈل جیتے ہیں اور پاکستان ابھی شارت لائیں پر کھڑا دعا میں مانگ رہا ہے کہ شاید کوئی مجذہ ہو جائے۔

جاپان کی صنعتی ترقی کا جائزہ لیا جائے تو چند اصول اور روایتیں سامنے آتی ہیں جنکو اپنانے سے وہ ترقی کر گئے اور جن کو گوانے سے ہم دیں کے وہیں ہیں یا ممکن ہے اب ہم وہاں بھی نہ ہوں جہاں چند سال پہلے ہوا کرتے تھے۔  
جاپانی فرد کی حیثیت سے بھی ایماندار ہے اور قوم کی حیثیت سے بھی۔ ہمارے ملک میں لاڈوڈ سینکروں پر چکھاڑتے ہوئے بنیاد پرست اکثر ایمانداری کا تذکرہ تو کرتے ہیں مگر نہ وہ خود اس پر عمل کرتے ہیں اور نہ انکی بے اثر تقریروں کو سننے والے سامنے اس لفظ پر عمل کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ لفظ جو ہمارے ذہب کا ستون تھا اسے ہم تو کھو بیٹھے اور لامذہ ہب جاپان نے (ہمارے خود ساختہ معیار کے مطابق) اس لفظ کو مضبوطی سے تھام لیا۔

جاپانیوں نے ایمانداری کے علاوہ اپنی قدمی روایتوں کو اس خوش اسلوبی کے ساتھ اپنی عملی زندگی میں شامل کر لیا ہے کہ مغرب کی ترقی یافتہ قومیں بھی محیت ہیں۔ 'شوگنزم' جاپان کی ایک قدمی روایت ہے۔ 'شوگن' علاقائی سردار ہوا کرتے تھے جو ہنرمند تکوار باز بہادر اور ذہین ہوتے تھے۔ وہ اپنے زیر اثر علاقوں میں 'سومرائی' جمعت تیار کرتے۔ یہ 'سومرائی' اپنے 'شوگن' کے وفادار اور جان ثنا رپاہی ہوا کرتے تھے۔ جنکو خود داری اور تکوار بازی کی تربیت بچپن ہی سے دی جاتی تھی اس کے علاوہ سومرائی کی ہر قسم کی ضرورتوں کو پورا کرنا بھی شوگن کی ذمہ داری تھی اس تربیت اور دیکھ بھال کے عوض 'شوگن' کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنے 'سومرائی' سے ہر قسم کی قیانی مانگ سکے۔ یہاں تک کہ 'شوگن' کے حکم پر 'سومرائی' خود کشی بھی خوشی سے کر گزرتے تھے۔ درحقیقت ندامت یا مغلست کی بجائے 'ہارا کیری' یا خود کشی کا رواج بھی بہادر 'شوگن' اور اسکے 'سومرائی' کے دور سے ہی جاپان میں شروع ہوا اور اس عمل کو وہاں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ شاید اسی لئے جاپان میں خود کشی کرنے کا ریت دنیا کے تمام ممالک سے کیس زیادہ ہے۔ جاپانیوں نے اپنی قدمی روایت کو موجودہ دور میں آجر اور مزدور کے رشتے میں بدل دیا ہے۔ آجر نے

شوگن کی تمام تر ذمہ داریاں سنجھاں لی ہیں جبکہ مزدور نے سومرائی کا کدرار اس خوبصورتی سے سنجھاں ہے کہ وہاں کوئی فیکٹری نہ ہڑتاں کا شکار ہوتی ہے اور نہ تالا بندی کی۔ ہر فیکٹری کی چھٹ پر چینی کے برتوں اور پلٹیوں کے ڈھیر لگا دیئے جاتے ہیں تاکہ جو مزدور 'فرسٹریشن' کا شکار ہو وہ چھٹ پر رکھے برتن اور پلٹیوں توڑ کر اپنا غصہ ٹھنڈا کر لے۔ گھر پہنچ کر بیوی سے بھگڑا کرنے اور بچوں کو مرغا بنانے کی ضرورت نہ رہے۔ اسی طرح جب مزدور کوئی مطالباہ منوانے کے لئے احتجاج کرتے ہیں تو بھوک ہڑتاں کر کے نہ تو سڑکوں پر نکل کر نائیں اور بیسیں جلاتے ہیں اور نہ ہی کوئی قوی ضمایع کرتے ہیں بلکہ بھوک ہڑتاں کرتے ہوئے اپنی لنج بریک ختم کر دیتے ہیں اور لنج بریک میں بھی کام جاری رکھتے ہیں۔ اس احتجاجی عمل سے شوگن ڈینیت والی میخجشت اور ماکان اپنے سومرائی مزدوروں کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے فوراً اسکے مطالبات مان لیتے ہیں۔ ویسے بھی جاپان کے قوانین کے مطابق مزدوروں کی ہر طرح کی ذمہ داری یعنی رہائش، بچوں کی تعلیم اور علاج اور مزدوروں کے لئے غیر ملکوں میں نقلیلات گزارنا وغیرہ ماکان کے فرائض میں شامل ہیں۔

شوگن اور سومرائی قسم کا سلسہ ہمارے خطے میں صدیوں پہلے مغلوں نے شروع کیا۔ وہ سلطنت کے دور دراز علاقوں میں اپنا اثر و رسوخ اور حکومت قائم رکھنے کے لئے بہادر لوگوں کو جائیں عطا کرتے تھے تاکہ اپنی عنايتیوں کے عوض ضرورت کے وقت ان وفاداروں کے لئکر مغلیہ لشکروں کے شانہ بہ شانہ باغیوں کی سرکوبی کر سکیں۔ وہی نظام رفتہ رفتہ فرنٹری میں قبائلی سرداروں، پنجاب میں جائیکو داروں اور سندھ میں دوڑیوں کی ٹکل اختیار کر گیا۔ جاپان کے 'شوگنزم' کی طرح ہمارے اس نظام میں براہیاں بھی تھیں اور اچھا بھی۔ مگر بدستی سے ہمارے ملک میں فلموں اور ٹیلیویژن پر اس نظام کی براہیوں کو تو اچھا لگا مگر اسکے ابھی اور کار آمد پہلوؤں پر دھیان نہ دیا گیا۔ پھر ہمارے ملک کے ایک جاکیروار عوامی رہنماء نے اپنی ذاتی قوت بڑھانے کی خاطر اس نظام کی بنیادیں تک ہلا کر رکھ دیں۔ اس عمل سے اس رہنماؤ

گئے۔ اور اس طسمی ریستوران میں قدم رکھتے ہی ہم پھرا گئے۔ کیونکہ ہمیں پھر بنا نے کے لئے تو گھومتے دروازے کے سامنے کھڑی خوش آمدید کرنے والی خوش شکل، خوش پوش، خوش رنگ اور خوبصوردار خادمہ ہی کافی تھی۔ اس پر وہ تم طرف خالص جاپانی روایتی انداز میں خوش آمدید کرتے ہوئے نیم رکوع میں چلی گئی۔ اس جادو گرنی کی نقلی کرتے ہوئے ہم جو نبی جوابی نیم رکوع میں بھلے تو ہمارے بھیکے سروں اور بدنوں سے پانی کی برسات سی ہونے لگی۔ اور ہمیں یہ خطرہ لاحق ہو گیا کہ کہیں ہمارے جسموں سے پھرتے پانی کے سیالاب میں وہ گلبدن ڈوب ہی نہ جائے۔ خیر وہ تو گھبرا کے پیچھے ہو گئی البتہ ریستوران میں رکھا غالیچہ اور اس غالیچے پر منی کلیاں پانی میں ڈوب گئیں۔ ہم اس نہامت سے ہی نہ بٹھلے تھے کہ تمنی اور خادماں میں خدا خبر کمال سے نمودار ہوئیں اور انہوں نے خلک تولیوں سے ہمارے بھیکے بدن اور چہرے خلک کرنے شروع کر دیئے۔ اور ہم پیسے میں شرابور ہو گئے۔ اس ریستوران کی سجادوت اور خدمت کو دیکھنے کے بعد بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ یہاں کا میل کتنا وزنی ہو گا، اور وہ وزن ہم پیشنا اٹھانے کے قابل ہرگز نہ تھے۔ میل کا وزن تو خیر بعد کا مسئلہ تھا ابھی تو ہمارے پاؤں استقرار وزنی ہو گئے تھے کہ بھاگنے کے لئے قدم اٹھانے کی ہمت نہ رہی تھی۔ کمپیوٹر دماغ درویش دوم نے بڑی ہی جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”سوری میڈم! وی آر لکنگ فار آمیڈیکل سور۔“ (معاف کرنا میڈم! ہم تو داؤں کی دکان ڈھونڈ رہے ہیں) یہ فقرہ کرتے ہی وہ ہمیں گھینٹا ہوا باہر بارش کی بوچھاڑ میں لے گیا۔ اور جیرت کی بات ہے کہ ہم تینوں ریستوران کے گھومتے دروازے کے ایک ہی حصے میں فٹ ہو کر باہر آگئے، حالانکہ وہ حصہ صرف ایک ہی شخص کے گزرنے کے لئے بنا ہوتا ہے۔

ایک تو اس ریستوران میں گھنے کے خونگوار حادثے نے ہمیں پریشان کر دیا تھا اور دوسرے موسلا دھار بارش سے خاصے بندگ آگئے تھے۔ چنانچہ بھوک کو بجسم کرنے کے لئے ایک ایک برگ کھایا۔ یہ پلاسٹک نما امریکن خوراک دنیا میں ہر جگہ ملتی ہے۔

دقیق فائدہ تو ضرور ہوا مگر ملک کو ایسا نقصان پہنچا جس کی حلانی ممکن نہیں۔ کیونکہ اس روایتی نظام کو اگر جدید زاویوں پر ڈھال کر زرعی صنعت میں بدلانا تو ممکن ہے پاکستان بھی جاپان کے پہلو بہ پہلو ترقی یافتہ ہوتا۔ مگر وہ نظام ختم ہوتے ہی کسانوں نے مزدور بن کر شرکوں کا رخ کا۔ شرکوں کی صنعت پر بندگ نظر، بندگ ذہن اور بندگ دست تاجریوں کا بفضلہ تھا۔ چنانچہ دو مختلف روایتوں کا تصادم ہوا۔ فیکٹریوں کے مزدوروں نے ہر تالیں شروع کر دیں اور تاجریوں نے تالا بندیاں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ملک کی صنعت تباہ ہو کر رہ گئی۔

جب تک درویشوں کے چہرے نکھرے تب تک سورج کے چہرے کو ٹوکیو کی آلوگی نے چھپا لیا تھا۔ چنانچہ سے سے قدموں سے ہم اس انجینیئر میں رات کی واردات کو نکلے۔ ہوٹل سے باہر قدم رکھا تو معلوم ہوا کہ موسلا دھار بارش شروع تھی۔ ان بدلتے موسموں کے سبب ہی جاپانی چھوپیں گھنٹے بر ساتیوں اور چھتریوں سے مسلسل رہتے ہیں۔ فٹ پا تھوں پر ہر سو برسات میں بھیگی چھتریوں کی قوس قزح سی پھیلی ہوئی تھی۔ ہم نے بھی برسات سے نجات پانے کے لئے چھتری کے سامنے کی تلاش شروع کی اور اسی امید پر ہوٹل کے سامنے سے گزرنے والوں کے ہر کاب ہو گئے کہ پیشنا کوئی ہمیں بھی اپنی چھتری کی پناہ میں لے لیگا۔ مگر کسی نے بھول کر بھی بھیگتے درویشوں کی طرف پلٹ کرنے دیکھا۔ اور دیکھتا بھی کیسے؟ اول تو جاپانی یہ قصور ہی نہیں کر سکتے کہ کوئی شخص چھتری کے بغیر باہر گھوم پھر سکتا ہے۔ دوسرے ہمارے بھیگتے سر بھی تو چھتریوں میں چھپے پستہ قدم جاپانیوں کی حد نگاہ سے کہیں اونچے تھے۔ چنانچہ جاپانی چھتریوں کی پناہ میں اور ہم بارش کی بوچھاڑ میں چھتریوں کے اس سیل روائی کے ساتھ ساتھ بستے چلے گئے۔ خدا خبر کیسی کیسی گلیاں، شاہراہیں، چوک اور چورا ہے آئے اور گزر گئے۔ ہم کچھ دیر تو سرینگلک عمارتوں کی پناہ میں ستانے کے لئے ھتم جاتے مگر پھر ہمت کر کے تیز ہوا اور بارش کے بھیگے تھیزے کھانے کے لئے نکل پڑتے۔ یونہی برساتی تھیزے کھاتے اور ستانے تقریباً ”ڈھال ہو کر ایک ریستوران میں گھس

واقف ہوتے تو ہمیں یقیناً تب تک آوارہ گردی کے الزام میں بند کر دیتے جب تک کوئی گھری سفارش یا رشوٹ نہ دی جاتی، یعنی مٹھی گرم نہ کی جاتی۔ مگر انہوں نے ہمیں اپنی گاڑی میں بٹھایا اور دو منٹ کے بعد ہی ایک بلڈنگ کے سامنے لا کھڑا کیا۔ اس بلڈنگ کو دیکھتے ہی درویش اول نے اچھل کر لما۔ ”یہی ہے ہمارا ہوش۔“ دراصل سیاحوں کی بدحواسیوں سے آشائی اور اپنے وسیع تجربے کی بناء پر وہ ہمیں صحیح ہوش تک لے آئے تھے۔ جس ہوش کو ہم بار بار ناکاتاوا کہتے رہے تھے وہ درحقیقت ہوش ناکاتاوا تھا۔ اور اس نام کے ہیر پھیرنے ہمیں رات بھر پھیرے لگانے پر مجبور کر دیا تھا۔ پولیس کو ”مری گاؤ“ یعنی شکریہ کرنے کے لئے ہم باجماعت جلاپاں کے روایتی نیم رکوع میں چلے گئے۔ اور جب رکوع سے اٹھے تو تینوں کے اپنی اپنی کمر پر ہاتھ تھے۔ کیونکہ نماز کی عادت نہ ہو تو یوں اچانک رکوع میں جانے سے اکثر کمر کے کڑا کے نکل جایا کرتے ہیں۔

ہر شرمن سیاحت کے لئے چند سکے بند قسم کی یہ گاہیں ہوتی ہیں جنہیں قبیلہ طور پر ہر سیاح کو دیکھنا پڑتا ہے اور چند روایتیں ہوتی ہیں جن سے گزرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ یہ پابندی ہم پر بھی لا گو تھی جسے لازمی طور پر ہم کو پورا کرنا تھا۔ اپنے لئے نہ سی تو زمانے کے لئے سی۔ لذدا درویش اول کے دربار میں پہنچنے تاکہ بجٹ اور سیاحت کی منصوبہ بندی کی جاسکے۔ درویش اول نہار منہ میلی فون پر مخونتگو بھی تھا اور مخوب عشق بھی۔ مجھے یقین تھا کہ میں کاؤ نے جاتے وقت جو تعمیز سا درویش اول کی مٹھی میں دیا تھا اس میں وہ اپنے گھر کا میلی فون نمبر تھا گئی ہو گی۔ اچھی صورت پر بری نظر کھناتا ہمارا بھی پسندیدہ مشغله ہے اور اس جلاپانی جنپی پر تو میں سُدھنی سے ڈورے ڈالتا آرہا تھا۔ مگر وہ کم بخت پہنسی تو درویش اول کے جال میں۔ میں رقبت کی آگ میں جلنے لگا اور بارہا میرا جی چاپا کہ درویش اول کے سر پر سیٹ کے ہوئے بالوں کے جال کو بکھر دیں تاکہ وہ سما ہو کے رہ جائے۔ مگر ایسا کرنے کی مجھ میں ہمت نہ ہوئی۔ وہ متواتر عشق فرماتا رہا اور میں پیچ و تاب کھاتا رہا۔ آخر درویش دوم نے دہائی چھوٹی اور فون بند کروا یا۔ درویش اول کے وسیع و عریض چہرے پر ڈیڑھ میل لبی مسکراہٹ تھی۔ اس سفر میں یہ پہلا موقع تھا کہ وہ صحیح سوریے اچھے موڈ میں

اس میں کچھ نہایت ہوتی ہے یا نہیں اسکی تو ہمیں خبر نہیں؛ البتہ ناچھوٹے کے علاوہ ستا پیٹ بھرنے کے لئے برگر سے بتر کوئی شے نہیں۔ چنانچہ برگر ختم کرتے ہی ہم نے واپس ہوش جانے کا فیصلہ کیا۔ مگر ہوش پیچھے تو کیسے؟ آتے وقت اتنی گلیاں چوک اور شاہراہیں پھلاٹنے پھرتے رہے تھے کہ واپسی کے روٹ کی طرف دھیان ہی نہ دیا تھا۔ جو تھوڑا بہت راستے کا اندازہ تھا وہ بھی اس وقت ختم ہو گیا جب ریستوران سے ہی بھر کے رسوا ہو کر بھاگے تھے۔ اب جس طرف نگاہ انھا کر دیکھتے تھے ایک سی شاہراہیں، ایک سے چوک اور ایک سی چھتریوں والی ان گنت غلوت۔ پھر تم یہ ہوا کہ ہم میں سے کسی کے پاس ہوش کا پتہ بھی نہ تھا۔ کیونکہ بڑے ہوٹلوں میں تو چالی دیتے وقت ریپشن والے باقاعدہ شناختی کارڈ بنا کر دیتے ہیں جس پر گاہک کا نام، کمرہ نمبر اور ہوش کا پتہ درج ہوتا ہے۔ مگر اس چھوٹے سے ہوش میں اس قسم کے کوئی لوازمات موجود نہ تھے۔ پھر اکثر ہوٹلوں کے کروں میں ماچیں ضرور ہوتی ہیں جن کے پیچھے ہوش کا پتہ درج ہوتا ہے۔ چونکہ ہم میں سے سکریٹ کوئی نہیں پیتا تھا۔ اسلئے کمرے سے ماچس بھی نہ اٹھائی تھی۔ چنانچہ ہوش کا پتہ بتاتے تو کیسے؟ البتہ ہوش کا نام ہمیں یاد تھا اور ہمیں یقین تھا کہ نام بتا کر کسی نہ کسی را گھیر سے پتہ ضرور معلوم کر لیں گے۔ چنانچہ ہر را گھیر سے ہم ہوش ناکاتاوا کا پتہ پوچھنے لگے۔ مگر حیرت کی بات تھی کہ ہر شخص یا تو نفی میں سرہلا دیتا اور یا یہ کہتا کہ نوکیوں میں اس نام کا کوئی ہوش نہیں۔ ہم قسم قرآن کی کھار ہے تھے کہ ہم ہوش ناکاتاوا میں مقیم ہیں، مگر جلاپانی بند تھے کہ اس نام کا کوئی ہوش نہیں۔ چنانچہ آدمی رات تک یونی بارش میں بھگتے گلی گلی طواف کرتے پھرے۔ نہ ہی ہوش تک پہنچے اور نہ ہی کسی جلاپانی کو یقین دلا سکے کہ ناکاتاوا نام کا ہوش نوکیوں میں موجود ہے۔ اتنے میں گشتی پولیس کی گاڑی نظر آئی تو ہم نے بھاگ کر ان سے مدد کی درخواست کی۔ وہ بھی بند تھے کہ اس نام کا وہاں کوئی ہوش نہیں۔ پولیس کے روایتی رویے کے مطابق تو انہیں وہاں سے چلا جانا چاہیے تھا۔ اور اگر وہاں کے پولیس والے ہماری شاپین فورس پولیس کے اصولوں سے

خدا اور اسی اچھے مود میں اس نے گلکھاتے ہوئے فرمایا "بیو قوفو! تمہاری خاطر دیکھو مجھے کیا کیا کرنا پڑتا ہے۔ ابھی سیر کے لئے گاڑی اور گائیڈ دونوں کا بندوبست کر لیا ہے۔ مس کا تو آدھے گھٹنے میں پہنچنے والی ہے اور وہ ہمیں نوکیوں کی سیر کرانے کی ہے۔ اور سیر بھی مفت۔" اس نے کپیوڑ دماغ درویش دوم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وزیر خزانہ درویش دوم کا غصہ کافور کرنے کے لئے تو مفت سیر کا جھانسے کافی تھا۔ مگر میں رقبات کی آگ میں جھلس گیا۔ زن، زر اور زمین کو دنیا میں ہر فساد کی جڑ سمجھا جاتا ہے۔ نوکیوں میں ہمارے پاس نہ زر تھی اور نہ زمین۔ تھی تو صرف ایک عدد زن، مس کا تو۔ سو اس پر بھی درویش اول نے قبضہ جایا اور وہ اسکے پہلو میں جائیٹھی اور میرے پہلو میں درویش دوم.....

نوکیوں میں ہماری سیر کا آغاز اسی مقام سے کیا گیا جس مقام پر شر نوکیوں کی بنیاد ۱۹۶۸ء میں رکھی گئی۔ دریائے سومیدا کا کنارہ، پنجیوں کی بستی، بستی سے قصبه اور قصبه سے شر اور شروں میں آبادی کے لحاظ سے اب دنیا کا سب سے بڑا شر۔ مگر اس دور میں اس قصبه کا نام 'ایڈ' تھا اور یہ قصبه نوکو گاؤں نامی ایک جنگجو جاگیروں کی جاگیر تھا۔ ۱۹۷۸ء میں اس جنگجو شوگن اور اس کے اسی ہزار سو مرائی بہادروں کو شکست ہوئی۔ شہنشاہیت اس علاقے تک پہنچی۔ شہنشاہ 'مجی' نے اپنا دربار اور درباری پرانے دارالحکومت کو یوٹو سے ایدو منتقل کئے تو شر کا نام بھی بدل گیا اور کالا بھی پلٹ گئی اور یہ نوکیوں یعنی مشرقی دارالحکومت کملایا۔ نوکیوں میں شاہی باغات ہیں اور ان باغات میں دوسرے سیاحوں کے ہمراہ ہم بھی کھڑے تھے۔ ہر گروپ کے گائیڈز بھانٹ بھانٹ کے سیاحوں کو عجیب و غریب بولیوں میں شاہی قلعہ کی تفصیل اور تاریخ بتا رہے تھے۔ ہماری گائیڈ مس کا تو نے ندیدے درویش اول کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کہنا شروع کیا۔ "وہ سامنے جو سنگ اسود کی فصیل اور اس کے ساتھ ساتھ آبی خندق ہے تا...." درویش دوم اور میں نے سامنے دیکھا.... وہاں فصیل کے بجائے ٹریفک سکن!

خندق کی بجائے شاہراہ اور آب کی جگہ ٹریفک کا سیلاب تھا۔ ہم نے مژکر پیچھے دیکھا۔ وہاں فصیل بھی تھی اور آبی خندق بھی .... مگر وہ درویش دیوتا کی پچارن ادھر ادھر دھیان دیتے بغیر ہی بولتی چلی گئی .... "پرانے زمانے میں دشمن دیوار کے اندر شاہی محل تک ہرگز نہیں پہنچ سکتے تھے .... مگر ۱۹۷۵ء میں امریکنوں نے ہواں محلے کے ذریعے شاہی محل پر بھی نوکیوں شرکی طرح آتشی بمов سے حملے کئے .... شر اور شاہی محل دونوں کو راکھ کے ڈھیر میں بدل دیا ...." وہ متواتر درویش اول کو ہمکنی اور بکتی رہی۔ "۱۹۶۸ء میں شاہی محل کی تعمیر نو ختم ہوئی اور اب اسکی کانکریٹ میں ایسے کیمیائی مادے استعمال کے گئے ہیں کہ شاہی محل کو آگ نہیں لگ سکتی ..." درویش دوم مس کا تو کی بے رخی میں رقبات کی اور درویش اول محبت کی آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں تھے۔

خندق کے پار، گیٹ کے اندر پھر سیاحوں کے جھوم لگ گئے۔ اور اب گائیڈ شاہی محل میں بینے والے شاہی خاندان کی دھیان بکھیرنے لگے۔ ہماری بے رخ گائیڈ نے تو شاہی خاندان کا شجرہ نسب سورج دیوی، جوں تینوں کے پوستے سے جوڑ دیا۔ اسکی اس بات میں منطق ضرور تھی۔ کیونکہ جاپان کو چڑھتے سورج کی سر زمین بھی کہا جاتا ہے۔ سورج ان کے قوی پرچم پر بھی موجود ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ شاہی خاندان کا دادا پردا دا بھی نہلا۔ جس کے سبب بادشاہ کو بھگوان سمجھ کر اسکی پوچا کی جاتی رہی۔ مگر شاہی خاندان کے ایک سو چوبیسویں شہنشاہ ہیرو یہ تو نے ۱۹۷۶ء میں سورج کے ساتھ ہاتھ کر دیا اور سورج دیوی کا پوتا بننے کے بجائے بندے کا پچھہ بن گیا۔ یعنی خدائی دعوے سے دستبردار ہو گیا اور اس طرح جاپان میں شاہی خاندان کی پوجا ختم ہو گئی گور عزت جوں کی توں برقرار ہے۔

شاہی خاندان کے بارے میں ہلاکا چھکا لیکر پلانے کے بعد مس کا تو نے ہمیں تو شاہی محل میں گھونٹنے کا حکم سنایا اور خود درویش اول کو لیکر چیزی بلاسم کے چھولدار سائے میں بیٹھ گئی۔ بھلا یہ کہاں کا انصاف تھا کہ سیر کرنے کی سزا تو ہم دونوں کو ملے

اور عشق کرنے کی جزا درویش اول کو، اور وہ بھی اس لڑکی کے ساتھ جس پر میں بچپن سے یعنی سذنجی سے نظر بد رکھتا تھا۔ چنانچہ میری رگ رگ میں مکینگی کا زہر پھیل گیا اور اپنی اس نگست کا بدلہ لینے کے لئے درویش اول کے خلاف درویش دوم کے کان بھرنے شروع کئے۔ ادھر کم بخت درویش دوم بڑا ہی مست بعیت بندہ تھا۔ کسی چغلی، شکایت کا اس پر اثر ہی نہ ہوتا تھا۔ البتہ پیدل چلنے سے اس کی جان جاتی تھی۔ اپریل پہلی کے وسیع علاقے میں پیدل گھونٹنے سے جب اسکا چہرہ چند ربانیوں میں نے پھر سے اپنا چغل ساز چھیڑ دیا۔ ”یار ہمیں کیا ضرورت ہے جیلانیوں کا قلعہ دیکھنے کی؟... ہم نے تو کبھی مغلوں کا قلعہ نہیں دیکھا.... پھر اپر سے دھوپ بھی تو اتنی تیز ہے....“ درویش دوم نے فوراً اپنے چہرے پر رومال کا واپس چلا کیا۔ لوبھا گرم تھا میں نے دوسرا وار کیا۔ ”خود تو نواب صاحب سائے میں بیٹھ گئے ہیں اور ہمیں ....“ درویش دوم نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”چلو یار واپس چلتے ہیں ہم سے نہیں ہوتی یہ پیدل سیر۔“ میری مکینگی کا رگ ٹابت ہوئی اور ہم دونوں نے سیر ہٹال کر دی۔ یعنی جو مس کا تو ہتائے گی وہ سینی گے نہیں اور جو دکھائے گی وہ دیکھیں گے نہیں۔

”یہ نوکر ٹاور ہے۔ اسکی بلندی ہزار فٹ ہے اور یہ جیس کے ایفل ٹاور سے ایک سوف زیادہ بلند ہے۔“ مس کا تو نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ریڈیو جیلان کے آہنی مینار کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ہم دونوں نے سنی کر دی اور سرخ رنگ ٹاور کو نظر انداز کر دیا۔ ویسے درویش اول نے کونسا اس مینار کو دیکھا۔ وہ بھی تو مکینگی باندھے مس کا تو کویوں نکلے جا رہا تھا گویا اسکی آنکھیں پھرا گئی ہوں۔

”اڑ رڑ دھم .... اف کتنا سخت بھونچال ہے .... دیواریں ٹھنے لگیں .... اے لو وہ سب مکان گر پڑے ....“ صدیوں پسلے جب ہم پرائمری سکول کمیتری انوالہ میں پہلی جماعت کے طالب علم تھے اور اپنے ہم جماعتوں، نجاشی، بینا، جھیٹو، پھیلی وٹو اور گوئے کبڑے کے ہمراہ ٹالٹ پر کھڑے ہو کر با آواز بلند نوکر کے بارے میں یہ سبق یاد کیا کرتے تو اس وقت جیلان کے متعلق نہ تو کوئی واقفیت تھی اور نہ ہی الفت۔

صرف ماہر خیر دین کے ڈنڈے کا خوف تھا کہ جب بھی وہ اپنے خواب خرگوش سے بیدار ہوتے تو اپنے ڈنڈے کی ضرب لگا کر ہمیں سبق یاد کرنے کی تاکید کرتے اور پھر اوسمیخنے لگتے۔

نوکر کے زلزلوں کے سبق یاد کرتے کرتے بچپن میں ہم نے اتنی مار کھائی گویا اس شر میں زلزلے لانے کی تمام تر ذمہ داری ہمارے سر ہو۔ حالانکہ اس شر میں تو ہر سال دو زلزلے بلا ناغہ آتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ نوکر بھی وہیں کی طرح دھیرے دھیرے زمین میں دھنٹتا چلا جا رہا ہے۔ شاید اسی لئے وہاں لکڑی کی عمارتیں تیر کی جاتی تھیں۔ جن کا وزن بھی کم ہوتا تھا اور زلزلے بھی برداشت کر لیتی تھیں مگر آگ بہت جلد پکڑتی تھیں۔ ۱۹۲۳ء میں زلزلے کے بعد جب نوکر میں آگ پھیلی تو شر کا شر را کھ کا ڈھیر بن گیا۔ چنانچہ ایک امریکن ماہر تیر تھاب فریک لائیڈ نے اپریل ہوٹل کی تغیریں سینٹ، سریا، کانکریٹ اور شیشہ اس اسلوب سے استعمال کیا کہ وہ عمارت زلزلوں اور آگ سے حفاظت ہو گئی۔ اس کامیاب تجربے کے بعد نوکر میں تغیرات کا ایک سیالاب سا آگیا اور گپوڈا نما خوبصورت عمارتوں کی جگہ ہر سو گنکریت کے اثر ہے پھن پھیلا کر کھڑے ہو گئے۔ اب حد تک آگوڈی کی چادر اور ٹھیسے یہی اثر ہے دکھائی دیتے ہیں، جنکی خوفناک آنکھیں نبوں ان سائنس بن کر جگنگ جگنگ کرتی رہتی ہیں۔ ان سرپنچ عمارتوں کے سائے میں ٹریفک کا سیل روائی چیزوں کا کارروائی سا دکھائی دیتا ہے جو افراطی اور نفسانی کے عالم میں سڑکوں پر بھکتا پھرتا ہے۔ اس بے راہ روی کے باوجود ہماری گائیڈ نے ہمیں میجھی مندر کے سامنے لا کھڑا کیا۔

میجھی مندر شمنشاہ میجھی اور انکی ملکہ دو اگر شوکن کے نام سے منسوب ہے اور یہ اس دور میں تغیر کیا گیا جب جیلانی شمنشاہوں کو سورج دیوی کی اولاد سمجھ کر ان کی پوچھا کی جاتی تھی۔ ویسے یہ شنتو عقیدے کے لوگوں کا مندر ہے۔ جو اپنے مندر ہیشہ قدرت کے حسین مناظر لیعنی پہاڑی چوٹیوں، جنگلوں، جھیلوں اور جھرنوں کے قریب بناتے ہیں۔ کیونکہ ان کے مطابق بھگوان اور دیوتا حسین نظاروں میں ہی بسرا کرتے

ہیں۔ اسی عقیدے کو بروئے کار لاتے ہوئے تجھی مندر بھی ایک حسین پارک میں تعمیر کیا گیا ہے۔ جاپانی صرف ٹیلی و ڈن، کمپیوٹر اور کیرے ہی نہیں بناتے بلکہ باغ لگانے میں بھی بڑی مہارت رکھتے ہیں، یہاں تک کہ اسلام آباد کی لینڈ سکیٹنگ اور باغ بھی ایک جاپانی ماہر باغبانی کی کاؤش کا نتیجہ ہیں۔ مری روڈ سے زیر پاؤں شاہراہ کے دونوں جانب ساکورا یعنی چیری بلاسم کے پھولدار پودے لگانے کا بھی منصوبہ تیار کیا گیا تھا جس کے لئے جاپانی حکومت نے پاکستان کو اپنے اس قومی پھول کے سینکڑوں پودے تنفس کے طور پر دے۔ مگر ان میں سے کچھ پودے تو ہی۔ ڈی۔ اے یعنی کیپیٹل ڈیپلمٹ اتحادی کے افران بالا کی کوٹھیوں میں لگا دئے گئے اور کچھ ہمارے باغبانوں کی مہارت کی نذر ہو گئے۔ کیونکہ اس شاہراہ پر اب نہ تو کوئی چیری بلاسم کا پودا دکھائی دیتا ہے اور نہ ہی پھول۔ البتہ تجھی مندر کی الگ بات ہے کیونکہ اسکے ارد گرد پھیلے ہوئے وسیع پارک میں چیری بلاسم کے علاوہ دوسرے سینکڑوں قسم کے اور بھی پودے اور درخت ہیں۔ جھیل اور جھرنے ہیں، پھول اور پھلواڑیاں ہیں اور لکڑی کے پل اور پگوڑے ہیں۔ ویسے جاپانیوں نے بڑے بڑے تناور درختوں کو بونا بنانے کے فن میں بڑی ہی مہارت حاصل کر لی ہے۔ چنانچہ اگر وہ چاہیں تو گنجائش کے مطابق برگد کے پیڑ کو چائے کے پالے میں پال پوس سکتے ہیں۔ ویسے بھی ہمارے اور ان کے باغات میں چند نیادی فرق ہیں۔ پہلا اہم فرق تو یہ ہے کہ ہمارے ملک میں چھلدار درختوں کے باغات ہوتے ہیں اور جاپان میں سجاوٹ کے لئے درختوں کے باغات ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ جاپانی فطری طور پر رنگ و بو کے قدر داں ہوتے ہیں جبکہ ہم لوگ یورپیں قوموں کی طرح رنگ و بو کے صرف تجارت کی حد تک قدر داں ہیں۔ ویسے بھی ہمارے اس خطے میں باغات کی روایت تو مغلوں نے ہی شروع کی۔ اس سے پہلے نہ تو باغات تھے اور نہ ہی باغبان۔ البتہ لکڑا ہمارے بہت تھے۔ اب بھی موجود ہیں کہ جنگلوں کے جنگل بیچ کھاتے ہیں۔ پہلے مغل شہنشاہ باہر نے پشاور، ایک، حسن ابدال، واہ اور کلر کمار میں باغات کا سلسلہ شروع کیا اور اسکے بعد آنے والے مغل شہنشاہوں

نے وہ سلسلہ نہ صرف جاری رکھا بلکہ اس میں بڑا حسن و جمال پیدا کیا اور کمال حاصل کیا۔ یہاں تک کہ پھولوں اور پھلوں کے نام سے باغ منسوب کر دیئے۔ مثلاً لاہور میں شالamar باغ کے علاوہ بادامی باغ، انگوری باغ، چنیلی باغ، گلابی باغ اور پھرباغبانوں کا پورا علاقہ باغبان پورہ آباد کیا۔ مغلوں کے ان باغبانوں کی نئی پود باغوں سے اسقدر باغی ہوئی ہے کہ وہ نہ صرف شہنشاہ جہاںگیر کے مقبرے کے ارد گرد پھیلے ہوئے نور جہاں کے دلکشا باغ بلکہ شالamar باغ کو بھی اجازتے کے لئے دن رات کوششیں اور شرم کی بات تو یہ ہے کہ ملکہ آثار قدیمہ کی بے بسی اور حکومت کی بے حصی کے سبب ماشاء اللہ کامیاب بھی ہیں۔ مثلاً ”گنڈریوں“ کیلوں اور موگ پھلی کے چھلکے پھیلکنا، پھول توڑنا، سنک مرمر کی دیواروں کو وکٹ بنا کر کرکٹ کھیلنا، آم کی شاغلوں سے جھولنا، شالamar کے فواروں اور تالابوں میں نہماں اور آثار قدیمہ کے چوکیداروں کو گالیاں دینا تو ان کا پیدائشی حق ہے۔ کیونکہ ان باغوں کے باغبان اسکے آباؤ اجداد تھے۔ لیکن اب تو ملکی اور غیر ملکی سیاحوں پر غیر اخلاقی نعرے بازی، ہلڑ بازی اور لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ ان کے پسندیدہ مشاغل ہیں۔ جن مشاغل کو پورا کرنے کے لئے یہ نوجوان نہار منہ ہی ان باغات میں ہتھیج جاتے ہیں۔ دن بھر چھاہبڑی فروشوں اور کھوکھے والوں سے غنڈہ غنڈیں وصول کرتے ہیں اور سیاحوں سے دل گلی کرتے ہیں۔ تم کی بات یہ ہے کہ یہ نوجوان گھر سے تو تعلیم حاصل کرنے کے لئے نکلتے ہیں لیکن نہ استادوں میں ہمت ہے کہ ان کی غیر حاضری لگائیں نہ والدین کو فرصت ہے کہ انکی تعلیم کے بارے میں کچھ پوچھ چکھ کر سکیں اور نہ ہی کسی حکومت میں جرات ہے کہ یہ غنڈہ گردی روک سکے۔ مگر الحمد للہ تجھی مندر کے باغ میں باغبان پورہ کے نوجوان غنڈے موجود نہ تھے۔ ہر طرف سکون تھا، خوشیاں تھیں، میک تھی، جو بن تھا اور رنگ تھے۔ چنانچہ اس رنگ میں رنگ رلیاں منانے کے لئے ہماری گائیڈ مس کا تو اور باغی درویش اول نے تو ایک آبشار کا رخ کیا اور ہمیں تجھی مندر میں جانے کا اشارہ کر دیا۔ ان کی اس حرکت پر ہمارا مٹی کا مادھو، درویش دوم بھی طیش میں آگیا اور اس نے

پھیلی ہوئی یہ گندھارا کی سر زمین جسکے شوپے، عبادت گاہیں اور یونیورسٹیاں اس قدر عروج پر پہنچیں کہ بدھ مت کے سکالرز اور عبادت گزار ہزار ہا میل کے دشوار گزاز راستے طے کر کے یہاں پہنچتے۔ آج بھی شاہراہ ریشم پر جابجا ان قدیم مسافروں کی منتوں کے نشان چٹانوں پر کندہ ہیں۔ جیلان، کوریا، تائیوان اور دوسرے بدھ ممالک سے ہزاروں لوگ ان عبادت گاہوں کی یاترا پر آئتے ہیں مگر ایسا ہوتا نہیں۔ کیونکہ سیاحت کو فروغ دینے والے سرکاری اداروں میں منصب سنبھالے پیرو کریم صرف حکمرانی کرتا اور کام میں روڑے اٹھاتا تو جانتے ہیں مگر عمل کرنا نہیں جانتے اور نہ یہ چاہتے ہیں کہ سیاحت کو فروغ ہو۔ پھر ان عبادت گاہوں، شوپوں اور یونیورسٹیوں کی حالت زار بھی کچھ ایسی ہے کہ ہماری مذہبی فراخدلی کا منہ چڑا تی ہے۔ ویسے جاپانی حکومت نے تو نیکسلا کی بدھ یونیورسٹی کی تعمیر نو کی پیشکش بھی کی تھی۔ مگر سنہ ہے کہ ہمارے حکمرانوں نے جاپانیوں کو بدھ یونیورسٹی کو ہونے کی بجائے کاروں کا پلانٹ لگانے کا مشورہ دیا۔

ہم تو مسجدیں بھی عید کے عید جاتے ہیں اس جاپانی مندر میں بھلا کیا جاتے۔ مگر درویش دوم کی ہوٹل کا مل چکا نے والی تانہ ترین دھمکی ہمیں یاد تھی۔ اس لئے جو تے بغل میں دبائے اور چپکے سے مندر میں گھس گئے۔ تاہم جیت اس بات کی ہوئی کہ نہ تو وہاں کوئی جو توں کی رکھوالی کرنے والا ٹھیکیدار تھا اور نہ ہی کسی دوسرے نے اپنے جو تے بغل میں دبا رکھے تھے۔ ہم نے ادھر ادھر دیکھا اور کھیانے سے ہو کر اپنے ڈیڑھ فٹ لمبے جو تے بغل سے نکال کر جاپانیوں کے چھوٹے چھوٹے کھلونا نما جو توں میں رکھ دیئے۔ مگرچھی بات یہ ہے کہ ول میں جو تا چوری ہونے کا دھڑکا لگا رہا۔ ول کو یہ سوچ کر تسلی دی کہ آخر جاپانی ہمارے جو تے کو چاکر کریں گے کیا؟... لیکن ایک دسوے نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا کہ جہاں چوروں کے ہاتھ قلم کر دیئے جاتے ہیں چوری تو آخر وہاں بھی ہوتی ہے۔ جیلان میں بھلا کیوں نہ ہوگی؟ ہم فوراً اپنا جو تا اٹھانے کے لئے جھکے۔ کیونکہ ہمارا جو تا چوری ہونے کی صورت میں

میرے دل کی بات کہدی۔ ”اوے گنجے شزادے سلیم! ابھی تو تو اس پھینی انارکلی کو عیاشی کرنے لے جا، مگر بچو! رات تو تمیں ہمارے ساتھ ہی گزارنی ہے نا!....“ درویش دوم کے اس فقرے کا تو درویش اول پر کچھ اثر نہ ہوا البتہ درویش دوم نے جاتے جاتے جو بات کسی وہ بڑی کارگر ثابت ہوئی۔ ”اوے گنجے یاد رکھ ابھی ہمارا سفر بھی ختم نہیں ہوا اور ہوٹل کا مل کھا کتا ہے۔“ پیسہ ہیش سے انسان کی کمزوری رہا ہے۔ اور یہ فقرہ سنتے ہی درویش اول مجوری سے موم ہو گیا۔

سالپرس کی لکڑی کا روایتی دروازہ اور لکڑی کا ہی بنا ہوا گپوڑا نما مندر ..... کبوتر اور کبوتروں کو چوگہ ڈالنے جاپانی۔ ان کبوتروں سے میں بہت تنگ ہوں۔ یہ ہر ملک میں ہر مذہب کے لوگوں سے چوگے کا نیکیں وصول کرتے ہیں۔ اور تم یہ کہ ان عیاروں کو دنیا بھر میں معصوم پرندہ ہیں۔ تجھا جاتا ہے۔ اگر بھوکے پرندے کو چوگہ ڈالنے سے ثواب ملتا ہے تو پھر کوئے کو چوگہ کیوں نہیں ڈالا جاتا۔ صرف کبوتر ہی کو کیوں؟ ویسے ہمارے گاؤں کے حکیم جی کبوتروں کو خوب نکرے ہیں۔ وہ ہر مرض کو نئے میں کبوتر کا گوشت کھانے کا مشورہ دیتے ہیں۔ چنانچہ سردیوں کے موسم میں میلوں تک ہمارے گاؤں کے گرد و نواح میں کوئی کبوتر نہیں پھلتا۔ اور جو غلطی سے پھلت جاتا ہے وہ پھر کا دیا جاتا ہے۔ بدھ مذہب امن کا مذہب ہے۔ بدھ مت کے پیرو چرند پرند کسی پر بھی ظلم نہیں کر سکتے۔

کتنی جیت کی بات ہے کہ صدیوں پہلے ہمارا خطہ بدھ مت کا گموارہ تھا۔ مہاراجہ اشوک نے ۲۶۲ ق م کا لگا ( موجودہ اڑیسہ) کی جنگ میں خوزیری دیکھنے کے بعد امن کا مذہب یعنی بدھ مت اختیار کیا اور اس مذہب کے پچار کا بیڑا اٹھا لیا۔ قدیم گزر گاہوں پر کتبے نصب کئے گئے اور دور دراز ممالک میں بدھ مت پھیلانے کو تبلیغی جماعتیں روانہ کیں۔ کچھ تو جنوبی ہندوستان سے نکل کر بہما اور سری لنکا جا پہنچیں اور وہاں بدھ مذہب پھیلایا اور کچھ تبلیغی جماعتیں قدیم شاہراہ ریشم سے چین کو یا اور جیلان جا پہنچیں۔ اور وہاں سے آنے جانے کا ایک نیا سلسہ شروع ہو گیا۔ نیکسلا سے کامل تک

ہمارے سائیز کا جوتا تو پورے مشرق بعد میں ملنا ناممکن تھا۔ ہمارے ہاتھ جوتے تک پہنچنے ہی والے تھے کہ درویش دوم کی کرخت آواز میں حکم نے ہمیں ٹوک دیا۔ ”اوے تمیں جوتا چوری ہونی کی کسی نکرگی ہے۔ نہ تو یہ کوئی پاکستانی مزار ہے اور نہ ہی یہاں درویش اول موجود ہے۔ پھر تمہارا جوتا بھلا کون چرائے گا؟ اور جاپانیوں کو اس ہنر کی عادت نہیں ہے۔“ ہم نے جوتا دیں چھوڑا اور درویش دوم کے ہمراہ ہوئے۔

میکی مندر کے اندر عجائب منظر تھا۔ نسل نسل کے لوگ ... جکا مزاج اور مذاق اپنا اپنا... مذہب اپنا اپنا... عقیدے اپنے اپنے ... زبان اپنی اپنی اور سوچ اپنی اپنی ... اس کے باوجود ہم نے زندگی میں پہلی مرتبہ انسانوں میں اپناست بھی پائی خلوص بھی اور محبت بھی ... ایسا منظر ہماری مساجد میں آخر کیوں نظر نہیں آتا؟ ہمارا دین تو امن اور سلامتی، محبت اور بھائی چارے کا دین ہے ... پھر یہ شرپسند عناصر کماں سے آن پہنچے؟ جھنوں نے مذہب اور مسجد دونوں پر قبضہ کر لیا ہے ... اور وہ قبضہ ان سے اب پس (پولیس) بھی نہیں چھڑا سکتی۔ کیونکہ پس تو ہمیشہ قابض کا ساتھ دیتی ہے۔

مندر سے واپسی پر اپنے جوتوں کو جوں کا توں پایا تو مجھے یقین آیا کہ واقعی جاپان میں چوری نہیں ہوتی ہے۔ چور بھی نہیں ہوتے۔ بھکاری بھی نہیں ہوتے۔ اور اگر آپ کی کوئی چیز گم ہو جائے تو مل بھی جائے گی۔ کیونکہ حکومت نے ہر شریں تلاش گشیدہ کے دفاتر کھول رکھے ہیں۔ جہاں ہر گواچی ہوئی چیز مل جاتی ہے اور ہمارے معاشرے میں چینی انجینئر اور جاپانی سیاح تک گم ہو جاتے ہیں۔ مگر جاپان میں جس جاپانی کو جو چیز جہاں سے ملے گی وہ اس دفتر میں جمع کرادے گا۔ البتہ گواچا ہوا لوگ، اُنی ہوئی عصمت اور کھوئی ہوئی عزت ان دفتروں میں نہیں مل سکتی۔ میرا اندازہ ہے جاپان میں جوتوں کا کاروبار ہرگز نہیں چل سکتا۔ کیونکہ جاپانیوں کو جوتے اتارنے کی بہت بڑی عادت ہے۔ گھروں میں جوتے وہ نہیں پہنتے۔ مندوں میں جوتا

وہ نہیں پہنتے، کوئی مذہبی رسم ہو تو جوتے وہ اتار دیتے ہیں۔ پھر جوتوں کی چوری بھی وہاں نہیں ہوتی۔ کہتے ہیں کہ جب ۱۸۷۴ء میں ٹوکیو سے یو کوہاما تک ریل گاڑی شروع ہوئی تو ریلوے حکام نے انتہائی سفر کے لئے معزز شریوں اور افسران بالا کو مدعو کیا۔ حسب عادت جاپانیوں نے شباشی ریلوے شیشن کے پلیٹ فارم پر اپنے جوتے اتار کر ٹرین میں قدم رکھا۔ جب یو کوہاما میں گاڑی رکی تو ظاہر ہے اس پلیٹ فارم پر ان کے جوتے موجود نہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے نیکے پاؤں ہی اس خصوصی تقریب میں حصہ لیا۔ واپس ٹوکیو پہنچنے تو اسی پلیٹ فارم سے جوتے پہنچنے اور اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔

میکی مندر سے نکلتے نکلتے شام ڈھل چکی تھی دیسے بھی درویش دوم اور مجھے شام کا شدت سے انتظار تھا تاکہ ہم دونوں ہوٹل پہنچ کر درویش اول کی گت بنا سکیں۔ مگر جب ان دونوں سے مندر کے باہر ملاقات ہوئی تو درویش دوم کی دھمکی کے سبب درویش اول موم اور مس کا تو موم ہتی بنی ہوئی تھی۔ اس نے فوراً ہی ایک جاپانی ریستوران میں روایتی کھانے کی دعوت دیدی۔ جو ہماری سیر ہر ٹال ختم کرنے کے لئے کافی تھی۔ گو مجھ پر کینٹکی کا دورہ ابھی باقی تھا۔ لیکن کھانا بہر حال میری بھی کمزوری کا نتیجہ ہے۔

کھلے آسان تھے ایک وسیع پارک میں یہ ریستوران واقع تھا۔ اس پارک کی خاص بات جو اب تک مجھے یاد ہے وہ یہ ہے کہ وہاں ہر سو جگنو ہی جگنو چک دھمک رہے تھے۔ اور جگنو بھی ہزاروں کی تعداد میں۔ جاپان میں ہر شے کی فراوانی کا احساس بہت شدت سے ہوتا ہے۔ مخلوق دیکھیں تو شد کی کھمیوں کی طرح ہر جانب بھینٹاں دکھائی دیتی ہے۔ سڑکوں پر کاریں دیکھیں تو وہ چیزوں کی طرح نہ ختم ہونی والی قطاروں میں حد نظر تک پھیلی دکھائی دیتی ہیں، اب اس پارک میں جگنو دیکھے تو وہ بھی سیاہ رات کے سینے پر چنگاڑیوں کی بارات بننے دکھائی دیتے۔ اس ریستوران میں ہر میز خود کفیل کچن تھا۔ یعنی میز پر گیس کا چولہا اور ہر چولہے پر المٹے تیل کی کڑاہی اور کچا

ڈال دیئے۔ میں تو اپنے مذہبی عقیدے کا سارا لیکر مٹاڑ کھیرے اور دوسری سبزیاں تل کر کھاتا رہا۔ کیونکہ ان میں نہ پتا ہوتا ہے اور نہ زہر۔ مگر رقبت کا زہر میری رگ رگ میں گھل رہا تھا اور میں متواتر گیس کا چولہا پھٹنے کی دعائیں مانگتا رہا۔ مگر آگ جلتی رہی، تیل البتا رہا، گوشت پکتا رہا، درویش کھاتے رہے۔ چولہا سلامت رہا۔ چولہا سلامت رہے۔ دوست زندہ رہیں اور میں شرمدہ رہوں۔

آدمی رات کا سماں تھا۔ درویش دوم کے خوفناک خراۓ ہمارے محضرے کرے میں گونج رہے تھے۔ میں مس کا تو کی بے وفائی کے کرب میں کوشش بدل رہا تھا کہ ہمارے دروازے پر دستک ہوئی۔ میرے خوش فم ذہن نے لمحے بھر کے لئے سوچا کہ شاید مس کا تو ہوگی۔ میں نے پیک کر دروازہ کھولا تو سامنے ایک سما سما سا جیلانی کھڑا تھا۔ اس نے اپنی شکستہ انگریزی اور اشاروں سے چایا کہ ہمارے کمرے سے اٹھتے ہوئے ہنگامے نے اس کی نیند اچاٹ کر کے رکھ دی ہے۔ درویش دوم کے خراۓ تو صرف کمرے تک ہی محدود تھے۔ البتہ جب وہ اپنے ڈیرہ فٹ چوڑے پنگ پر کوٹ بدلتا تو اسکی بھرپور ٹانگ ٹکرانے سے ممین سی دیوار بھی ہل جاتی اور دوسرے کمرے میں لینا پڑوی بھی۔ چنانچہ اس معصوم جیلانی کی خاطر میں نے اپنے تکیے درویش دوم کے پنگ سے لگی دیوار کے ساتھ چن دیئے تاکہ اسکی ٹانگ ٹکرانے سے نہ دیوار لرزے اور نہ جیلانی۔

جیلانی میں دیئے تو چار ہزار کے لگ بھگ چھوٹے بڑے جزیرے ہیں۔ جن میں چند ایک کے لئے جذباتی جھگڑا تو انہوں نے روس کے ساتھ بھی کر رکھا ہے کہ روس نے وہ جزیرے دوسری جنگ عظیم میں جیلانیوں کی شکست کے بعد ان سے ہٹھیا لئے تھے۔ جو وہ یقیناً روس سے واپس بھی لے لیں گے، چاہے انہیں وہ خریدنے ہی پڑیں۔ مگر درحقیقت جیلانی میں کام کے چار ہی جزیرے ہیں جن پر پورا ملک آباد ہے۔ اور ان چار جزیروں میں بھی کوئی سوکلو میزرا کا وہ صفتی علاقہ ہے جس میں پورے ملک کی دوستائی آبادی سمائی ہوئی ہے۔ آبادی کے اس حیرت کردے کو دیکھنے کی خاطر ہم نے

راش۔ راش میں سبزیاں بھی تھیں، گوشت بھی اور مچھلیاں بھی۔ ان مچھلیوں میں دو ایسی قسم کی مچھلیاں بھی تھیں جو خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان میں ایک تو سو شی مچھلی تھی۔ جسے کڑاہی میں ابلتے سویاہیں کے تیل میں پکانے کی چند اس ضرورت نہ تھی۔ بلکہ بگلے کی طرح اسے کچا ہی لگانا تھا۔ درویش اول تو سو شی مچھلی آنکھ جھپکائے بغیر ہی نگل گیا۔ درویش دوم نے وہ مچھلی نگلی تو ضرور مگر شکل ایسی بڑی بنائی کہ اسے دیکھنے کے بعد مجھ میں تو وہ مچھلی نگلنے کی ہمت نہ رہی۔ چنانچہ میں نے اپنی میزبان سے یہ بہانہ کر کے جان چھڑائی کہ میرے مذہبی عقیدے کے لوگ مچھلی نہیں کھاتے۔ جس پر مس کا تو نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”کیا تم مسلمان نہیں؟“ ”بھی مسلمان تو ہوں مگر ....“ میں مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے بارے میں بتانا ہی چاہتا تھا کہ درویش دوم نے عقائدی کا ثبوت دیتے ہوئے میری بات کاٹ کر مس کا تو کا دھیان میز پر رکھے راش میں لگا دیا۔ مس کا تو نے دوسری مچھلی کی تعریف سنائی تو دونوں درویشوں کے پسینے چھوٹ گئے۔ ”یہ جیلان کے شمالی سمندروں کی مچھلی ہے .... جو بیساں کی لزیذ ترین مچھلی سمجھی جاتی ہے .... البتہ اس مچھلی کو کھاتے وقت یہ بات جان لیتا ضروری ہے کہ لاکھوں میں سے کسی ایک کے پتے کا زہر رہ جاتا ہے .... جسے کھانے سے یہ مچھلی کھانے والا میز پر ہی دم توڑ دیتا ہے ....“ درویش اول کو تو اپنے نئے نویلے عشق کا بھرم رکھنا تھا۔ مگر درویش دوم پر تو قیامت نوٹ پڑی۔ کیونکہ نہ وہ مچھلی کھانے سے انکار کر سکتا تھا اور نہ ہی مچھلی کھانے کا رسک سے سکتا تھا۔ ویسے درویش اول کی خندان پیشانی پر بھی خوف کے موتی جگنوں کر چکنے لگے۔ میں نے اپنی رقبت کا بدله لینے کے لئے اپنے حصے کی وہ مسلکوں مچھلی بھی درویش اول کی پلیٹ میں ڈال دی۔ جس پر درویش اول نے مجھے ایک پچھے دار سرائیکی گالی سے نوازا اور میر کے بیچے سے لگ بھی لگانے کی کوشش کی جو درویش دوم کو گلی۔ درویش دوم نے جوابی حملہ کرتے ہوئے اسے ایک پشتہ ”پچھڑا“ سنایا۔ مگر مس کا تو نے ان دونوں کی دشواریاں دور کر دیں۔ اس نے وہ مچھلی ہٹا کر گوشت کے ٹکڑے سلاخوں میں پروئے اور ابلتے تیل میں

کھائے۔

جاپان میں بزنس کرنے کا یہ بہت قدیم اور اچھوتا اصول ہے کہ وہ غیر ملکی گاہوں کی بے شری کی حد تک خدمت کرتے ہیں۔ جسکے لئے انکی کپنیاں بھاری رقمیں مخصوص کرتی ہیں۔ جاپانی بزنس میں خود بھی جب کسی دوسرے ملک میں تجارت کے لئے جاتے ہیں تو اسی قسم کی خدمات کی توقع رکھتے ہیں۔ اس قسم کی خدمت کو وہاں بزنس کا اہم جزو سمجھا جاتا ہے۔ چونکہ اس مخصوص خدمت کے لئے باقاعدہ تربیت یافتہ لڑکوں کی ضرورت ہوتی ہے، اس لئے روایتی گیشا کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی ہے۔

### ششیرو سنان اول طاوس و رباب آخر

علامہ اقبال کا یہ مصرع دنیا کی ہر قوم پر صادق آتا ہے۔ جاپان میں جب شوگن اور سامرائی جنگجو بہادروں کا دور تھا تو انکی دلجوئی کے لئے گیشا یعنی ہنرمند خاتون کی روایت پڑی اور وہ روایت اب تک جوں کی توں باقی ہے۔ کم سن بچیاں، ماں باپ کی غربت یا کسی اور ستم کا شکار ہو کر گیشا گھروں تک پہنچ جاتی ہیں۔ جہاں تجربہ کار مہماں انہیں موسیقی، نگینت، رقص، رہن سن، چال ڈھال اور دوسرے دلجوئی کے فنون لطیفہ سے آراستہ کرتی ہیں۔ تربیت کے دوران انہیں مانگیوں کما جاتا ہے۔ ہمارے لئے گیشا کوئی نئی چیز نہیں کیونکہ ہماری تندیب کی طواائف کو بھی انہی حالت میں اور اسلوب پر تربیت دی جاتی ہے۔ اصولی طور پر نہ تو گیشا جسم فروش ہوتی ہے اور نہ ہی طواائف۔ دونوں ہی مردوں کی دلجوئی کے فن میں کیتا ہوتی ہیں۔ مثلاً ”جاپان کی روایتی سرمنی یعنی چائے پینے کو ایک خوبصورت مظاہرے اور شو میں بدل دیا گیا ہے۔ چائے تو بندہ بھا شیدے کے ہوٹل پر بھی پی سکتا ہے۔ مگر جب گیشا کے ہاتھ سے چائے کا پیالہ ملے تو چائے امرت بن جاتی ہے۔ درحقیقت چائے تو ہی کمینی سی چائے ہے مگر جب اسے جاپان کی نئی سرمنی میں پیش کیا جاتا ہے تو اس کی طرح .... ناز و ادا کے ساتھ۔ نئی سرمنی مہمانوں کے مجمع میں نہیں کی جاتی بلکہ چند مہمانوں کے لئے علیحدہ علیحدہ انتظام کیا جاتا ہے تاکہ ہر ایک کی پرائی ولی بھی حفظ رہے اور خصوصی توجہ بھی دی جا

ٹوکیو سے اوسا کا کے لئے ہوائی سفر ترک کر کے بلٹ ٹرین کا ٹکٹ کٹوایا۔ مگر ہماری روانگی میں تو ابھی چوبیس گھنٹے باقی تھے اور وہ چوبیس گھنٹے ہمارے لئے قیامت کی گھٹیاں بن گئے۔

ہماری گائیڈ مس کا تو گنگزا میں یاماہا میوزک سور پر کام کرتی تھی۔ چونکہ اسکی چھٹیاں ختم ہو چکی تھیں اس لئے اسے کام پر جانا تھا، مگر اپنے بھوٹنڈے عاشق درویش اول سے ملنا بھی ضرور چاہتی تھی۔ اس لئے اس نے ہمیں لائچ دیا کہ اگر ہم لوگ اس کے سور پر آئیں گے تو وہ ہمیں پاکستانی گانے کی کیسٹ سنوائے گی۔ کچھ عرصہ انسان دلیں سے دور رہے تو اپنی زبان میں گالیاں بھی اچھی لگتی ہیں۔ وہ تو پھر گانے سنوانے کا وعدہ کر رہی تھی۔ اور وہ وعدہ اس کا سچا بھی تھا۔ کیونکہ یاماہا کپنی والوں نے ایک مرتبہ ائر نیشنل سائل فیشنول کروایا تھا، جس میں ملکہ ترم نور جہاں نے پاکستان کی نمائندگی کی تھی۔ اور انہوں نے لال شہباز قلندر کی دھنال لیک اور پچ پچ کر گائی تو ہاں میں بیٹھے جاپانی وجد میں آگئے تھے۔ یاماہا سور میں وہ گانا سن کر ہم لوگ بھی وجد میں آگئے اور وطن کی یاد ستابنے لگی۔ مگر درویش اول کے پاؤں میں عشق کی زنجیر تھی۔ جس کا وزن لمحہ بہ لمحہ بڑھتا چلا جا رہا تھا اور لمبائی لمحہ بہ لمحہ گھٹتی چلی جا رہی تھی جو بڑے ہی خطرے کی بات تھی۔ کیونکہ پردمیں میں کے گئے عشق اکثر جان لیوا ہوتے ہیں، اور عشق بھی جاپان میں .... جاپانی لڑکی کے ساتھ .... جو ہارا کیری یعنی خود کشی کو جدائی پر ترجیح دیتی ہیں۔ خیرا بھی تو خود کشی کا کوئی خطرہ نہ تھا۔ کیونکہ درویش اول یاماہا سور میں ایک بزنس میں کے روپ میں موجود تھا، جو پاکستان میں جاپانی میوزک کا سامان اپورٹ کرنے کی غرض سے بزنس ٹرپ پر جاپان میں آیا تھا۔ چونکہ مس کا تو اس کے اس ڈرائیور میں برابر کی شریک تھی، اس لئے اس نے سور کے مینجر کو درویش اول کے دربار میں حاضر کر رکھا تھا۔ بزنس کے لائچ میں یاماہا سور کے مینجر نے درویش اول کو کھانے کی دعوت دی جس میں ظاہر ہے مس کا تو بھی شامل تھی۔ مگر ہم دونوں کا اس دعوت سے پہاڑ گیا۔ جس پر درویش دوم نے خوب پہنچ و تاب

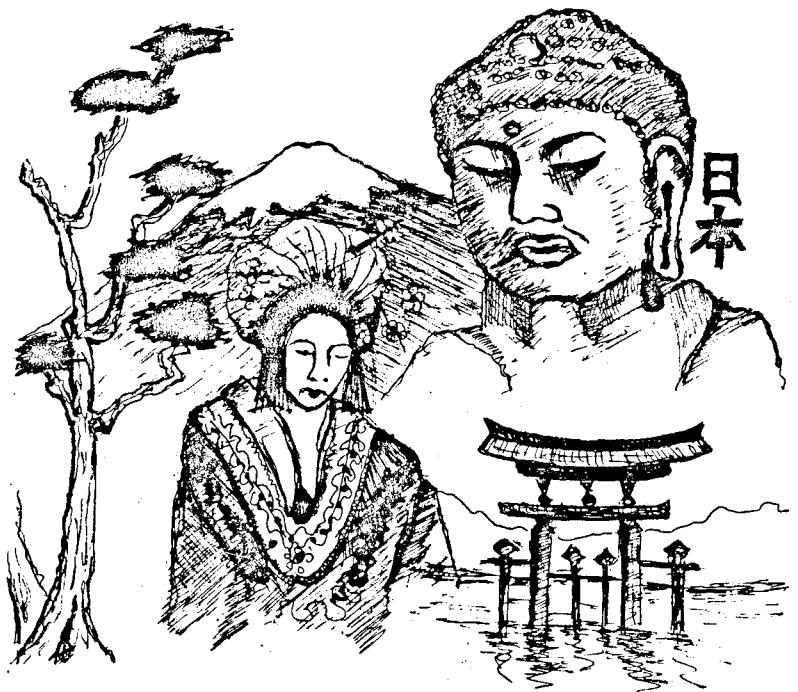
جا کر انتظار تو ہرگز نہ کروں گا۔ چنانچہ میں نے اپنے ایک پرانے دوست پسیڈی سے فون پر رابطہ کیا اور حیرت کی بات ہے کہ وہ رابطہ ہو بھی گیا اور اس سے بھی بڑی حیرت کی بات تھی کہ پسیڈی نے سب کام چھوڑ چھاڑ کر مجھ سے ملنے کا وعدہ بھی کر لیا۔ اسکا اصل نام کیا تھا یہ تو کوئی بھی نہ جانتا تھا۔ کیونکہ اسکی سبک رفتاری کے سبب اسے یہ نام ملا تھا اور اب یہ نام اس سے اس طرح چپکا تھا کہ نہ تو اسے اس نام سے چھکنا را مل سکتا تھا اور نہ ہی پسیڈ سے۔

پسیڈی ہماری طرح لاہور میں تو لفٹگا ہی تھا مگر تو یکوں میں وہ بڑی کام کی شے بن گیا۔ جاپان پہنچتے ہی سب سے پہلے تو اس نے ایک عدد جاپانی یوی سنبھالی جو اس ملک میں باعزت زندگی گزارنے کے لئے ضروری بھی ہے اور مجبوری بھی ہے۔ کیونکہ جاپانی لوگی سے اگر ایک مرتبہ آنکھے ملکا ہو جائے تو وہ بڑے کے گھر تک ہی پہنچا کر لوٹتی ہے۔ ہماری لڑکیوں کی طرح ٹوے بہا کر کسی اور کی ڈولی میں نہیں بیٹھ جاتی۔ جاپانی لڑکیوں کی اسی خصلت کے سبب میں درویش اول کے انعام سے خوفزدہ تھا۔ کاروبار کے سلسلے میں پسیڈی نے طلاق شدہ یعنی ریکنڈ شیڈ کاروں کا کام سنبھالا جو پاکستان میں عزت بحال کرنے کے لیے اشد ضروری تھا اور سچ پوچھیں تو مجبوری بھی تھا۔ کیونکہ سال میں ایک آدھ مرتبہ لاہور کے فٹ پاٹھوں پر چکر لگانے بغیر اسکا گزارہ نہ تھا۔ اور یہاں قدم پر کم بخت قرض خواہوں نے ذیرے لگائے ہوئے تھے۔ چنانچہ اس نے اپنی ہی طرح کے دوسرا پاکستان سے بھگوڑے نوجوانوں کا ایک لشکر جمع کیا اور انہیں جاپان کے شر شہر.... برائی کی طرح پھیلا دیا۔ وہ لوگ پہلے تو خذہ حال کاروں کو مختلف بوچڑخانوں یعنی کباڑخانوں سے اکٹھا کرتے ہیں۔ پھر پر نہ پر نہ جوڑ کر اس قابل بنا دیتے ہیں کہ وہ ڈھانچہ کار کملا سکے۔ مگر جاپانی حکومت نے بھی کچی گولیاں نہیں کھلیں۔ دیسے بھی تو کہتے ہیں نہ کہ ساحلوں پر آباد قومیں یا تو قراقچ ہوتی ہیں یا تاجر۔ مگر جاپانیوں نے تجارت میں قراقچ کی ہے۔ وہ اس طرح کہ پہلے تو انہوں

سکے۔ تاتا مائی، چٹائی کا فرش اور شوچی یعنی موی کا ٹنڈ کی دیواریں .... کیمونو میں ملبوس .... چھوٹوں پر سفید میک اپ کی اتنی موٹی تیسیں کہ جلد پور سلین کی طرح دکھائی دیتی ہے .... بال بھی کچھ اس انداز سے بنائے جاتے ہیں گویا وہ بال نہ ہوں بلکہ خوبصورت تاروں کا جال ہو جس میں رنگ برنگ چھوٹوں اور رنگ بجھے ہوں .... ان کا ٹنڈ کی دیواروں میں جب گیشا آتی ہے تو ہوا کے جھوٹکے کی طرح .... ہر سو غوشہوں بھی پھیل جاتی ہے اور رنگ بھی بکھر جاتے ہیں .... چینکوں کی چھنک .... پیالوں کی کھنک .... دشیے بجھے میں چمک .... بس اک سماں سا بندھ جاتا ہے، اور یہی اس سرمنی کا حسن ہے۔ کچھ یہی ماحول طوائف کے کوٹھے پر بھی ہوتا ہے۔ پان تو مولا بخش بھی پہنچتا ہے .... جہاں للاڑیوں کی طرح رنگے ہاتھ اور کتھے سے خون آکوں جبڑوں والے لوگ آپکو پان تھماتے جاتے ہیں۔ مگر وہی پان جب طوائف پیش کرتی ہے .... تو چاندی کی طشتی ..... گلاب کی پتیوں میں سچے پان کے پتے .... چاندی کے ورق میں لٹپیں الائچیاں .... اور پکاسو کی پینٹنگ کی طرح رنگوں کی قوس قزح بناتے پان سالے .... جملی جملی سیاہ پلکیں .... منڈی میں رنگا .... زیور میں سجا .... تراشا۔ سا ہاتھ جب آداب بجا لا کر پان پیش کرتا ہے تو .... سماں تو بندھ جاتا ہے مگر پان بہر حال کوئی اتنی رو منیٹک شے بھی نہیں .... کیونکہ پان چبانے سے آپکا خون آکو دہن نہ مسکرانے کے قابل رہتا ہے اور نہ کھانے کے۔

جاپان دنیا کا منگا ترین ملک .... تو یکوں جاپان کا منگا ترین شر اور گنزا اس شر کا منگا ترین بازار ہے۔ یہاں زمین سننی میڑز کے حساب سے سکتی ہے۔ لیکن اس منگائی کے باوجود یہاں ایسے جzel سور بھی ہیں جو ایکڑوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ گوان کا پھیلاو لمبائی چوڑائی کے بجائے اوچائی میں ناپا جاتا ہے۔ ایسے بازار میں تو وندو شاپنگ کرنے سے ہی دل بیٹھ بیٹھ جاتا ہے، مگر ہمارا شیر شاپنگ درویش دوم اس منگائی کی آگ میں بے خطر کو دیگیا اور کوئنے سے پہلے مجھے ہوشی پہنچ کر انتظار کرنے کا حکم نامہ جاری کر گیا۔ اس سفر میں پہلی مرتبہ میں نے بھی بغاوت کر دی اور فیصلہ کیا کہ ہوشی

میں سے اترے گا جکا شکارا جائے گا گلی گلی اور دوسرے درویش جلیں کے گھری۔ گھر پسیدی تو ہیشہ کی طرف فٹ پاتھ کا شزادہ نکلا۔ چنانچہ اپنی مایوسی کا انعام کرتے ہوئے میں نے اس سے لکھا۔ ”یار پسیدی لاہور کے فٹ پاتھوں نے تیرے پاتھ پاؤں سے نکل آکر بھوک ہڑتاں کر دی تھی، اب ٹوکیو کی فٹ پاتھوں پر تو رحم کرو۔“ پسیدی نے حسب عادت دیرینہ بڑے ہی رازدارانہ انداز میں کھر پھر کرتے ہوئے میرے کان میں گاڑی نہ لانے کی کوئی وجہ بیان کی جو گنزا کے شور و غل میں بالکل پلے نہ پڑی۔ لیکن جان چھڑانے کیلئے میں نے فوراً اطمینان کا انعام کر دیا اور ہم دونوں نے غالبتاً پنجابی انداز میں ملاپ کیا۔ یعنی پہلی توڑ ”بچھہ“ اور مجع کیر پرش احوال... جس سے دل کی بھڑاس بھی نکل جاتی ہے اور بھٹکے کر دو ہوں تو سانس بھی۔ ہماری ملاقات ختم ہوئی تو ہم دونوں سے سے جپانیوں کے گھیرے میں تھے۔ جن کی آنکھوں کی لکریں یمنتوں کے شیشے کی دیلر کے پیچے خوف سے مزید تر چھوڑ ہو گئی تھیں۔ ہم نے



نے اپنی کچرا نما کاروں کو بیچ کر ڈھانچے اٹھوانے کا مفت بندوبست کر لیا اور اس کے بعد یہ پابندی بھی لگا دی کہ کوئی گاڑی انپیکش کے بغیر باہر نہیں سمجھی جاسکتی۔ چنانچہ پسیدی جیسے سوداگروں کو مجبوراً ”گاڑیاں ریکنڈیشن کرنی پڑیں اور اس طرح جاپانیوں نے کاروں کے فاضل پر زے بیچنے کا پاکا پاکا انتظام کر لیا۔ ریکنڈیشن ہونے کے بعد یہ گاڑیاں جاپان کی مختلف بندرگاہوں میں پہنچا دی جاتی ہیں۔ اکثر پاکستانی نوجوان تو اسی کام پر مامور ہیں۔ یعنی دن رات گاڑیاں چلاتے ہیں، گاڑیوں میں جاتے ہیں اور گاڑیوں میں سوتے ہیں۔ جپانی بندرگاہوں سے یہ گاڑیاں سیدھی دوہنی کا رخ کرتی ہیں، جہاں انہیں مسلمان کیا جاتا ہے۔ یعنی پاکستانی مزدوروں کے نام کر دی جاتی ہیں اور پھر گفت سکیم کے تحت پاکستان کی جانب پچکولے کھاتی چل پڑتی ہیں۔ کشنز کی سفید دیوار کو روشن کی کند سے پار کرنا تو کوئی مشکل کام نہیں .... پچھے پچھے کر سکتا ہے۔ چنانچہ کراچی اور لاہور کے شوروں میں جو یورہ دلنوں کی طرح گرد و غبار کی چادر میں منہ چھپائے گاڑیاں دکھائی دیتی ہیں وہ پسیدی اور اس جیسے دوسرے سوداگروں کی تین چار ماہ کی انٹکھ مدت کے بعد یہاں تک پہنچتی ہیں اور ہاتھوں ہاتھ اٹھائی جاتی ہیں۔ اس طرح پاکستان میں بے کار پاکستانیوں کو گاڑیاں ملتی رہتی ہیں اور جاپان میں بیکار پاکستانیوں کی گاڑیاں چلتی رہتی ہیں۔

اس سفر میں یہ پہلا موقع تھا کہ تینوں درویش ایک دوسرے سے اس بے رخی سے جدا ہوئے کہ نہ ہی واپسی کا وقت بتایا اور نہ ہی دوبارہ ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ ویسے سفر طویل ہو جائیں تو تمام تر انسانی خود غرضیاں اور بے دردیاں کھل کر سامنے آجائی ہیں اور شرافت کے آنکن میں چھپی کیمیکیاں بے نقاب ہو جاتی ہیں۔ شاید سفر کی صعبویتیں ہم تینوں کے اعصاب پر اثر انداز ہو گئی تھیں، اور یہی وجہ تھی کہ ہم تینوں نے اپنی رایں اختیار کیں اور ایک دوسرے سے جدا ہونے پر خوش تھے۔ گوئی خوشی کا سبب تو پسیدی سے ملاقات بھی تھی۔ لیکن اس سے ملاقات ہونے پر خاصی مایوسی ہوئی۔ کیونکہ میں نے تو سوچ رکھا تھا کہ پسیدی کسی ایسی سپورٹس کار

کمال ہمارت حاصل کر لی تھی۔ تبیح کے منکوں کی طرح وہ تو چاول کا ایک ایک دانا چاپ سنک کی مدد سے بوا میں لہراتا اور وہ چاول کے دانے قطار در قطار خود بخود اس کے منہ میں پہنچ جاتے، گویا اسکے منہ میں مقناطیس لگا ہو۔ اور ہم تھے کہ چاول چاپ سنک اور انگلیوں کی کشمکش کا شکار تھے۔ جب منہ کھولتے تو چاول نہ پہنچتے اور جب کبھی ایک آؤدہ دانہ چاول کا اٹھتا تو جبزے تھکنے کی وجہ سے منہ بند ہو جاتا۔ چنانچہ چاپ سنک کو سیست کر ہم نے سو دینیر کے طور پر رکھ لیا اور پیسوں سے پلیٹ پر دھادا بول دیا۔ اب کیا مجال کہ چاول کا ایک دانہ بھی ہمارے ہاتھ سے نجٹھتا..... لمحے بھر میں پلیٹ خالی تھی اور پیٹ فل....

پیٹ بھر جائے تو بعیت میں فتور آتا یقینی ہے۔ چنانچہ میں نے باتوں باتوں میں جلاپاں کی رنگینیں راتوں کا تذکرہ کیا۔ سپیدی پاکستانی مہمانوں کی خصلت سے اچھی طرح واقف تھا کہ ہم لوگ صرف دکھاوے کے لئے شرافت کے لباوے اور ہڑتھے ہیں، اسلام کے سامئین بورڈ لٹکا کر مذہب کی ہٹی چکاتے ہیں اور موقع پاتے ہی خونخوار بھیزیے بن جاتے ہیں۔ کیونکہ یہی ہمارا اصلی روپ اور قوی مزاج ہے۔ اسی لئے سپیدی نے میری فتور پند بعیت کی تسلی کے لئے کہا۔ ”یار غم نہ کرو۔ آج رات تمہیں فل عیاشی کرواؤں گا۔۔۔ میں تمہاری بھالی کو بتا آیا ہوں کہ پاکستان سے میرا جگہی یار آیا ہے۔ اس لئے کل صبح ہی گھر لوٹوں گا۔“ جبلی بھالی نے پاکستانی جگہی یاروں کے بارے میں کیا سوچا ہو گا؟ لمحہ بھر کے لئے میں نے سوچا۔ مگر میرے قوی کدار نے فوراً ہی میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے تسلی دی۔ ”پاکستانیوں کے بارے میں وہ جو بھی سوچتی ہے سوچنے دو۔ تمہاری صحت پر بھلا کیا اثر پڑتا ہے۔۔۔ تم اپنا الو سیدھا کرو اور جلاپاں سے چلتے ہو۔“ گنزاکے شور کے باوجود ایک اور سوچ نے میرے ضمیر کے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ ”شرم کرو! تمہاری ذاتی خود غرضی تمہیں ملک کی عزت سے زیادہ عزیز ہے کیا؟“ میرے خوابیدہ ضمیر نے انگرائی لی اور کرد بدل کر سو گیا اور میرے قدم نصیحتوں کو رومند تے، گناہوں کی منزل کی طرف بڑھتے بڑھتے شہجوں کو سیشن

جیران و پریشان جلاپانیوں کا گھیرا توڑا اور گنزا کے رنگوں میں گم ہو گئے۔ سالوں، مہینوں کی جدائی کے فاصلے ہم نے گھنٹوں میں طے کئے تو ایک ریستوران کا رخ کیا۔ سیاحوں کی سوت کے لئے ریستوران والے شوونڈو میں ہر اس خوراک کا پلاسٹک ماڈل سجادیتے ہیں جو اس ریستوران میں ملتی ہے۔ وہ ماڈل اس ہر مندی سے بنائے جاتے ہیں کہ اصل نقل کا امتیاز ختم ہو جاتا ہے۔ اور کچھ عجب نہیں کہ اگر شوونڈو کے شیشے مضبوط نہ ہوں تو بھوک سے اندر ہے گاہک خوراک کے ماڈل کو ہی منہ مار دیں۔ ریستوران میں داخل ہونے کے بعد میز کی الٹ منٹ کا باقاعدہ انتظار کرنا پڑتا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ وہ لوگ جلاپانیوں کو غیر ملکی گاہوں کے مقابلے میں بہتر میز بھی دیتے ہیں اور بہتر سروس بھی۔ اسی طرح مصری بھی اپنے ہم وطنوں کو غیر ملکیوں پر ترجیح دیتے ہیں اور ہمیشہ اپنے ہم وطن کا ساتھ دیتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ قاہرہ میں میں نے ایک ریڑھی والے سے تربوز خریدا۔ گو مصری تربوز مصری کی طرح شیلے ہوتے ہیں مگر اتفاق سے وہ تربوز پھیکا تھا۔ میں تو تربوز پھکنے کے بعد اپنی رائے کا اظہار کر رہا تھا مگر ریڑھی والا بغیر چھے ہی بعد تھا کہ تربوز میٹھا ہے۔ مصريوں کو بھی پاکستانیوں کی طرح مجھے لگانے کا شوق ہے، چنانچہ چند ہی لمحوں میں ہمارے گرد را گھبروں کا ہجوم تھا۔ اور تعجب کی بات ہے کہ بغیر چھکھے ہر مصری بعد تھا کہ تربوز میٹھا ہے۔ چنانچہ ہم نے کھیانا سا ہو کر ان کی ہاں میں ہاں ملائی اور پہکے تربوز کو میٹھا مان کر لے گئے۔ سپیدی چونکہ جلاپانیوں کا داماد تھا اور انکی زبان بھی جانتا تھا چنانچہ بغیر طویل انتظار کے ہمیں میز بھی مل گیا اور پلاسٹک میں بند تولید اور پانی کا گلاس بھی۔ ٹوکیو کا موسم بھی کراچی کی طرح گرم اور تریخنی مربوط ہوتا ہے جسکے سبب چلنے پھرنے سے آدمی اور موا سا ہو جاتا ہے، اسی لئے گاہوں کو تازہ دم کرنے کے لئے ریستوران والے خوشبودار گیلا تو لیہ اور ٹھنڈے پانی کا گلاس تو فوراً ہی میا کرتے ہیں۔

چاپ سنک سے کھانا کھانا میرے لئے تو بڑا ہی صبر آزمایا کام تھا۔ البتہ سپیدی نے

تک جا پئے۔

ٹوکیو کا شجنوکو، زمین دوز ریلوے شیشن دنیا کا مصروف ترین ریلوے شیشن ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اسکے پلیٹ فارم ہر صبح دفتر کھلنے سے پہلے اور شام دفتر بند ہونے کے بعد چھتیں لاکھ مسافروں کی گزرگاہ ہوتے ہیں۔ دیے بھی ٹوکیو کے بارے میں مشہور ہے کہ چھٹی کے دنوں کے علاوہ اس شرکی آبادی دن کے وقت دنی ہو جاتی ہے، کیونکہ گرد نواح میں میلوں دور بینے والے لوگ ٹرینوں پر تین تین گھنٹوں کی مسافت طے کر کے ہر صبح ٹوکیو آتے ہیں اور کام ختم کر کے ہر شام اپنے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں۔ اسی لئے ٹرینیں ساری دنی مچھلی کے ڈبوں کی طرح ہر وقت کھچا کچھ بھری رہتی ہیں۔ اور ڈبے کی چھٹت سے لئے ٹینکروں کو تھامے لوگ اونچتے اونچتے سفر جاری رکھتے ہیں۔ کام بے تھکے جسم .... مردانہ اور زنانہ جسم .... بے حس اور بے حرکت جسم .... ایک دوسرے سے ٹکراتے جاتے ہیں اور یہ زندہ لاشیں صرف اسی وقت حرکت میں آتی ہیں جب ان کے مخصوص ریلوے شیشن آتے ہیں۔ اس صفتی ملک کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ یہاں انسان کل پرزوں کی طرح کام کرتے ہیں اور اس شدت سے کام کرتے ہیں کہ اب وہاں کاروشی کا مملک مرض پھیل گیا ہے جس سے تقریباً دس ہزار اموات ہر سال واقع ہوتی ہیں۔ اور ان اموات میں ون بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ کیونکہ یہ بیماری وہاں لا علاج ہو گئی ہے۔ کاروشی کا مرض کام کی شدت کے سبب پھیلتا ہے اور اس کے مریض سالانہ تین سے ساڑھے تین ہزار گھنٹے کام کرتے ہیں۔ جبکہ امریکہ میں کام کرنے کی سالانہ اوسط اٹھارہ سو گھنٹے اور یورپ میں پندرہ سو گھنٹے ہے۔ پاکستان میں کاروشی کے مملک مرض کا کوئی خطہ نہیں۔ گوہارے کارندے جپانیوں کے اس سالانہ ہدف سے کہیں زیادہ کام کرنا چاہتے ہیں، مگر ہمارے ہاں شادی بیاہ، موت جنازے، روزہ نماز، عید بکر عید، بڑے افروں کی خاطر مدارات اور بھلی، گیس کے بل چکانے میں اتنا وقت برہ ہو جاتا ہے کہ ڈیوبی پوری کرنے کے لئے سالانہ صرف چھ سات سو گھنٹے ہی بچتے ہیں۔ جن میں سے یونین کے

اہم کاموں کے لئے بھی وقت نالانا پڑتا ہے اور ہر ہر تائیں بھی کرنی ہوتی ہیں۔۔۔۔۔  
سینزو کو میں جسموں کا جمعہ بازار سا سمجھا تھا۔ مگر ٹوکیو بہر حال بنکاک نہیں۔ یہاں بہ کاروبار تو بنکاک والا ہی ہوتا ہے مگر شوچی یعنی موی کافنڈ کی دیوار کے پیچے، تاکہ گاہوں کے راز صیغہ راز میں رہیں۔ اونچے گیشا گھروں میں تو اس بات کا اس حد تک خیال رکھا جاتا ہے کہ کوئی گاہک نہ اسوقت تک گیشا گھر میں داخل ہو سکتا ہے اور نہ ہی گھر سے باہر نکل سکتا ہے جب تک گیشا گھر کی انتظامیہ یہ یقین نہ کر لے کہ دو مسمانوں کا آمنا سامنا نہیں ہو گا۔ اسی لئے تو ایسے گیشا گھروں میں ایک شام گزارنا پہنچو گاڑی کی قیمت سے کہیں زیادہ ہے۔ اور ایسی جگہوں میں داخلے کے لئے یہ بھی لازمی ہے کہ آپ کسی جاپانی کے مہمان ہوں اور جاپانی بھی ایسا کہ جو کسی بڑی سی کمپنی میں بڑے سے عمدے پر فائز ہو۔ کیونکہ یہ جگہیں عام تام جاپانی کی پنج سے باہر ہیں۔ جاپانی عام ہو یا خاص، ہوتا ہے عیاش ہے۔ وہاں مردوں کو سات خون مغاف ہیں۔ ہر جاپانی جس کی جیب گرم ہو اور سانس چلتی ہو وہ داشتہ رکھتا ہے۔ کیونکہ رکھیں رکھنا وہاں قابل غیر بات ہے۔ جاپانی میاں یہوی ڈبل بیڈ پر اکٹھے نہیں سوتے۔ شاید اس لئے کہ جب تک میاں شراب اور شاب خانوں سے واپس لوٹتے ہیں، یہویاں طویل انتظار کے کرب سے گزر کر نیند کی گولیوں سے ڈز کر کے غافل سو جاتی ہیں۔ بہر حال جاپانی مردوں کے مقابلے میں انکی یہویاں بست و فاشعار ہوتی ہیں۔

شوگن ناہی اس گیشا گھر میں پسیڈی کی بڑی عزت تھی اور عزت ہوتی بھی کیوں نا! کیونکہ اپنی عزت پچانے کی خاطر پسیڈی کو ہر لامہوری جگری یار کو یہاں لانا پڑتا تھا۔ پھر لامہوریوں کی تو یہ خصلت ہے کہ مطلب کے لئے جگری یار اور مطلب نکلتے ہی یار مار بی جاتے ہیں۔ اور ہر جاپانیوں کی یہ روایت ہے کہ اپنے پرانے گاہوں کی ہر حال میں بڑی عزت کرتے ہیں۔ چنانچہ پسیڈی جب وہاں کے کسی ملازم سے بات کرتا تو وہ ملازم پہلے ادب سے زمین پر بیٹھ جاتا اور پھر آنکھیں جھکائے جھکائے اس سوال کا جواب دیتا۔ اسی طرح جو دو گیشا لڑکیاں ہماری خدمت میں آئیں وہ بھی پسیڈی سے

پیڈی کو نظر انداز کرتے ہوئے درویش دوم نے کہا۔ ”یار ہم لوگ بڑی مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ وہ لوکی تو بالکل پاگل ہے .... اس نے دھمکی دیدی ہے کہ وہ درویش اول کو کسی قیمت پر بھی نوکو سے نہیں جانے دیگی....“ ”اوہ، تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے یار .... درویش اول کو اسی لڑکی کے پاس چھوڑ جاتے ہیں .... ہم اس صورت کا ماذل ڈیرہ غازی خان سے اور منگوالیں گے....“ میں نے لاپرواٹی سے کہا۔ مگر درویش دوم کسی قسم کے مزاح کے موڑ میں ہرگز نہ تھا۔ چنانچہ اس نے ڈائٹ ہوئے کہا۔ ”بیو تو قوف کسی وقت تو عقل بھی استعمال کر لیا کرو .... اصل مسئلہ اس کو چھوڑنے کا نہیں ہے۔ اس ایئریٹ نے جذباتی ہو کر مس کا تو سے وعدہ کر لیا ہے کہ وہ دونوں مل کر ہارا کیری یعنی خود کشی کریں گے .... اور انہوں نے یہ فیصلہ بھی کر لیا ہے کہ جس بلٹ ٹرین پر ہم لوگ اوسا کا کے لئے سفر کرنے والے ہیں وہ دونوں اسی ٹرین کے نیچے آ کر ہارا کیری کریں گے۔“ میں نے تو اللہ کا شکر ادا کیا کہ مس کا تو کو درویش اول سے عشق ہوا، کہیں میری کوشش کامیاب ہو جاتی تو ان دونوں درویشوں نے خود ہی مجھے ٹرین کے نیچے دھکیل دینا تھا۔

پیڈی نے درویش دوم کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”فکر کی بات نہیں یار۔ اس طرح کے ڈرامے تو یہاں روز ہوتے ہیں۔ ابھی مسئلہ حل کر دیتا ہوں۔“ گو پیڈی خود ہارا کیری کے ہاتھوں نجکت کھا کر جاپانی لڑکی سے شادی کر بیٹھا تھا، مگر اب وہ اتنا ہوشیار ہو گیا تھا کہ ایسے کئی ملے ایک ہی جھنکے میں حل کر سکتا تھا۔ چنانچہ کچھ ایسا ہی ہوا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی پیڈی نے جاپانی زبان کا جاپانی زن پر حملہ کیا اور ہوٹل کے کمرے کو پانی پت کے رن میں بدل دیا۔ وہ غم میں ڈوبی افسرہ لوکی جنگلی ملی کی طرح پیڈی پر ہوا تی دار کرنے لگی۔ درویش اول کاٹھ کا الوبنا کبھی پیڈی کو دیکھتا اور کبھی مس کا تو کو۔ اسکی آنکھوں سے بہتی آثاریں جو یقیناً ہارا کیری کے خوف سے جاری تھیں، بند ہو گئیں اور اس نے ہمارے ساتھ جانے کے لئے سامان سمینا شروع کیا۔ پیڈی اور مس کا تو کی دھواں دھار جنگ سر دپتی گئی اور جب تک ہم تینوں

ایسے میں جیسے گزھی شاہو سے مائیگریٹ کر کے آئی ہوں۔ انکا لباس اور میک اپ تو پکا پکا گیشا والا تھا البتہ نہ جلد جاپانی تھی اور نہ شکلیں۔ ویسے نہ تو ان دونوں کی جلد میں کوئی خرابی تھی اور نہ ہی شکلوں میں۔ بلکہ ہلدی رنگت جاپانی جلد اور ترچھی لکیروں سی آنکھوں والی جاپانی بیسوں سے تو یہ بیساں کہیں زیادہ خوبصورت تھیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ یہ دونوں جاپانی لڑکوں کے بر عکس بھرپور جسم بھی رکھتی تھیں۔ پیڈی نے انکشاف کیا کہ وہ دونوں لڑکیاں فلاپا میں کی رہنے والی تھیں۔ بلکہ اکثر گیشا گھروں میں نب غیر ملکی لڑکیاں ہی کام کرتی ہیں۔ کیونکہ جاپانی قوم بھی ہماری طرح دہرے شینڈرڈ کی قائل ہے۔ وہاں کے مرد خود تو غیر ملکی لڑکوں کو جاپانی لڑکوں پر ترجیح دیتے ہیں لیکن یہ نہیں براحت کرتے کہ جاپانی لڑکیاں غیر ملکی مردوں سے ملیں جلیں۔ چنانچہ اصل جاپانی گیشا صرف ان مخصوص جگہوں پر کام کرتی ہیں جہاں تک صرف جاپانیوں کی رہائی ہے۔ گیشا تو گیشا جاپانی مرد تو یہ بھی بڑی مشکل سے براحت کرتے ہیں کہ کوئی غیر ملکی مرد جاپانی لڑکی سے شادی کر لے۔ اور ایسی شادیوں میں اکثر پنجابی فلموں کے سین دہرائے جاتے ہیں۔ ”اوے! ایسے شادی نہیں ہو سکدی....“

”مکر کی بانگ دیلے، پیڈی کے ہمراہ واپس ہوٹل پہنچا تو دیکھا کہ میرے بستر پر درویش دوم کی شانپنگ کا سامان سجا ہوا تھا اور وہ خود اپنے بستر سے اور کمرے سے غائب تھا۔ میں نے پریشان ہو کر درویش اول کے کمرے میں فون کیا تو وہاں سے درویش دوم نے جواب دیا۔ جواب کیا دیا فوراً وہاں پہنچنے کا حکم دیا۔ چنانچہ میں نے پیڈی کو ساتھ لیا اور فل پیڈی سے درویش اول کے کمرے میں پہنچ تو وہاں نقشہ ہی کچھ اور تھا۔ درویش اول دیوار سے نیک لگائے بیٹھا تھا اور اسکے پہلو میں مس کا تو زلفیں پھیلائے منہ لکائے بیٹھی تھی اور ان دونوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی آثاریں رواں تھیں۔ درویش دوم کے پاٹ چہرے پر خوف و پریشانی کی حکمرانی تھی۔ میں نے اپنی بیٹن نما آنکھوں سے سوالیہ اشارہ کیا تو وہ مجھے کمرے سے باہر لے گیا۔

کی عمر کا صحیح اندازہ لگانا بڑا ہی مشکل کام ہے۔ کیونکہ بڑھاپے کی دو چیزوں تو جاپانیوں کو درٹے میں ملتی ہیں۔ پہلی عینک، جو پچھے پیدا ہوتے ہی اسکے کان میں اذان سننے کی بجائے اسکی آنکھوں پر چڑھا دی جاتی ہے اور دوسرا جھلکی جھلکی کمر، جو دن بھر نہیں رکوئے کی حالت میں رہنے کے سبب کمان بن جاتی ہے۔ یوں جب پچھے، بوڑھے اور جوان عینک لگائے کمر جھکائے پھر رہے ہوں تو صحیح عمر کا اندازہ بھلا کیوں نکر ہو سکتا ہے۔ یہ چھتریاں اور عینکیں تو ہر جاپانی کا انوٹ انگ سا بن کر رہ گئی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر کوئی جاپانی شاعر یہ شعر کرتا

چند تصویری بتاں چند حسینوں کے خطوط  
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ سماں لکھا

تو یوں کتنا:

چند نوٹیں چھتریاں اور چند عینک کے فریم  
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ سماں لکھا

اس ڈبے میں بڑی بی، سردار جی اور تین درویشوں کے علاوہ تین چالیس جاپانی طلبہ کا ایک گروپ بھی سفر کر رہا تھا۔ جن کی فٹی شرٹوں پر فوجی سان یعنی ”کوہ فوجی“ کی تصویر اس بات کی علامت تھی کہ وہ سب اس مقدس پہاڑ کی یا ترا پر روانہ تھے۔ ان طلبہ سے مجھے تو سخت مایوسی ہوئی۔ بھی انہوں نے نہ ہمارے طلبہ کی طرح بڑا بازی کی، نہ شور شرایب کیا اور نہ ہی دھینگا مشتی کی۔ بس فوجی سان کے بارے میں کتابیں پڑھے جا رہے تھے اور خاموش تھے۔ کہاں ہمارے جوان مرد اور زندہ دل طلبہ، کسی ڈبے میں اگر مٹھی بھر آ جائیں تو تسلکہ سامچ جاتا ہے۔ اور اگر خوش قسمتی سے وہ طلباء سندھ کی یونیورسٹی کے ہوں تو ڈبہ تو کیا پوری ٹرین میں اسکی آمد کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل جاتی ہے۔ کیونکہ اسکی زندہ دلی اور جوانمردی کا شکار پچھے بھی ہوتے ہیں، بوڑھے بھی، ریلوے حکام بھی اور خواپچے فروش بھی۔ بغیر لکٹ سفر کرنا تو خیر انکا پیدا نہیں ہے۔ گمر دوسرے مسافروں کی ریزو رو سیٹوں پر قبضہ جانا، ڈائینگ کار سے مفت کھانا

تھیکی میں بیٹھ کر ریلوے شیشن کی طرف روانہ ہوئے تو جدائی کے غم میں ہارا کیری کرنے والی بی بی کا ایک ہاتھ پسندی کے ہاتھ میں تھا اور دوسرا ہاتھ ہلا ہلا کر ہمیں الوداع کہ رہی تھی۔

مشکانیں بلٹ ٹرین دو سو کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے راہ آہن پر گولی کی طرح اوسا کا کی جانب دوڑتی چلی جا رہی تھی۔ درویش اول قد آدم کھڑکی کے سامنے آرام دہ سیٹ پر بھی بے چین سالگ رہا تھا۔ اس جاپانی جنی نے اسکے ایسے پچھے چڑائے تھے کہ اسکی سب رنگیں مزاہی خاک میں ملا دی۔ شاید اسی لئے وہ کپارٹمنٹ میں بھی بی بی رنگینیوں کی نسبت کھڑکی کے باہر آلوگی میں بے شر نوکیوں کو تسلکا جا رہا تھا۔ جملکی اڑدہا نما عمارتیں بڑی تیری سے پیچھے ہی پیچھے چلی جا رہی تھیں۔ درویش دوم ایک سردار جی کے پہلو میں فٹ تھا۔ یہ سردار جی بھی بڑے جفاش ہوتے ہیں۔ دنیا کے ہر کونے میں ملتے ہیں اور ہر حال میں ملتے ہیں۔ اس سفر میں سردار جی اور درویش دوم کا ملاپ بھی بہت خوب تھا۔ کیونکہ دونوں ہی بالوں کے بادشاہ تھے۔ گویا اس سیٹ پر بالوں کا ایک جنگل سا اگا ہوا تھا۔ ادھر بیچارے جاپانی مرد ٹھہرے بے بال و پر۔ ان کے لئے یہ دونوں بہت بڑا عجوبہ تھے اور مجھے یقین ہے کہ اگر ان کی نمائش کا خاطر خواہ بندوست کر لیا جائے تو ہم سب مال سے ملا مال ہو جائیں۔ میرے سامنے والی سیٹ پر کیونوں میں لمبسوں ایک معمر خاتون تھی۔ جملکی دراز نما آنکھیں پہپر وہ سیٹ جیسے دیزی شیشوں کے پیچھے مسلسل جیرانی کا منظر تھیں۔ ان آنکھوں میں جیرانی، جیران کن ہرگز نہ تھی۔ کیونکہ ان آنکھوں نے ۱۹۲۳ء کا زلزلہ اور اس زلزلے کے سبب آگ میں ترقیتی جوانیاں اور راکھ میں ڈھکا نوکیوں دیکھا ہو گا۔ ۱۹۴۶ء میں شہنشاہ ہیرودیٹھو کو بھگوان سے انسان بننے دیکھا ہو گا۔ ۱۹۴۵ء میں ہیرودیٹھا اور ناگا ساکی پر ایتم بم کی تباہی کا منظر دیکھا ہو گا۔ وحشی امریکنزوں کو ۱۹۵۲ء تک جاپان کی نازک تندیب کو کچلتے دیکھا ہو گا اور اب جاپان کی بلٹ ٹرین میں جاپانی معاشرت کا چھٹا سورن دیکھ رہی ہوگی۔ میں نے ان دور اندیش نگاہوں کی طرف دیکھا اور احترام سے اپنی نگاہیں جھکالیں۔ ویسے ان جاپانیوں

پارلیمنٹ، چین کی دیوار، تھائی لینڈ کے گوڑے، اور ہمارا بے ڈھب سامنہ پاکستان جو ہماری قومی بد نوقی کا مظہر ہے۔ جیسا کہ ہماری اکثر سرکاری اور نو دو تیوں کی نجی عمارتیں ہوتی ہیں۔ جنکا، اپنے بانے والوں کی طرح نہ ماضی سے رشتہ ہوتا ہے نہ حال کی ضرورت پوری کرتی ہیں اور نہ ہی مستقبل کے تقاضوں پر پوری اترتی ہیں۔ ان سب قوموں اور ملکوں کے بر عکس جاپان نے قومی نشان کے طور پر کوہ فوچی کا اختیاب کیا جو کہ قدرت کا ایک خوبصورت شاہکار ہے۔ ویسے دنیا کے تمام کوہ کنوں کا مقابلہ فیصلہ ہے کہ دنیا کا خوبصورت پہاڑ اور حسین تین چوٹی، راکا پوشی ہے جو پاکستان میں شاہراہ ریشم پر واقع ہے۔ گویہ پہاڑ بقلم خود تو وادی گر میں ہے مگر اس کے نظاروں پر وادی ہنڑہ کا قبضہ ہے۔ راکا پوشی کو پہاڑوں کا تاج محل بھی کہا جاتا ہے اور تابوں کا گوہر بھی۔ کوہ فوچی کی طرح اس چوٹی کی خوبی یہ ہے کہ اسے چاہے ہنڑہ کی رانی عیتیقہ کے محل کی سکھی کھٹکی سے دیکھا جائے یا وادی ہنڑہ کے کسی گذریے کے بند کوہاڑوں کی دراڑوں سے، اپنے حسن کی رعنائی میں کنجوی نہیں کرتی۔ چاندنی رات میں پکھلی چاندی کا ایک دریا ہے جو ۸۸۷۷ میٹر کی بلندی سے بتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور دریائے ہنڑہ میں غرق ہو جاتا ہے۔

جاپان کا کوہ فوچی اور پاکستان کا فوچی دنیا کی نظر میں تو ایک ہیں۔ دونوں ہی عج کی طرح ہیشہ سے قائم و دائم ہیں اور رہیں گے۔ جاپانی چاہے چاند پر چلے جائیں، اور وہ یقیناً چلے جائیں گے۔ اور پاکستان بھلے زمین دوز ہو جائیں (اور اپنی حرکتوں کے سبب یقیناً ہو جائیں گے)۔ مگر وہ کوہ فوچی سے چیچھا چھڑا سکتے ہیں اور نہ یہ فوچی سے جان پھا سکتے ہیں۔ فوچی اور فوچی دونوں ہی اپنی اپنی جگہ ان قوموں کی قسمت پر قدرت کا اٹلیں فیصلہ بن کر چھائے ہوئے ہیں۔ حریت کی بات یہ ہے کہ ابھی تک پاکستانیوں نے فوچی کو اپنا قومی نشان بھلا کیوں نہیں بنایا؟

ایک جاپانی کماؤت ہے کہ کوہ فوچی کی چوٹی پر ایک مرتبہ بھی نہ جانے والا احمد ہے اور دو مرتبہ جانے والا احمد ترین۔ ہمارے ڈبے میں سفر کرنے والے طلبہ کی

کھانا اوز جوان نوکیوں سے دل گلی کرنا بھی انہوں نے اب اپنے حقوق میں شامل کر لیا ہے۔ اسکے ان پسندیدہ مشاغل کی زد میں ہر وہ مسافر ہوتا ہے جو سندھ سے گزر کر کراچی جاتا ہے۔ مگر اس نیک کام میں پنجاب کے طلبہ بھی کسی سے کم نہیں۔ لاہور کی یونیورسٹیاں اور کالج جو ایک زمانے میں اچھی تعلیم کے علاوہ اعلیٰ تربیت دیتے، مبایسے، ڈرائے، سپورٹس اور میوزک کانٹرٹ کرانے کے لئے مشہور تھے اب علم و ادب کے وہ گوارے کمانڈوز کیپ سے بن کر رہ گئے ہیں۔ ہوش، جماں معصوم شرارتوں سے تقدیمے اپنے تھے اب ایکونیشن ڈپ بن گئے ہیں۔ جماں طلبہ کتابیں اور نوٹس بدلتے کی بجائے کلاشن کوف اور ہینڈ گرینڈ بدلتے ہیں۔ ان طلبہ کی جب ایک بس بھی لاہور شرکر کا رخ کرتی ہے تو مال روڈ پر ٹریفک بھی بند ہو جاتا ہے اور لوگوں کا کاروبار بھی۔ جب یہ ہونماں طلبہ اپنی کارروائی کے بعد اپنی اپنی کمینگا ہوں یعنی ہو شلوٹوں کو لوٹتے ہیں تو شرمنی ہر سو جلتے ٹائیوں کی بدلہ اور دھوکا پھیلا ہوا ہوتا ہے۔

یوکوہاما نوکیوں کی بندرگاہ بھی ہے اور جاپان کا دوسرا بڑا شرکر بھی۔ مگر ہماری بلٹ ٹرین اتنے بڑے شر سے تیر کی طرح پار ہو گئی اور ہمیں خبر تک نہ ہوئی۔ ویسے خبر ہو بھی جاتی تو ہم یوکوہاما کا بھلا کیا بگاڑ لیتے۔ دنیا کے سبھی صنعتی شرکتیاں ایک سے ہی ہوتے ہیں۔ بس اونچی اونچی سرد عمارتیں۔ کسی ایک کو دیکھ لیا جائے تو بس کافی ہے۔ البتہ اونچے سرد کوہ فوچی کو ایک نظر میں ضرور دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر جس رفتار سے ہماری گاڑی چلتی چلی جا رہی تھی مجھے خدا شما کہ کہیں ہم آنکھ جھپکیں اور پہاڑ او جمل نہ ہو جائے۔ لیکن کوہ فوچی یوں او جمل ہونے والی چیز نہیں۔ کیونکہ اسکی ۲۳۸۸ فٹ اونچی ملکوں نما چوٹی دور دور سے دکھائی دیتی ہے اور پھر بلٹ ٹرین بھی تو اس مقدس پہاڑ کے قدموں کو چھو کر گزرتی ہے۔

دنیا کی اکثر قوموں نے اپنے قومی نشان اور نشانیاں خود تعمیر کی ہیں۔ جو ان ملکوں کی پہچان بن گئی ہیں۔ مثلاً ”آسٹریلیا کا اوپیرا“، ہندوستان کا تاج محل، مصر کے احرام، فرانس کا ایفل ٹاور، امریکہ کا سُبیجو آف لبری، اٹلی کا کولو سیم، برطانیہ کا ہاؤس آف

شایی محل ، عجائب مگر اور جاپانی باغات کی ایک کثیر تعداد ہے۔ اور یہ جاپان کا واحد شہر ہے جسکی حفاظت کے لئے دوسری جنگ عظیم میں امریکی و انشوروں نے امریکی فناشی سے درخواست کی تھی کہ اس شہر پر بم نہ برسائیں۔ مگر ہماری بدنویتی کا یہ عالم تھا کہ ہم لوگوں نے اس شہر کے پلیٹ فارم پر قدم تک نہ رکھا۔ بس منہ پھلانے بیٹھے کھڑکی میں سے باہر جھانکتے رہے اور ٹرین کے چلنے کا انتظار کرتے رہے۔ ٹرین پلی تو پلک جھکتے ہی شن اوشا کا یعنی اوسا کا جدید ریلوے شیشن جا پہنچی اور اوسا کا چنچتے پر پتہ چلا کہ اب ہم تین کی جگہ چار درویش بن گئے تھے۔ کیونکہ درویش دوم نے سردار جی کو بھی اپنے ساتھ نصیح کر لیا تھا۔ کمپیوٹر دامغ درویش دوم کی ہر حرکت میں برکت ہوتی تھی۔ چنانچہ جو نی ہم تینوں اپنی افسردارہ لاشوں کو گھینٹتے ہوئے ریلوے شیشن کے باہر لگئے تو درویش دوم کی اس باہر کت حرکت کا اندازہ ہو گیا۔ دراصل سردار جی، درویش اول جیسا جعلی بڑنس میں نہیں بلکہ بچ بچ کا بڑنس میں تھا جو ہندوستان سے کھلیوں کا سامان جاپان کو ایکسپورٹ کرتا تھا۔ اور مگر ریلوے شیشن پر جاپانی کمپنی کا نایابہ اسکے انتظار میں تھا۔ چنانچہ جاپانی میزان مسٹر ماری مورا نے سردار جی کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی ہاتھوں ہاتھ لیا۔ سامان اپنی مکبوتوں میں فٹ کیا اور ہوٹل کی جانب چل دیا۔ دوران سفر خدا جانے ان بالوں کے بادشاہوں کے درمیان کیا معاہدہ ہوا کہ ہوٹل چنچتے ہی ہم لوگوں کو دو کمرے مل گئے۔ ایک میں درویش دوم اور سردار جی، ثالثہ گئے اور دوسرے میں درویش اول اور میں ایک اوسا کا کے ارد گرد ہرے بھرے چھوٹے چھوٹے پہاڑے پہاڑے ہوتے تھے۔ شر کے سینے کو تیر کی سیدھی میں چیڑتے ہوئے۔ ایک پریس وے اور کروٹش بدلتا دریائے یو دو۔ اس صنعتی شر کا عاصروں کے تھیں ہزار کے لگ بھگ نیکڑیاں ہیں جن کی چمنیاں دن رات وھوں اکلتی رہتی ہیں۔ پھر شر بھی کیا، بس سینیل، کامکریت اور کاچھ کے بنے، آسمان کو چھوٹے سردمقبروں کا ایک وسیع گورستان ہی تو ہے جس میں گرے سوٹوں کے کفن پہنے، برفیں کیس اٹھائے ایک تخلوق آباد ہے۔ جس کو خدا جنگ کے گناہوں کی سزا ملی ہے کہ وہ دن رات

طرح دوسرے لاکھوں جفاش کوہ کن یعنی کوہ پیبا جو ہر سال فوجی کی چوپی کو سر کرنے آتے ہیں خدا خبرہ احتق کملانے سے بچنے کے لئے آتے ہیں یا احتق تین کملانے کے لئے۔ مگر یہ اس آتش فشاں پہاڑ کا طضم ہے جو کوہ پیاؤں کو دیوانہ دار اپنی طرف کھینچ لاتا ہے۔ اسکا آتشیں لاوا بس آخری مرتبہ ۷۰۰ میاء میں پھوٹا تھا۔ اسکے بعد ہلکی پھلکی گیدڑ بھیکی کے علاوہ یہ پہاڑ بھی آپے سے باہر نہیں ہوا اور اس نے اپنے آتشیں جذبات کو اپنے جسم پر جمی بر ف کی تھوں تلے صدیوں سے دبار کھا ہے۔ شاید اس پہاڑ کی یہی شرافت ہے جسکے سبب مشتملہب کے لوگ اس پہاڑ پر عبادت گزاری کے لئے آتے ہیں۔ بدھ مت کے لوگ یہاں اپنے جسم کو پاکیزہ کرنے کے لئے آتے ہیں اور عام کوہ کن اسکے ارد گرد پھیلی ہوئی پانچ جھیلوں، آثاروں، گھنے جنگلوں، آلوگی سے پاک فضا اور چھتے سورج کے نظارے کرنے کے لئے آتے ہیں۔ اللہ جانے کوہ فوجی کی چوپی سے چھتے سورج کے نظارے کیسے ہوئے؟ ہم نے تو بھی اپنی خواب گاہ سے بھی چھتتا سورج نہیں دیکھا۔ البتہ ذوبتے سورج ہم نے سیکھوں دیکھے ہیں۔ اپنے ملک میں تو صبح شام ذوبتے ہیں۔

کوہ فوجی آیا۔ اس نے اپنے حسن کا فریب دیا اور گزر گیا۔ ویسے بڑی ہی عجیب بات ہے کہ کوہ فوجی تو اپنے حسن کا فریب دے کر گزر جاتا ہے، مگر ہمارا فوجی تو امید کا فریب دیکھ نہیں گزرتا، بلکہ ملک جاتا ہے۔

ہم سفروں اور دوستوں میں زندہ دلی نہ رہے تو سیاحت تمکاوٹوں و را اسیوں کی گھائیوں میں اتر جاتی ہے۔ ہم تینوں بھی شاید اسی قسم کے مرض کا شکار ہو گئے تھے۔ ہمارا میر کاروائی درویش اول قد آدم کھڑکی کے شیشے سے "سریش" تھا اور خاموش تھا۔ درویش دوم گو سردار جی سے کسی بحث مباری میں سمجھم گتھا تھا امراس کی نہ کپ شپ میں جان تھی اور نہ قمقموں میں قوت۔ ان دونوں کی خاموشی اور اداسی نے میرافیوز اڑا دیا تھا اور مجھے کفیوز بھی کر دیا تھا۔ اسی خاموشی اور اداسی میں شر آتے رہے شر جاتے رہے اور آخر کوئی پونے تین گھنٹے کی مسافت کے بعد جاپان کے قدمی دار الحکومت کو یوٹو پہنچے۔ کویوٹو کو جاپان کی قدمی تمنذیب و تدبی کا ایک زندہ و تابندہ عجائب گھر کیا جا سکتا ہے۔ اس شر میں پندرہ سو بندھ مندر و دو سو مشتملہ مندر،

دولت کی جستجو میں دگر گوں رہتی ہے اور بے چین ہے۔ اوس درویشوں کو ایسے شر میں بھلا کیا سکون ملنا تھا۔ مگر جاپان میں آخری اوس شام تو بہر حال گزارنی ہی تھی۔ شام ڈھلی تو ہمارے دروازے پر وستک ہوئی۔ درویش اول ابھی تک اپنے بستر پر نہ حال تھا۔ میں نے دروازہ کھولا تو درویش دوم اور درویش چارم یعنی سردار جی بھرپور تیاری میں تھے جو ہمیں بھی اپنے ہمراہ لے جانے کو آئے تھے۔ مگر درویش اول نے جانے سے انکار کر دیا، اور میں نے بھی اوسا کا کی شام اسکے نام کر دی۔ چنانچہ وہ بستر پر اوندھے منہ لیٹا رہا اور میں کر کے کی کھڑکی سے باہر کے نظارے کرتا رہا اور اسے کوستا رہا۔ سردار جی کے بنس پارٹر کی گاڑی نے ہمیں اوسا کا کے ہوائی اڈے پر پہنچایا اور ہم ٹرالیوں پر اپنا سامان گھینٹتے ہوئے سیدھے جاپان ائیر لائنز کے کاؤنٹر پر جا پہنچے تو احساس ہوا جیسے میلا جانے والا وہ جہاز مسافروں کے لئے نہ ہو بلکہ کارگو، یعنی سامان کے لئے ہو۔ وہاں ہر طرف خاکی گتوں کے ڈبوں کے انبار تھے۔ جن میں ٹیلیویژن، وی سی آر، کیسٹ پلیسٹر اور دوسرا بجلی کا گھر بیو سامان بھرا رکھا تھا اور مسافروں کی ایک ٹیڑھی میڑھی قطار تھی جو حد نظر تک پہلی ہوئی تھی۔ یہ قطار فلمینگ نرسوں، خادماؤں، طوانوں اور دلالوں کی تھی جو روزی کی تلاش میں اپنے وطن سے جاپان آتے ہیں۔ دن رات جسمانی اور جنسی مشقت کرتے ہیں اور جو کچھ کماتے ہیں اسے کافر کے نوٹو کے بجائے بجلی کے سامان میں بدل کر وطن لے جاتے ہیں تاکہ وہاں پہنچ کر اس سامان کو دو گنے داموں بچ سکیں اور اس طرح اپنی مشقت سے کمائل ہوئی دولت کو دو گنے سے چوگنا کر سکیں۔ شاید اسی لئے ان لوگوں کے لئے ائیر لائین والوں نے ایک مخصوص کاؤنٹر کھول رکھا تھا تاکہ فاضل سامان کا ان سے مزید کرایہ وصول کر سکیں۔ دو گھنٹے کے انتشار کے بعد جہاز ہوا میں بلند ہوا۔ ہم نے جاپانی میں "سايو نارا" یعنی الوداع کما اور فلپائن کا نقشہ پھیلا لیا۔

## فلپائن



خیلا کے ہوائی اڈے پر اترے تو درویش دوم کا چہرہ اتر گیا مگر میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ کیونکہ درویش دوم کا بھاری اور بھدا سوت کیس گم ہو گیا تھا۔ جس سے میری جان کا بوجھ بھی ہلکا ہو گیا اور دل کا بھی ۔۔۔ لیکن اس خوشی کا اظہار میں کھلے بندوں ہرگز نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ درویش دوم کی سفر بھر کی شاپنگ اس گم شدہ بیگ میں موجود تھی علاوہ ازیں شاپنگ میں اس کی جان تھی۔ چنانچہ ایک جانب شاپنگ کے اس صدرے سے بے جان درویش دوم اور دوسری جانب عشق سے گھائیں درویش اول، دو سو گوار درویشوں کے پیچوں پیچ میں بھلا غاک مرت کا مظاہرہ کر سکتا۔ مگر خیلا شرہی ایسا ہے کہ یہاں ہر غم کا مدوا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ درویش اول کے زخموں کو بھرنے کے لئے خیلا کی ”ٹیاریں“ بڑی ہی کار آمد ثابت ہوئیں اور پہنچی لمحوں میں اس کی چال بھی بدل گئی اور چلن بھی ۔۔۔ رہا درویش دوم تو اس کے غم کا فوری مدوا کرنے کے لئے جاپان ائیر لائنز کے عملے نے اسے کیش ڈال رکھا رہیے ۔۔۔ اور یہ وعدہ بھی کر لیا کہ اس کا گم شدہ بیگ بھی فوری تلاش کر کے اس کی جائے رہائش تک پہنچا دیا جائے گا۔۔۔ دراصل ”آیا ٹا“ یعنی ائیر نیشنل ائیر ٹرانسپورٹ ایرو سیشن کے قوانین کے مطابق اگر دوران سفر کسی مسافر کا سامان گم ہو جائے تو سامان گم کرنے والی ہوائی کمپنی پر لازم ہوتا ہے کہ مذکورہ مسافر کی سولت کے لئے اسے بنیادی اشیا یعنی ”شیو“ وغیرہ کا سامان خریدنے کے لئے پچاس ساٹھ ڈال کے لگ بھگ کیش دے

دلخیب تر غیبوں سے اپنے ہوٹل میں قیام پر آمادہ کر رہی تھی۔ درجنوں سیلز گرلز اور تین درویش۔ ان کی بے رحم جوانیاں اور ہمارے رحم دل۔ ان کا دل توڑنا بھلا کیسے برداشت کر سکتے تھے۔۔۔ بارہا بھی چاہا کہ اپنے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ان کے حوالے کر دیئے جائیں تاکہ ان میں سے کوئی بھی یا یوس نہ لوٹے۔ مگر میرے اس فیصلے پر عمل کرنے سے پہلے ہی درویش اول نے اپنا فیصلہ سا دیا اور ایک حسینہ کی شیطانی اداؤں کا شکار ہو کر خیالا مڈ ٹاؤن ہوٹل میں ٹھہرنا کا اعلان کر دیا۔ مجھے یقین تھا کہ اس فیصلے سے یا یوس ہو کر دوسری ناریاں یا تو جذبہ انتقام سے تاگ بن جائیں گی اور یا غم سے گھماں ہو جائیں گی..... مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ وہ جوں کی توں ہشاش بشاش دوسرے گاہوں کے ارد گرد تیلوں کی طرح پھر پھر لگانے لگیں۔ اوہر دنوں درویش اپنے ہیئتگردانے کندھے اس شعلہ بدن سے ٹکراتے ٹکراتے خیالا مڈ ٹاؤن ہوٹل کی "کوچ" کی طرف چل دئے اور میں نے سامان گھینٹتے گھینٹتے ان کے پیچھے پیچھے کوچ کی۔ ہمیں "کوچ" میں دھکیل کروہ نالم ادا کندھے منکاتی ایر پورٹ کی جانب لوٹ گئی۔ کیونکہ ابھی ہوٹل کے لئے ٹاپک بھی اور گھیرنے تھے اور شام میں ملاقات کے جھوٹے دلائے بھی اور دینے تھے۔ اس "کوچ" میں ہمارے علاوہ اس نو سرباز حسینہ کے ڈسے ہوئے چند اور بھی ڈشکرے بیٹھے تھے اور اس یقین نے بیٹھے تھے کہ جو نی شام ڈھلنے گی وہ سیلز گرل ان کے پہلو میں ہوگی۔ حالانکہ اگر غور کیا جائے تو کسی خوش نغمی کی گنجائش ہرگز نہیں رہتی۔ کیونکہ دن بھر درجنوں جہاز آتے ہیں اور سینکڑوں مسافروں کو وہ خیالا مڈ ٹاؤن رہتی۔ ہوٹل میں "بک" کر کے بھیجتی ہے۔ وہ اگر چاہے بھی تو آخر کس کس کے پہلو کو گرا سکتی ہے اور پھر خیالا میں ..... جہاں پیسہ ہو تو آپ کے پہلو "بک" جائیں یعنی ختم ہو جائیں گے مگر پہلو میں آنے والے اور سانے والے کبھی ختم نہ ہونگے۔

خیالا کے موسم میں گاڑی "ایر کنڈیشنڈ" نہ ہو تو بندہ بھیگا چوہا سابن کے رہ جاتا ہے۔ بھلے ہی اس کا اصلی سائیز بھالو یعنی درویش دوم ساہی کیوں نہ ہو۔ مگر خیالا مڈ ٹاؤن ہوٹل کی یہ "کوچ" باقاعدہ "ایر کنڈیشنڈ" تھی اور ستری بیتی والاؤڑا ایور باقاعدہ باور دی تھا۔ اور فرانگریزی بولتا تھا۔ انگریزی بھی ایسی لمحے دار کہ ہمارے انگریزی مختلف ہوٹلوں کی نمائندہ بیسیاں۔ ہر اک اپنے اپنے ہوٹل کے گن گارہی تھی اور

دیا جائے اور بعد میں سامان ملنے کی صورت میں گم شدہ سامان مسافر کی جائے رہا۔ شکار صرف تیسرا کے مسافر ہی ہوتے ہیں۔ کیونکہ نہ تو وہ اپنا حق مانگنا جانتے ہیں اور نہ ہی اس حق کو حاصل کرنے کے لئے قربانی دینا چاہتے ہیں۔ جو نہی درویش دوم کی جیب میں کیش آیا اور درویش اول کی نظر میں عیش آیا تو وہ دونوں "نارمل" ہو گئے اور مجھ پر برس پڑے کہ میں نے "اوسا کا" میں سامان دیتے وقت ضرور کچھ نہ کچھ گھپلا کیا ہوگا۔۔۔ وہ مجھ پر کیا برسے کہ ہم سب پر بادل برس پڑے۔۔۔ خیالا میں بادل بھلی اور برسات اکثر اوقات آنکھ پھولی کھیلتے دھکائی دیتے ہیں۔۔۔ کبھی کبھی تو ان کا یہ کھیل اس قدر شدید ہو جاتا ہے کہ سمندر بھی ان کے ساتھ شامل ہو کر طوفان بپا کر دیتے ہیں۔ اور ہر سو تباہی چاہی دیتے ہیں، ان جوار بھائوں کی زد میں خیالا کی سرپلٹک جدید عمارتیں بھی ہوتی ہیں اور ٹین کی چھتوں والے جھونپڑے بھی۔۔۔ تابہ بدن پستہ قد حسیناً میں بھی ہوتی ہیں اور دراز قامت ناریل کے پیڑ بھی۔۔۔ یہ ناریل کے پیڑ فلپائنیز کی سات ہزار ایک سو جزیروں کی اس سرزمین کے ایک چوڑھائی حصے پر قابض ہیں اور یہاں کے لوگوں کی معیشت میں وہی افضل مقام رکھتے ہیں جو تیل دریافت ہونے سے پہلے صحرائے عرب میں سکھور کے پیڑ کا مقام تھا۔ ایک زمانے میں تو یہاں جب کسی کے گھر میں پچہ پیدا ہوتا تو گھر والے ایک ناریل کا پیڑ لگا دیتے۔ جس کی آمدی سے اس پچہ کی پرورش بھی ہو جاتی اور تعلیم و تربیت کا خرچ بھی نکل آتا۔ گواب ناریل کو ان کی معیشت میں وہ اہمیت تو نہیں۔۔۔ مگر پھر بھی ناریل کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ کیونکہ فلپائنیز میں حد نگاہ تک چار سو صرف ناریل ہی ناریل دھکائی دیتے ہیں۔ اور ناریاں ہی ناریاں نظر آتی ہیں۔ جنہوں نے اپنی معیشت سنوارنے کے لئے ناریل کے پیڑ کی جگہ سنجھال لی ہے۔

ہوائی اڈے کے احاطے کے باہر بکھاکی بوجھاڑ اور اندر ناریوں کی میلگار۔۔۔ مختلف ہوٹلوں کی نمائندہ بیسیاں۔ ہر اک اپنے اپنے ہوٹل کے گن گارہی تھی اور

جس مخلوق نے ورختوں کی سوکھی شاخوں سے روزی کمانے کا ڈھب نکال لیا ہے۔ ماہ دسمبر میں کرسمس کے تھوار پر ہر عیسائی خاندان اپنے گھر میں ”کرسمس ٹری“ جاتا ہے۔ چنانچہ روغاص بلیوارڈ کے یہ کار بیگر شاخوں کی کٹائی بناوٹ اور سجادوٹ اس ہنر مندی سے کرتے ہیں کہ ورختوں کی وہ سوکھی اور بیکار شاخص جو ایندھن کے کام بھی نہ آسکیں، جگہ کرتی ”کرسمس ٹری“ بن جاتی ہیں۔ جو فلپائنز کے علاوہ یورپ اور امریکہ بھی سجادوٹ کے لئے سمجھی جاتی ہیں۔

فیلا کی ہر شاہراہ پر ”بچپنی“ کا راج اور رنگ دکھائی دتا ہے۔ دوسری جگہ عظیم میں استعمال ہونے والی لاکھوں خاکی رنگ امریکن جپپیں۔ جنگ ختم ہونے کے بعد فلپینوں کے ہاتھوں لگیں تو انہوں نے ان بیکار جیپوں کو کار آمد بنا لیا اور سجا لیا۔ اور سجا یا بھی ایسے کہ ہر جیپ کسی بڑے مصور کا چلتا پھرتا شاہکار دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً سب سے پہلے تو جیپ کو ”بچپنی“ بتاتے ہی اسے ایک رفیق نام دیا جاتا ہے۔ مثلاً جپپی، فائیر گرل، پنک لیڈی، سیمیٹشل ولیو، اور اسی طرح کے اور جذباتی نام جو مالک اور ”بچپنی“ کے گرے لگاؤ کا مظہر ہوتے ہیں۔ بچپنی کے ”بوٹ“ پر رنگ برلنگی، نیلی پیلی، لال گلابی بیوں کا ایک جنگل سا سجا ہوتا ہے، جن کی جلتی بجھتی قوس قزح سی روشنیاں سڑک پر کھڑے مسافروں کو دعوت دیدار بھی دیتی ہی اور سوار ہونے کی ترغیب بھی۔ اسی طرح سیل اور تابنے کے بنے گھوزوں اور مرغوں کے مجسمے بھی ”بوٹ کی زینت کا لازی جز سمجھے جاتے ہیں۔ ”میں لیں“ سیل کی لٹکارے مارتی باڑی پر ”سکر“، ”سلوگن“ اور ڈرایائیں اس ہنرمندی سے سجائے جاتے ہیں کہ فیلا کی ”بچپنیاں“ سجادوٹ اور بناوٹ میں اور ناز اور خخرے میں ہمارے رکشوں اور ٹرکوں سے کئی ہاتھ آگے ہیں۔ گو ”بچپنیاں“ بھی ہماری ویگنوں کی طرح دن رات سڑک سڑک گلی گلی مسافر چھاتی اتادتی رہتی ہیں۔ مگر وہ موت کے ان کھیلوں سے نادائف ہیں جو ہماری ویگنوں کے ڈرائیور چرس کے سوئے، لگا کر ہماری سڑکوں پر کھیلتے ہیں اور مسافر اٹھانے کے لائی میں نہ جانے کتنے مسافروں کا خون کرتے رہتے ہیں اور حیرت کی بات ہے کہ ہر قتل پر صاف صاف نکلتے ہیں۔

وان پروفیسر اس کی زبان کی روانی سن سن شرمندہ ہوں۔ ویسے اس ڈرائیور کی انگریزی زبان پر گرفت عجب بات بھی نہ تھی کیونکہ فلپائنز میں ۸۸ فی صد لوگ تعلیم یافتہ ہیں۔ پھر فیلا تو ہے ہی طالب علموں کا شرجمان پہلی یونیورسٹی ۱۹۲۱ء میں کھوئی گئی اور پہلا پرنسپنگ پریس ۱۹۰۲ء میں لگایا گا۔ اسی طرح فیلا میں پہلا ہسپتال بھی ۱۹۵۷ء میں کھولا گیا۔ یہ سب صدیوں پرانی باتیں ہیں۔ گاڑی شارٹ کرتے ہی ڈرائیور نے اپنا رواستی پیکھر شروع کیا۔ ”لیڈیز اینڈ جنلیٹین.....! ماہبائی.....! یکم ٹو فیلا.....! یعنی خواتین و حضرات فیلا میں جی آیاں تو.....“ ہمارا ڈرائیور کم گاہیز ابھی پوری روانی پکڑ بھی نہ پایا تھا۔ کہ درویش اول نے ”ایکسیوزی“ کہہ کر اسے ٹوک دیا۔ ڈرائیور نے تیور بدلتے ہوئے اپنا مائیک بند کیا۔ ونڈ سکرین پر لگے آئینے میں درویش اول کو جھانکا اور جانچا۔ ”بٹ ویئر آرنو لیڈیز ان دس بس..... لیکن اس بس میں تو کوئی خواتین نہیں صرف جنلیٹین ہی ہیں۔“ درویش اول کے اس اعتراض پر دوسرے ڈسکریوں نے ایک زور دار قہقہ لگایا۔ مگر اس شاستہ زبان ڈرائیور نے جواب دیا تو تیقہ شرمندگی میں بدل گئے۔ ”سرا دیئر آرنو جنلیٹین دو آئٹ لیڈیز.....! یعنی حضور خواتین ہیا حضرات، حضرات نہیں سمجھے جاتے.....! سو اف یو ڈونٹ مائند لیٹ می کنیٹنیو.....! اگر آپ براہ نامیں تو میں اپنا بیان جاری رکھوں اور آپ حضرات کو شر فیلا کے متعلق تفصیلات فراہم کروں۔ کھیلانے سے درویش اول نے اقرار میں اپنا وزنی سارہ ہلا دیا مگر زبان بند رکھی۔

روغاص بلیوارڈ، آبائی فیلا کے ساتھ ساتھ شر تک چلا جاتا ہے۔ اس دو ہری شاہراہ کے بائیں ہاتھ حد نظر تک پہلی ہوئے سمندر میں ہپکولے کھاتے سلیٹی رنگ جہاز اور ساحل پر جھوٹتے ناریل کے پیڑ اور دائیں ہاتھ فائیو شار ہوٹل، دیس بدیس کے ریستوران اور نائٹ کلب جوون کو تو سنان ہی نظر آتے ہیں۔ مگر شام ڈھلتے ہی ان کی جگہ کرتی روشنیوں سے آنکھیں چند ہیا جاتی ہیں۔ روغاص بلیوارڈ کی ٹریک کا بُوارہ کرنے کے لئے درمیان میں ایک ”گراسی“ پٹی چھوڑی گئی ہے جس میں ناریل کے پیڑوں کے جھنڈ کے جھنڈ موجود ہیں۔ ان پیڑوں کے نیچے بھی ایک مخلوق آباد ہے۔

چنانچہ ان پر قدم جلانے کے لئے ہر قوم کی راں پٹکتی رہی۔ سکینڈی نیویا کے واہمکنگ اور پر تھکالی یورپ کے پسلے بھری قراق ہیں۔ جو اپنی بھری طاقت کے مل بوتے پر دودورا ز سمندروں میں نکلے اور جہاں جہاں تجارت کی تلاش میں یہ پسچے وہاں وہاں "ڈچ" ہسپانوی اور برطانوی بھی پہنچ گئے۔ چنانچہ سولہویں صدی میں جب پر تھکالیوں نے ان جزیروں کا رخ کیا تو ان کو سونگھتے سونگھتے ہسپانوی بھی یہاں آن پہنچ۔ پر تھکالیوں کو گھالیاں دیکھ مار بھکایا اور اپنے رواستی دشمن مسلمانوں کے ساتھ جنگ کی تیاری شروع کر دی۔ یہ وہ دور تھا کہ جب ہسپانوی، "موروز" یعنی مسلمانوں کو اندرس سے نکال چکے تھے اور مسلمانوں کی ابدی کمزوری یعنی آپس کی چاقش اور غداری کی خصلت سے نجوبی واقف تھے۔ چنانچہ انہوں نے دریائے پاسگ کے کنارے راجہ سلیمان کے لکڑی کے قلعہ کا حامصہ کیا۔ یہ قلعہ اسی مقام پر واقع تھا جہاں اب میلا کا شر آباد ہے۔ راجہ سلیمان نے ہری جوانمردی سے ہسپانوی فوجوں کا مقابلہ کیا۔ مگر راجہ سلیمان کی صفوں میں بھی سراج الدولہ اور پیپو سلطان کی طرح میر قاسم اور میر جعفر جیسے غدار موجود تھے۔ جنہوں نے بارودی سرنگوں کے ذریعے لکڑی کے قلعے میں آگ لگا دی۔ قلعہ کی دیواروں میں شکاف پڑتے ہی ہسپانوی فوجوں نے حملہ کر دیا۔ اک گھنٹاں کا رن پڑا۔ راجہ سلیمان شہید ہوا اور ہسپانیوں کا ان جزیروں پر قبضہ ہو گیا۔ جو ساڑھے تین صدیوں تک جاری رہا۔ مسلمانوں کی صدیوں پرانی وہ جنگ اب بھی جاری ہے اور جنوبی جزیروں کے مسلمان جن کو اندرس کی نسبت سے "مورو" کہا جاتا ہے راجہ سلیمان کے عزم پر اب بھی قائم ہیں اور آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔

ہسپانیوں نے راجہ سلیمان کی شہادت کے بعد جزیروں کے اس ملک کو اپنے شہنشاہ فلپ دوم کے نام سے منسوب کرتے ہوئے اس کا نام فلپائنیز رکھا اور ساتھ ہی میلا شرکی بنیاد رکھی اور راجہ سلیمان کے لکڑی کے قلعہ کی جگہ پتھر کا قلعہ تعمیر کیا جو اب بھی وہاں موجود ہے۔ ہسپانیوں کے قدم جستے ہی تجارت نے بھی فروغ پایا اور تبلیغ نے بھی۔ چنانچہ ایک طرف تو ہسپانوی جماں چاندی کے سکے لاتے رہے اور میلا میں اکٹھی کی گئی چائے، ریشمی کپڑے، ممالے اور قیمتی پتھر لے جا کر منافع کماتے رہے اور

کمپیوٹر دماغ درویش دوم نے درویش اول کے کان میں کچھ سازشی گھر پھر کی۔ جس پر درویش اول نے اقرار میں سرہلا دیا اور "ریشن" پر کھڑی بی بی کو دو کی بجائے تین کرے بک کرنے کو کہا۔ لڑکی نے اسے کمروں کی چابیاں تمہائیں تو اس نے کاؤنٹر کے پیچے کھڑی چابیاں تمہانے والی لڑکی کے ساتھ کچھ مزید سرگوشی کی۔ اس لڑکی نے جوابی سرگوشی کی اور درویش اول نے اسے ایک چابی واپس کر دی۔ تھوڑی دری اس نے اپنے ریز روشن وائل کمپیوٹر کی ساتھ چھیڑ چھاڑ کی اور پھر ایک اور چابی درویش اول کے ہاتھ میں تمہادی اور ہم تینوں کمروں میں جانے کے لئے لفت کی جانب چل دیئے۔ لفت میں داخل ہوتے ہی درویش اول نے مجھے میرے کمرے کی چابی تمہادی اور ساتھ ہی دوسرا منزل کا بہن دبا دیا۔ میں نے دوسرا منزل پر لفت سے باہر قدم رکھا ہی تھا کہ انہوں نے دوبارہ بہن دبا دیا اور لفت کو ہاتکتے ہوئے کسی بالائی منزل پر لے گئے۔ چنانچہ میں سامان گھینٹا ہوا اپنے کمرے میں جا پہنچ۔ جزیرہ بالی کے بعد اب پہلی مرتبہ مجھے علیحدہ کرے میں سونے کا موقع مل رہا تھا۔ کرے علیحدہ لینے کی بات تو سمجھ میں آگئی مگر منزل علیحدہ کرنے میں کیا راز تھا یہ میری سمجھ میں نہ آیا۔ دیسے کہ تو میرا بھی ٹھیک ٹھاک تھا البتہ پرده ہٹا کر کھڑکی کھوئی تو ٹریفک کا شور تھا اور ہوٹل کا پچھواڑہ تھا۔ اور یہ شور اور ہنگامہ ہی درویشوں کی منزلیں الگ کرنے کا سبب تھا۔ کیونکہ اکثر ہوٹلوں میں بغیر نظاروں اور شور اور ہنگامے والے پیچی منزلوں کے کرے اونچی منزلوں کے کمروں کی نسبت کم کرائے پر ملتے ہیں۔ اسی لئے دونوں درویشوں نے کفایت شماری کا یہ تجربہ مجھ پر کیا۔ مگر درویش دوم کے خزانوں کے مقابلے میں مگر کا یہ شور مجھے گوارا تھا اور میں دل لگا کر شام کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔

فلپائنیز کے بارے میں ایک کہاوت مشور ہے کہ صدیوں پسلے ایک دیو سر پر پتھروں کا ٹوکرہ اٹھائے بحیرہ اوکیانوس (Pacific Ocean) سے گزر رہا تھا کہ اس کا پاؤں پھسل گیا اور ٹوکرے میں رکھے پتھر سمندر میں بکھر گئے۔ دیو بادشاہ کے وہ بکھرے ہوئے پتھر دھیرے دھیرے جزیروں میں بدل گئے۔ وہ جزیرے جغرافیائی لحاظ سے صدیوں پسلے تجارت کے لئے بڑے اہم اور صدیوں بعد دفاع کے لئے اہم ہو گئے۔

دوسری طرف ان کی تبلیغی جماعتوں نے عیسائیت پھیلانے کا کام جاری رکھا چنانچہ سر وقت فلپائنز کی ۸۵ صد آبادی عیسائی ہے۔ اور یہ مشرق بعید کی واحد عیسائی سلطنت ہے۔

جب تک میں تیار ہو کر نیچے ہوٹل کی لابی میں پہنچا دونوں درویش پہلے سے ہی رات کی واردات پر نکل چکے تھے۔ الگ الگ کمرے اور عیمہ عیمہ منزلیں تو خیر کی حد تک قابل قبول بھی تھیں اور قابل وضاحت بھی۔ مگر یوں سرے سے ہی مجھے تھا چھوڑ جانا یقیناً اس بات کی علامت تھی کہ سفر کی طوالت ہماری رفاقت میں شگاف ڈال رہی تھی اس لئے مناسب یہی تھا کہ یا تو اس سفر کو فیلا پر ہی ختم کر دیا جائے اور یا ہر درویش اپنی الگ را اختیار کرے۔ اس طرح کے کئی وسوسے اور خیالات میرے ذہن میں دوڑنے لگے اور میں اسی تک دو میں بے منزل و بے مقصد ہوٹل کی لابی سے نکل پڑا۔

فیلا کی سڑکوں پر آفت کا شور، غصب کا رش اور بلا کی رونقیں ہوتی ہیں۔ جو نی اپ کسی فٹ پاتھ پر قدم رکھتے ہیں۔ تو اک سیل رواں کا حصہ بن جاتے ہیں۔ جو کندھوں سے کندھے اور جسموں سے جنم نکراتے ہو تو ہر وقت ہر سڑک اور ہر گلی پر ہر سو بہتا دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ ہوٹل سے نکلتے ہی میں بھی ایک ایسی مست چل لکلا جس جانب زیادہ تر غیر ملکی سیاحوں کا رخ تھا۔ میں جانتا تھا کہ یقیناً اس جانب سفر کرنے میں بھلائی ہی بھلائی ہے۔ کیونکہ اورہ "مبینی" (mabini) کا علاقہ ہے جسے سیاحوں کی عیاشی کی لئے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ راستہ بھر فٹ پاتھوں کے ساتھ ساتھ افلاس زدہ سوادگروں کے اٹھے ہیں۔ جہاں زیادہ تر چھا بڑی والی بوڑھی عورتیں موجود ہیں۔ جو اپنے خوانچوں میں "چوانگم" سگریٹ، ماجس، افلاس اور امید سجائے بیٹھی ہیں۔ پاس ہی ان کے معصوم بچے دنیا والوں کی نااصافیوں سے بے خبر سو رہے ہیں۔ انہی فٹ پاتھوں پر نو خیز نوسراز بھی ملتے ہیں جو اماڑی سیاحوں سے مال ببورنے کی نکر میں ہوتے ہیں۔ پھر جگہ جگہ پر چھوٹے چھوٹے شال بھی دکھائی دیتے ہیں۔ جہاں کھانے کو مک دار پھلبیاں، سفید چاول، تلے ہوئے کیلے، گوشت کی سلاخیں، بھنی ہوئی سبزیاں

اور پینے کو ناریل کا پانی کو کا کولا اور بیہر لمحی ہے کونے کونے پر سرکاری لائسنس یافت ایکچھ کے ڈبلوں کے کاؤنٹر ہیں جو دن رات کھلے رہتے ہیں اور سیاحوں کا غیر ملکی سرمایہ فلپائنز کے "پیسو" میں بدل دیتے ہیں۔ ایسی ہی جگہوں کے ارد گرد "بلیک" میں پیسے بدلنے والے بھی گدھوں کی طرح منڈلاتے رہتے ہیں اور سیاحوں کو "بلیک" میں پیسے بدلنے پر اکساتے رہتے ہیں۔ "بلیک" کا وہندہ "بلیک آؤٹ" گلیوں میں ہی اکثر پھلتا پھوتا ہے۔ جیسا کہ ہمارے ملک میں جب سے "لوڈ شیڈنگ" شروع ہوئی ہے تو سے کا لے وہندے نے بڑا فروغ پایا ہے اور اب تو دن کے اجالے میں سیاہ من والے اپنے سیاہ دھن کی کھلے بندوں نمائش کرتے رہتے ہیں اور قانون کا باقہ ان کے گربیاں تک نہیں پہنچ سکتا کیونکہ قانون جاری کرنے والے تو ان کے حضور میں "سلوٹ" کے لئے اپنے ہاتھ پیشانی پر چپکائے رکھتے ہیں۔ ہاں تو بات فیلا کے "بلیکیوں" کی ہو رہی تھی۔ جو لاپچی سیاحوں پر کڑی نظر رکھتے ہیں اور جو نی کوئی مرنا پھنس جائے اس پر چھری پھیر دیتے ہیں۔ ہمارا کمپیوٹر دماغ درویش دوم بھی ان کی چاک دستی کا شکار ہوا۔ اور فیلا میں پہلی رات ہی شکار ہو گیا یہ واردات اسی روز ہوئی تھی جبکہ دونوں درویش مجھے تن تھا چھوڑ کر نکل گئے تھے۔ مگر ان دونوں نے وہاں مجھے اس بات کی کافیوں کافی خبر نہ ہونے دی البتہ پاکستان لوٹنے پر انہوں نے ہتھیا کہ جو نی وہ دونوں ہوٹل سے نکلے تو گلی کی فنڑ پر ان کی ایک "بلیکے" سے ملاقات ہو گئی۔ جس نے بیٹک کے مقابلے میں تقویا ڈیڑھ گناہ بستریت فی ڈالر کی پیشکش کی۔ یہ ایسی پیشکش تھی جسے درویش دوم ہرگز نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ وہ اس "بلیکے" کے پیچے پیچھے اک اندر ہیری گلی میں چل نکلا۔ وہاں اس نو سریاز نے پر اسراز اور اندر ہیرے ماحول کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ایسی ہوشیاری سے نوٹوں کی تحدیوں کا بیہر ہیر کیا اور پھر اس پھرتی سے غائب ہوا کہ کمپیوٹر دماغ ہنکا بکار ہی گیا۔ جب درویش دوم نے اپنی جیب میں چھپی اس نوٹوں کی تحدی کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ اس تحدی کے اوپر اور نیچے نوٹ تھے اور باقی سب کوئے کانٹے کے مکمل تھے۔

ویسے مجھے کسی نو سریاز سے کوئی خطرہ نہ تھا۔ کیونکہ اول تو میرے پاس لٹانے کے

میرے ہاتھ میں اشنس ریستوران کا بھدا سا مینیو کارڈ تھا دیا۔ جس بے ولی سے اس خاتون نے مجھے مینیو کارڈ تھامیا وہاں کی سروس کا تو مجھے بخوبی اندازہ ہو گیا۔ مگر کھانا تو بہر حال کھانا تھا۔ چنانچہ میں کھانوں کی تفصیل میں لبھ گیا۔

اشنس ریستوران کے مرغ مالے کو مچھلی مسالہ بھی بجا طور پر کما جا سکتا تھا کیونکہ آبناۓ غلیا میں جتنا پانی ہے۔ مرغ مالے کے اس ڈونگے میں اتنا ہی شور با تھا۔ ہم نے ڈونگے میں مجھ کا چچو گھما یا اور بار بار گھما یا مگر ہر بار بوثی مجھ سے نکل نکل جاتی۔ نکل آکر میں نے نان کے نکلوے ڈونگے میں چیکن۔ تنق نما نان نے شور بایا تو ڈونگے کی گھرائی میں ایک سمی ہوئی بوثی دکھائی دی۔ میں اس کنور سی بوثی پر حملہ کرنے ہی والا تھا کہ پاکستانی نوجوانوں کا ایک نمائندہ میرے قریب آیا اور بغیر پوچھ جہے میرے سامنے بیٹھ گیا۔ بہ امر بجوری میں نے اسے کھانا کھانے کی صلاح دی۔ مگر شکر ہے اس نے کھانا کھانے سے تو انکار کر دیا۔ البتہ ویٹس کو ایک بیٹر لانے کا آڈر دی دیا۔

میں ٹھک سے یقیناً بدھو گلتا ہوں گا۔ تبھی تو اس موصوف نے بلا جنمک مجھے درجنوں نوکریاں دلوانے کا جھانس دیدیا۔ اور ہر جھانس دینے کے ساتھ ساتھ وہ یہ یقین دہانی متواتر کرواتا جا رہا تھا۔ کہ وہ میری مدد صرف پاکستانی ہونے کے ناطے کر رہا تھا۔ اس کی ملازمتوں کی فہرست میں سرکس کی نوکری بھی تھی۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ اگر مجھے واقعی نوکری چاہئے ہوتی تو سرکس میں بھلا مجھے کیا نوکری ملتی؟ اس سے پچھا چھڑانے کے لئے جو نہیں اسے میں نے اپنا پی آئی اے کا کارڈ دیا تو اس کا رویہ سرے سے ہی بدل گیا اور اب وہ میرا مل چکانے پر بعند تھا۔ غیر ملکوں میں اکثر پاکستانی نو سریاز گروہوں سے بھی واسطہ پڑتا ہے جو نووارد ہم وطنوں کو اعتقاد میں لے کر ان کی پوچھی بنوں کر غائب ہو جاتے ہیں۔

میں نے ہوٹل پہنچ کر دونوں درویشوں کا پتہ کیا تو وہ ابھی تک غائب تھے۔ یقیناً عیش کر رہے ہوں گے۔ میں نے سوچا اور اپنے کمرے میں جانے کے لئے لفٹ میں سوار ہو گیا۔ اس ہوٹل کی ہر منزل پر پستول سے لیس سیکورٹی گارڈ موجود تھے جو ہر

لئے کچھ تھا ہی نہیں اور دوسرے یہ کہ نوسراز بھی تن تھا سیاحوں پر حملہ کرتے ہیں اور میں آسٹریلین سیاحوں کے ایک جھنے کا دم چھلا بن کے گھوم رہا تھا۔ چنانچہ جماں وہ جاتے وہیں میں جاتا اور جو وہ کرتے بس میں بھی وہی کر گزرتا۔ مینی کے اس علاقے میں قدم قدم پر جنس فروش بیساں ملتی ہیں، گھٹ گھٹ کے جنی بیپاری ملتے ہیں اور بھانٹ بھانٹ کی جنی بیپاریاں ملتی ہیں۔ اسی طرح کونے کونے پر ڈاکٹوں کے کلینک بھی ملتے ہیں جو ان جنی بیپاریوں کا مدوا کرتے ہیں۔ ویسے بھی ہر کاروباری بی بی پر یہ لازم ہے کہ وہ ہفتہ میں کم از کم ایک مرتبہ اپنا میڈیکل معائضہ کروا کر ڈاکٹر سے باقاعدہ سرٹیفیکٹ حاصل کر لے۔ مگر وہاں بھی ہمارے ملک کی طرح ایسے ڈاکٹر موجود ہیں۔ جو جعلی سرٹیفیکٹ دینے میں عار محسوس نہیں کرتے۔ مینی کے اس علاقے میں سو ڈاگر تو ہر طرح کے ملتے ہیں مگر مگر ڈاگر نہیں ملتے۔

رات بڑھتی رہی اور میرے آسٹریلین ساتھیوں کی بدستی بھی بڑھتی رہی اور میری فاتحہ مستی بھی چمکتی رہی تو میں کھانے کا مثالیشی ہوا۔ عام طور پر اس طرح کی جنی کمین گاہوں میں پینے کی تو ہر شے ملتی ہے مگر کھانے کا غاطر خواہ بندوبست نہیں ہوتا۔ مگر مینی میں ایسا نہیں۔ وہاں کھانے کے چھوٹے چھوٹے کھوکھوں کے علاوہ اپنے اچھے ریستوران بھی ہیں جماں ملک کی خوارک مل جاتی ہے۔ چنانچہ مختلف ریستورانوں کے ”نیوان سائنوں“ میں ایک عربی زبان میں لکھا ”طعم الباکستانی“ کا سبز رنگ سائین دکھائی دیا تو میں بے اختیار ادھر کو چل لگا۔ اشنس ایک لوریے کا ریستوران ہے اور عجب ریستوران ہے۔ کہ ”نیوان سائین“ عربی میں لکھا ہے، اندر موسيقی بندوستانی ہے اور خانامہ فلپینو ۔۔۔ البتہ دو پاکستان کی نشانیاں اس ریستوران میں دکھائی دیں جنہیں دیکھ کر دیار غیر میں اپنائیت محسوس ہوئی ۔۔۔ ایک میٹار پاکستان کی تصویر اور دوسرا با آواز بلند گیسیں ہاکلتے اور قفقنے لگاتے ہوئے چند پاکستانی نوجوان جو ایک میز پر قبضہ جائے بیٹھے تھے۔ اور خدا جانے کب سے بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے ایک لمحے کے لئے خاموشی اختیار کی اور آپس میں کھسر پھر شروع کر دی۔ ایک فلپینو ویٹس نے مجھے ایک میز سنبھالنے کا اشارہ کیا اور

درویش دم کا الزام مع سود واپس کر دیا۔ اور یوں دیکھتے دونوں طرف سے  
ازمات کی فائیرگ کھل گئی۔ میں ابھی تک اسے ہوائی فائیرگ سمجھ رہا تھا۔ جو مجھے  
الوبانے کے لئے نائک کے طور پر کی جا رہی تھی تاکہ میں ان دونوں سے یوں تباہی  
پر نکل جانے کے بارے میں سوال جواب نہ کر سکوں۔ مگر وہ دونوں تو ایک دوسرے  
کے بال نوچنے کو تن گئے۔ میری کینگنی نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔  
”یوں۔ این۔ او بن جاؤ! بس دل میں امن کی بات کرنا۔۔۔ لڑنے دو دونوں کو سچ  
بردا دچپ رہے گا...۔۔۔ ایک فارغ الال اور دوسرا بال ہی بال...“ مگر میں یوں۔ این۔ او  
کیسے بن سکتا تھا۔ ایمانداری سے کوشش کی تو وہ دونوں ٹھہنڈے ہو کر بینچ گئے اور خالی  
بٹوے کی کمائی چھیڑ دی۔

دراصل ان کے اس بٹوے کو خالی کوانے کے پیچے ہوٹل میلا ٹھہنڈاون کے اس  
پورٹر کا مشورہ تھا جو ان دونوں کا سامان پہنچانے ان کے کمرے تک آیا تھا۔ یہ پورٹر  
لوگ بڑے سیانے ہوتے ہیں۔ لمحے بھر میں لوگوں کی طبیعت کو پہنچان اور نیت کو جان  
لیتے ہیں اور پھر دونوں درویشوں کی اول جلوں طبیعت کو جانتا کوئی بڑی بات تھی۔  
چنانچہ اس نے ان دونوں کی طبیعت بحال کرنے کے لئے رضال پارک کے جاپانی اور  
چینی باغوں کی سیر کا مشورہ دیا۔ خالی خولی سیر میں تو اتنی کشش نہ تھی کہ دونوں درویش  
اس پھرتوں سے دہاں پہنچ کر انہوں نے مجھے بلاںے پر وقت ضائع کرنا بھی گوارا نہ کیا۔  
پورٹر نے انہیں اس لئے وہاں فی الفور پہنچنے کی ہدایت کی تھی کہ میلا کی طالبات صرف  
سرشام ہی ان باغوں میں ساقیوں کی حلاش میں نکلتی ہیں اور جو نئی کوئی ساتھی مل جاتا  
ہے فوراً اپنی کمین گاہوں میں گل کھلانے اور رنگ رلیاں منانے چل جاتی ہیں۔

جب ہمارے یہ گھسیں صفت یار وہاں پہنچنے تو چینی اور جاپانی وضع کے ان باغوں کی  
رونقیں اپنے پورے شباب پر تھیں۔ ہر طرف باہوں میں باہیں ڈالے نوجوان جوڑے  
دکھائی دیئے جو دنیا سے بے خراس ممکن شام میں ڈوبے گلشت کر رہے تھے۔ پھر دو  
عدد غنچہ دہن۔ گلبدن بیساں، بغلوں میں کتابیں وباۓ ان خزانت بھنوروں کو دکھائی  
دیں تو یہ دونوں شکروں کی طرح جھپٹ کر ان تک جا پہنچے۔ چونکہ میلا میں پچھے پچھے

آنے جانے والے پر خصوصی نظر رکھتے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ میلا میں سیکورٹی  
گارڈ تو ہر ہوٹل، سٹور، ہر بلڈنگ اور ہر گھر کا ضروری حصہ سمجھے جاتے ہیں اور ان  
ترہیت یافتہ پادری گارڈوں کو سپلائی کرنے کے لئے باقاعدہ کپنیاں موجود ہیں۔ گارڈوں  
کے علاوہ خفاظتی دیواریں بھی نہایت بلند و بالا تعمیر کی جاتی ہیں۔ جن کی منڈریوں پر  
کاخ کے نکڑے لگائے جاتے ہیں۔ مگر ان خفاظتی تدابیر کے باوجود آئے دن وہاں چوری  
چکاری کی وارداتی ہوتی ہی رہتی ہیں۔ ٹھیں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی جائز باوڈن  
کی طرح کھڑکی دروازے مضبوطی سے بند کئے اور میلا میں مقیم اپنے ایک پرانے  
دوست میرو کو فون کیا۔ میرو حسب معمول گھر پر موجود نہ تھا۔ چنانچہ ٹھیں نے فلپنے  
بھالی ”مری“ کو پیغام دیا اور لمبی تان کے سو گیا۔ مگر میلا میں آرام کھاںب سے پہلے  
تو سرہانے رکھا فون چکھاڑنے لگا۔ جی چاہا کہ فون کو جڑوں سے اکھاڑ کر کھڑکی کے باہر  
وے ماروں ..... مگر پھر ایسا کرنے سے خود ہی باز رہا۔ دل پر پھر رکھ کر ..... یہلو!—  
کما تو دوسری جانب میرو کی آواز تھی۔ وہ خدا خبر میلا کے کس کونے میں رہتا تھا مگر  
فوراً ہوٹل پہنچنے کو تیار ہو گیا۔ ٹھیں نے بڑی مشکل سے اسے باز رکھا اور دوسری شام  
ٹھنے کا وعدہ کیا۔۔۔ میرو بڑا یار باش اور بادشاہ بندہ ہے۔ اس نے میلا کی سیر کرنے کے  
لئے گاڑی اور ڈرائیور کی پیٹکش کی اور بڑے خلوص کے ساتھ پیٹکش کی۔ چنانچہ  
دوسری صبح ۹ بجے کا وقت طے کیا اور ٹھیں پھر سے سونے کی کوشش کرنے لگا۔

مگر صاحب میلا میں آرام کھاں — دروازے پر دستک اور گھنٹی ایک ساتھ  
شروع ہو گئے اور اس وقت تک جاری رہے جب تک ٹھیں نے دروازہ نہیں  
کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی دونوں درویشوں نے یک لخت بولتا شروع کیا اور ”تان ٹاپ“  
بولتے چلے گئے۔ جب ان کی روائی میں کچھ کی ہوئی تو ٹھیں نے ان سے کہا کہ وہ جو  
کچھ بھی کہ رہے تھے اگر باری باری کمیں، دوبارہ کمیں اور تسلی سے کمیں تو مکن  
ہے میری سمجھ میں کچھ آجائے۔ یہ سنتے ہی درویش دوم نے اپنا خالی بٹوے میرے سامنے  
پھینک دیا۔ اور درویش اول پر الزام کی انگلی اٹھاتے ہوئے پھر کہا کہ ”یہ سب کچھ  
اس کی وجہ سے ہوا۔۔۔“ درویش اول اس سے بھی زیادہ جوش میں غرایا اور

ساتھ ایسا سلوک کرتے ہوں اس ہوٹل میں قیام ہرگز نہیں کرنا چاہئے۔ چنانچہ دوسری صبح ہم حیات ریجنی میں منتقل ہو گئے اور وہاں مجھے بھی ایسا باعزت کمرہ مل گیا۔ جس کی کھڑکی سے آپنائے فیلا کے خوبصورت نظارے ہوتے تھے۔

ان طالبات کی کارروائی سے مجھے لاہور کی گونگی گستاخی یاد آگئی۔ جو ایک زمانے میں، بغل میں کتابیں دبائے، کالج یونیفارم پہنے، لاہور کی اس سڑک کے بس شاپوں پر کھڑی دکھائی دیتی تھی۔ جس سڑک پر طالبات کے کالج ہیں۔ وہ پر کی چھٹی کے وقت اس سڑک پر بلا کی بھیڑ ہوتی ہے۔ جہاں سکوٹوں اور گاڑیوں میں سوار نوجوان اکثر پھیرے لگاتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ یونیفارم بھی انسانوں کے لئے بڑی کمزوری کا باعث بنتی ہے۔ جب یونیفارم بندہ پہن لے تو دوسرے بندوں پر عذاب اللہ بن جاتا ہے۔ اور خود عذاب اللہ سے بے نیاز ہو جاتا ہے جب یونیفارم عورت پہن لے تو وہ بندوں پر عذاب اللہ کا سبب بن جاتی۔ مثلاً فضائی میزبانوں کو دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ لڑکی بھلے چوتی کی ہو۔ ہوائی کمپنی کی یونیفارم پہننے کی بن جاتی ہے اور بڑے بڑے پھنسنے خان ان یونیفارم والی چیزوں کو حاصل کرنے کے لئے جاکروں نما دیتے ہیں۔ لاہور کی وہ گونگی گستاخی مردوں کی اس ابدی کمزوری سے بخوبی واقف تھی اور اکثر بڑی بڑی کاروں میں گھومتی دکھائی دیتی تھی۔

میرو کا ڈرائیور فرنیندو پاکستانیوں کی رگ رگ سے واقف تھا۔ کیونکہ جب سے میرو فیلا میں مقیم ہوا۔ اس کے لوری یاروں نے فیلا کا رخ کیا۔ صرف ”لوری“ ہی کیا۔ جو پاکستانی بھی میرو کو فیلا میں مل جاتا۔ میرو اس پر بچھ جاتا۔ اور بیچارہ فرنیندو ان کو گھمانے پھرانے پر لگا دیا جاتا۔ چنانچہ دس سال کے اس عرصے میں وہ ایک بخت گایدہ بن چکا تھا۔ جو پاکستانیوں کی ہر اچھی اور بڑی ضرورت کو پورا کرنے پر پوری طرح دست رس رکھتا تھا۔ چنانچہ ہمیں ہوٹل حیات ریجنی میں منتقل کرنے کے بعد اس نے فیلا کے سکے بند نور کا آغاز کیا اور سب سے پہلے ہمیں راجہ سلیمان کے قلعے لے گیا۔ جواب سیستیاگو کا قلعہ کملاتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں جاپانیوں نے فلپائن سے امریکنوں کو مار بھگایا تھا۔ اور تین سال تک پہلک پر اپنا قبضہ جمالیا تھا۔ ۱۹۴۵ء

اگریزی بوتا ہے۔ اس لئے گفتگو کا تو مسئلہ تھا ہی نہیں۔ چنانچہ انہوں نے پورٹ کے مشورے پر عمل کیا اور شام کے ساتھی جمن لئے۔ اب لڑکیوں کی بغل میں کتابیں تھیں اور درویشوں کی بغل میں لڑکیاں..... یہ عمل اس قدر پھر تھی سے ہوا کہ درویش کچھ سوچے سمجھے بغیر ہی ان لڑکیوں کے ہمراہ ان کی گاڑی میں سوار ہو گئے اور ان کی اپارٹمنٹ میں جانے کو چل نکلے۔ جو طالبات یوں گاڑیوں میں تھا گھومتی ہوں اور مگر والوں سے علیحدہ اپارٹمنٹ رکھتی ہوں۔ وہ یقیناً تعلیم گاہوں سے نکل کر تربیت گاہوں میں قدم رکھ چکی ہوتی ہیں مگر ان بارکیوں پر دھیان دینے کا کس کو ہوش تھا۔ وہ دونوں تو بس لڑکیوں کے عشق میں سرشار مددوш اور مست تھے۔ چنانچہ گلیاں چوک چوراہے گزرتے رہے اور خدا بخ کمال کمال سے گھما پھرا کر وہ انہیں اپنی اپارٹمنٹ تک لے گئیں۔ وہاں ایک معمر خادم نے ان کا پرہوش استقبال کرتے ہوئے مشروب مغرب پیش کیا اور دونوں درویش ٹھاٹھ سے وہاں بیٹھ گئے۔ دونوں طالبات اپنے اپنے کمروں سے لوٹیں تو غصب کا رنگ روپ دھارے ہوئے تھیں۔ سکول یونیفارم کی جگہ جذبات بھڑکانے والا شوخ لباس تھا۔ لباس بھی کیا بس ایک ٹکف تھا۔ جس کے اندر سے ان کا شوخ و شنگ انگ انگ بار بار بے تکلفی کر رہا تھا۔ درویشوں کے ہاتھوں میں جام آنکھوں میں سرور اور بانوں میں شباب ایسی حسین زندگی کہ بس خواب کا گماں ہوتا تھا۔ خواب زندہ تعبیر ہونے سے پہلے ہی دروازے پر گھنٹی بجی۔ خادم نے دروازہ کھولا تو دو نوجوان داخل ہوئے۔ لڑکیاں اچل کر ان سے بغل گیر ہو گئیں۔ اور درویشوں کا پتا پانی ہو گیا۔ چنانچہ درویشوں نے اپنی جان بچانے کی خاطر اپنی جیب میں جتنا مال تھا۔ ان لڑکوں کے حوالے کیا۔ نہ کھلایا پیا، نہ گلاس ہی توڑے اور پوچھی لٹا کر غالی ہاتھ ہوٹل میں لوٹ آئے۔

فیلا مڈ ٹاؤن ہوٹل کا پورٹ، طالبات، خادم اور لڑکے سب اس جاں کی کڑیاں تھے۔ جو درویشوں جیسے معمول مسافروں کو لوٹنے کے لئے ان پر پھیلنے جاتے ہیں اور ایسے حادثوں میں لئے والے اپنی شرمندگی پر پردہ ڈالنے کی غرض سے ان کو کبھی بے پردہ نہیں کرتے۔ مگر ہم لوگوں نے یہ فیصلہ کیا کہ جس ہوٹل کے پورٹ اپنے مہمان کے

اور فوجی اڈے بھی قائم کر لئے۔ فلپائنز کو آزادی ملتے ہی معاشری بدحالی اور کرپش ہ دور دورہ شروع ہو گیا۔ جس سے عوام کو بڑی مایوسی ہوئی۔

۱۹۷۵ء میں مارکوس کو بڑی امیدوں اور آرزوؤں کے ساتھ عوام نے صدر منتخب کیا۔ تاکہ وہ فلپائنز کی معاشری بدحالی کو سدھا ر سکے۔ فلپینز اگرچہ ہمارے عوام کے مقابلے میں بست زیادہ پڑھے لکھے اور باشمور لوگ ہیں مگر وہ بھی اچھے "کل" کی خاطر اپنا "آج" یعنی ووٹ کا اکلوتا حق نظرے باز مداریوں کے حوالے کر دیتے ہیں اور بار بار وہی دھوکہ کھاتے ہیں۔ مارکوس دو مرتبہ صدر منتخب ہوا مگر آخر ہ سال کے عرصے میں غریب اور امیر کے مابین خلیج بڑھتی ہی گئی۔ ہمارے ملک کی طرف چند خاندان تو سب کچھ بن گئے اور عوام ہر شے سے محروم ہو گئے۔ فلپائنز کا آئین امریکہ کے آئین کی طرح ہے۔ جس کے مطابق کوئی صدر تیری مرتبہ انتخاب نہیں لے سکتا۔ چنانچہ ۱۹۷۲ء کے انتخاب کے وقت مارکوس نے مارشل لاء کا اعلان کر دیا۔ کانگریس کو چلتا کیا اور اپنی پسند کا آئین بنالیا۔ ساتھ ہی ساتھ سیاسی حریفوں کو بھی قید کر دیا۔ جس میں اقینوں بھی شامل تھا۔ یہ دوسرے ہے جب ہمارے ملک میں عوامی مارشل لاء موجود تھا۔

آخر سالہ قید و بند کے دوران اقینوں کو دو مرتبہ دل کے درے پڑے چنانچہ اسے علاج کے لئے امریکہ جانے کی اجازت مل گئی۔ وہ تین سال تک امریکہ میں رہا اور جب ۱۹۸۳ء میں وطن لوٹا تو اسے میلہ کے ہوائی اڈے پر قتل کر دیا گیا۔  
جو چپ رہے گی زبان خیبر، ابو پکارے گا آئین کا

چنانچہ اقینوں کا ابو پکار۔ سرکاری مداخلت کے باوجود عوام نے مقتول اقینوں کی بیوہ کا ساتھ دیا اور وہ ایکش جیت گئی۔ مگر مارکوس نے عوام کے فیصلے کو رد کرتے ہوئے ان کی امنگوں کو کچھ کے لئے سڑکوں پر نینک چلا دیئے۔ چنانچہ میلہ کی سڑکوں پر ایک جانب ایک آمر کے نینک تھے اور دوسری جانب "پیپلز پاور" یعنی عوام کی طاقت کو جو حقیقت میں طاقت کا سرچشمہ ہیں۔ عوامی جوش دلوے کے سامنے نینکوں کی سیل کی نایاں پکھل گئیں۔ مارکوس کے چیتے سفید بالوں والے بیروکریں، موٹی

میں جزل میکار تھرنے جب فلپائنز پر دوبارہ قبضہ کیا تو قلعہ سیتیاگو پر زبردست بمباری کی گئی۔ کیونکہ اسی قلعے کے اندر ہی جاپانیوں نے اپنا ہیئت کوارٹر بنا رکھا تھا۔ ہم نے قلعے کی شکست دیواروں سے دریائے پاسک کے نظارے کے اور فرنیندو کو جذباتی ہوتے پہلے ہی اس تاریخی قلعے سے نکلا اور رضال پارک لے گئے۔ جی ہاں! یہ وہی رضال پارک ہے جس کے چینی اور جاپانی باغوں کی سیر کو درویش اول اور درویش دوم گئے تھے اور دو بیبیوں کے ہاتھوں اپنی پوچھی لٹا آئے تھے۔ خوزے رضال فلپائنز کا ایک انقلابی ہیرو تھا۔ جس نے ہسپانوی حکمرانوں کے خلاف آواز بلند کی۔ یہ انیسویں صدی کا ذریعہ ہے جب انقلابی وکلاء نے اپنے ملک کے حکمرانوں کو چیلنج کیا اور آزادی کے جدوجہد کا آغاز کیا۔ خوزے رضال وکیل ہونے کے علاوہ "اکٹر"، مصور، مصنف، شاعر اور بہت سی زبانوں کا ماہر تھا۔ جس کے ایک ناول نے وہاں تسلکہ چا دیا اور ہسپانوی حکمرانوں نے اسے دلیں نکلا دے دیا۔ چند سالوں بعد جب وہ واپس لوٹا تو اس پر بغاوت کا الزام لگایا اور اسی مقام پر جہاں ہم کھڑے تھے اسے ۱۸۹۶ء میں گولیوں کا نشانہ بنا دیا گیا۔ اسی جگہ پر اب اس کا مجسمہ نصب ہے۔ چونکہ حکمرانوں کی گولیاں انقلابیوں کو دیا جائیں کرتیں بلکہ اور بھڑکایا کرتی ہیں۔ اسی لئے پین کی گرفت فلپائنز پر کمزور پڑ گئی اور انسوں نے اپنی جان چھڑانے کی خاطر پورا ملک دو کروڑ ڈالر میں امریکہ کو فروخت کر دیا۔ چنانچہ سات ہزار جنیروں کا یہ ملک تین سو سال کی غلامی کے بعد آسمان سے پکا اور اگلے پچاس سال کی غلامی کے لئے سمجھور میں اٹک گیا۔ اگر امریکنوں کی غلامی فلپینوں کو راس آگئی۔ کیونکہ وہ ہسپانیوں کی نسبت بہتر حکمران ہاتھ ہوئے اور انسوں نے کچھ ترقی کے کام بھی کئے جس سے ملک کی معیشت پر خوفناک اثر پڑا۔ دوسری جنگ عظیم میں جب جاپانیوں نے فلپائنز پر قبضہ کیا تو ان کو نکالنے کے لئے امریکن اور فلپینوں شانہ بے شانہ لڑے اور ۱۹۴۵ء میں جاپانیوں سے ملک آزاد ہو گیا۔ چنانچہ امریکہ نے بھی دوسری جنگ عظیم میں کئے گئے وعدے کے مطابق ۱۹۴۶ء میں فلپائنز کو آزاد کر کے ریپبلک بنادیا۔ مگر امریکہ نے اپنا اثر و رسوش بھی قائم رکھا

ہے اور جنم پر سرجری کا کوئی نشان تک باقی نہیں رہتا۔ ایلیکس اور بیتو کے کلینک میں اس علاج کا ہم نے عملی مظاہرہ تو دیکھا۔ مگر اس مریض کا مکمل علاج ہوا اور اس نے صحت پائی یا نہیں اس کے بارے میں ہم کچھ نہیں کہ سکتے۔ کیونکہ وقتی طور پر تو وہ مریض ہشاش بشاش لگ رہا تھا۔ بعد میں کیا ہوا۔ اس کی ہمیں خبر نہیں۔ البتہ ایک پاکستانی دوست امتیاز الہ کے بارے میں جانتا ہوں جو اپنی بیوی کا علاج کرانے میلا کے ایک ”نیتمہ ہیلر“ کے پاس گیا تھا اور اس علاج کے بعد اس کی بیوی مکمل طور پر صحت یاب ہو گئی تھی۔

ہیر من پلازہ اور شومارت فنیلا کے بہت بڑے ڈپارٹمنٹل سٹور ہیں جہاں دنیا بھر کی شاپنگ کا سامان ملتا ہے اور خاصہ ستا ملتا ہے۔ درویش دوم کے جیتنے بھی شاپنگ سے فتح نکلنا ممکن ہی نہ تھا۔ چنانچہ ہم نے شاپنگ کے فرض کو ادا کرنے کے لئے سیدھا شومارت کا رخ کیا۔ دنیا کے ہر شاپنگ سنتر میں ہمہ وقت گاگوں کی بھیڑ بھاڑ ہوتی ہے۔ وہ چاہے کراچی کی طارق روڈ ہو، ملتان کا حسین آگاہی ہو، لاہور کی لبڑی مارکیٹ ہو، پنڈی کا راجہ بازار ہو یا پشاور کا باڑہ، ہمیشہ زبانہ اکھاٹہ ہی دکھائی دیتے ہیں۔ جہاں گاگوں اور دوکانداروں کا دنگل جاری رہتا ہے۔ ایسے بھیڑ بھر کے والے شاپنگ سنٹروں میں ”دل، پشوری“ کرنے والے جوانوں کی بھی کی نہیں ہوتی جو بھیڑ سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے بھرپور جسموں سے مکراتے ہیں اور سکون پاتے ہیں۔ جسم تو درویش دوم کا بھی بھرپور تھا مگر کسی مالی کے لال کی ہمت نہ ہوتی جو اس سے مکراتا۔ چنانچہ ہم قطار بنا کر اس کے پیچھے پیچھے چلتے چلتے جاتے اور راستہ خود بخوبی ملتا چلا جاتا تھا۔

فنیلا میں شاپنگ کے لئے کھیلوں کے کپڑے اور سامان، جرایں، بنیان، انڈرروئِر، نوٹھ پیسٹ، شینپُو، قیپسیں اور جوتے بہت معیاری اور سستے ملتے ہیں۔ چنانچہ درویش دوم نے ہر شے کو کلو کے حساب سے خریدا اور شاپنگ بیگ بھروا لئے۔ وہاں اور کبھی بہت عمده اور بہت ہی سستی ملتی ہے اور اس ظالم نے چار کلو اور کبھی خرید ڈالی۔

توندوں والے جنگل اور ان کی باور دی عسکری قوت عوام کے سیل روائی میں تکنوں کی طرح بہ گئی۔ بے رحم تاریخ نے پھر اپنا انتقام لیا۔ اور پھر ثابت کر دیا کہ آخری فتح ہمیشہ عوام کی ہوتی ہے۔ جو جو قائد، عوام کے کندھوں پر بیٹھ کر تخت طاؤس تک پہنچتا ہے۔ وہ جب جب عوام سے آنکھیں پھیرتا ہے تب تب اسے تختہ دار پر چڑھا دیا جاتا ہے۔

فنیلا کے ”نیتمہ ہیلر“ لاعلاج مریضوں کا علاج کرنے میں بڑی شہرت پا گئے ہیں۔ ان کے اس انوکھے علاج سے مستفید ہونے کے لئے دور دراز ملکوں سے لوگ آتے ہیں اور علاج کر کر واپس چلتے جاتے ہیں۔ درویش اول ہر انوکھی جگہ دیکھنے اور ہر عجیب و غریب شہرت کے شخص سے ملنے میں گہری دلچسپی رکھتا تھا۔ درحقیقت تجسس پسندی ہی تو سیاحت کی محرك ہے۔ چنانچہ اس نے میرو کے ڈرائیور اور ہمارے گائینڈ فرنیندو سے اپنی اس خواہش کا انٹھار کیا۔ فرنیندو پلک جھمکتے ہی ہمیں فلپائنیز کے میں الاقوامی شہرت یافتہ ”نیتمہ ہیلر“ ایلیکس اور بیتو (alex orbitio) کے کلینک میں لے گیا۔ دیسے تو فلپائنیز میں ہزاروں ”نیتمہ ہیلر“ ہیں مگر اس میں کوئی ڈرائیور سو کے لگ بھگ۔ ایسے ہیں جو اپنے اس انوکھے علاج پر قدرت رکھتے ہیں۔ ”نیتمہ ہیلنگ“ کا طرز علاج جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یقین اور اعتماد کا علاج ہے۔ بالکل ویسا ہی علاج جیسا کہ ہمارے ہاں پیر فقیر اور سادھو سنت لوگ کیا کرتے تھے۔ جس طرح پیروں فقیروں اور سادھو سنٹروں میں باکرامت لوگ بھی ہوتے تھے اور ڈبہ پیر بھی۔ اسی طرح ”نیتمہ ہیلروں“ میں کچھ تو واقعی اپنے اس مخصوص علاج پر گرفت رکھتے تھے اور کچھ سرا سر فراڈ ہیں۔ کامیاب ”نیتمہ ہیلروں“ کے بارے میں بھی یہ مشور ہے کہ کبھی کبھی ان کی علاج کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ جسے حاصل کرنے کے لئے انہیں دوبارہ پوجا، پاٹ، ریاضت، محنت اور مشقت کرنی پڑتی ہے۔ اس علاج کے لئے یہ امر لازمی ہے کہ مریض کا اپنے معافی پر پکا یقین اور اعتقاد ہو۔ اس کے بعد ”نیتمہ ہیلر“ کھلے ہاتھوں، بغیر اوزار مریض کی سرجری کرتا ہے۔ جسم کے جس حصے میں بیماری ہو اسے اپنے علم اور عمل کی طاقت سے کھولاتا ہے۔ ناکارہ حصے کو نکال کر جسم کو جوں کا توں بند کر دیتا

تما۔ مگر انہوں نے تو صاف صاف بتا دیا کہ یہ فیلا میں ان کی آخری رات تھی۔ اور وہ بہ صورت پاکستان لوٹ جائیں گے۔ چنانچہ میرے لئے صرف دو ہی راستے باقی تھے۔ یہ تو کہیں ان کے ساتھ واپس وطن لوٹ جاتا اور چھیڑاں اور سیر و تفریغ دونوں کو دھوڑا چھوڑ دیتا۔ اور یا پھر دونوں درویشوں کو واپس جانے دیتا اور خود اپنا سفر جاری رکھتا۔ مگر یہ ہذا ہی کٹھن فصلہ تھا۔ اور بحیثیت قوم اور فرد ہم لوگ کٹھن فصلے کرنے کے عادی نہیں۔ چنانچہ یہیں نے بھی یہ فصلہ حالات پر چھوڑ دیا۔ اور فیلا میں درویشوں کی الداعی رات کی تیاری شروع کر دی۔

میرو فیلا کا شزادہ ہے جس سے امریکن اور فلپینوں بے پناہ محبت کرتے ہیں اور میرو پاکستانیوں سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ ایپورٹ کا عملہ، ہولڈن کے مینپر، ہزاروں کی صفائی اور دروازے کھولنے والے چھوکرے، بیسی کے نایک گلبوں کی مہماں، ایشیون ڈولپمنٹ بینک کے عدیدیار، امریکی فوجی اڈوں کے افسرا اور سفارت خانے کے ڈپلو میٹس سب کے سب میرو کے چاہنے والے ہیں۔ ہالمخوص امریکن تو اس کے بغیر اپاچی دھکائی دیتے ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کوئی فلپینوں یا یوی کا انتخاب بھی کرتا ہے تو میرو سے مشورہ ضرور کرتا ہے۔ ویسے کچھ عرصے سے امریکنوں اور دوسرے یورپیں میں مشرقی یویاں کرنے کا رواج عام ہو گیا ہے۔ کیونکہ نوائیت، خدمت اور گھر گستی، مشرقی لڑکیوں کا زیور ہے۔ جو انہیں مغربی لڑکیوں میں نہیں مل سکتا۔ کیونکہ مغربی لڑکیاں تو مرونوں کی برابری کرتے کرتے اتنی دروٹکل گئی ہیں کہ اب وہاں کے مرونوں کو ان کی برابری کرنے کی ممکن چلانی پڑے گی۔ خدا کرے پاکستانی لڑکیوں کو مرونوں سے برابری کا اتنا شوق نہ بڑھ جائے کہ یہاں کے مرونوں کو مشرق بعید کا رخ کرنا پڑے۔ مگر میرو نے تو پہل کرتے ہوئے فلپینوں لڑکی سے شادی کر رکھی ہے۔ جس سے دوسرے پاکستانیوں کے لئے راستہ صاف ہو گیا ہے۔۔۔ ہاں تو بات میرو اور اس کے وسیع تعلقات کی ہو رہی تھی۔ کہ اگر وہ پرانے دیس میں امریکن کی بیساکھی بن سکتا ہے تو اپنے ملک میں کیا ہوتا؟ میرو اپنے ملک میں کچھ نہ ہوتا۔ صرف اچھا ہوتا۔ کیونکہ ہم اپنے ملک کے ہر میلٹیڈ" آدمی کو اچھا بنا دیتے ہیں۔

البتہ ایک ایک "بارو گنگ" درویش اول اور یہیں نے بھی خریدا۔ "بارو گنگ" فلپائنیز کا مردانہ قوی لباس ہے۔ جو پائیں اپیل اور کیلے کے باریک ریشوں سے بنا جاتا ہے۔ بھی آئینے والی اس بشرت کے سامنے والے حصے پر بھی نیس کڑھائی کا کام ہوتا ہے۔ ہسپانوی حکمرانوں نے فلپینوں عوام کو ان کی غلامی کا احساس دلانے کے لئے ان پر یہ پابندی عائد کر دی تھی کہ وہ نہ تو تائی پابند سکتے تھے اور نہ ہی اپنی قیص کو پتلون کے اندر ڈال سکتے تھے۔ چونکہ ہر مجبوری ایجاد کی ماں ہوتی ہے۔ اس لئے فلپینوں نے "بارو گنگ" ایجاد کیا جو حکمرانوں کی پابندی بھی پوری کرتا تھا۔ اور پہننے میں خوبصورت بھی لگتا تھا۔ اب "بارو گنگ" ان کا قوی لباس بن گیا ہے جسے ہر تقریب پر ہر جگہ پر ما جاسکتا ہے اور ہر بڑے فخر سے پہنا جاسکتا ہے۔

وہ پر ڈھلے، شاپنگ کے تھیلوں سے لدے جب ہم اپنے ہوٹل حیات ریخنسی پر تو شرم سے پانی پانی ہو گئے۔ کیونکہ جاپان ائیر لائیزر والوں نے درویش دوم کا گم شد۔ سامان ہمارے اس ہوٹل میں پہنچا دیا تھا۔ حالانکہ جب سامان کی روپورٹ لکھوائی تھی تو ہم نے فیلا مڈ ناکن ہوٹل کا پتہ دیا تھا۔ جاپان ائیر لائیزر کے عملے نے فرض شناخت کرتے ہوئے ایمانداری سے کوشش کی اور ہمیں ڈھونڈھ کر سامان ہم تک پہنچ دیا۔ جو بات باعث شرمندگی تھی وہ جاپان ائیر لائیزر اور پی آئی اے کی سروں کی تھی۔ کیونکہ پی آئی اے کے افر ہونے کے ناطے ہم یہ جانتے تھے کہ اگر پی آئی اے کے کسی مسافر کا سامان گم ہو جاتا۔ جو اکثر گم ہوتا ہے۔ تو ہمارا عملہ بھی بھی سامان پہنچانے کا تردد نہ کرتا۔ اور شاید یہ تردد اور احساس ذمہ داری ہی وہ فرق ہے۔ جس نے جاپان کو تو ترقی کے آسمان پر پہنچا دیا اور ہم ابھی تک پتیوں میں پڑے ہوئے ہیں۔

ہوٹل کے کمرے میں پہنچتے ہی دونوں درویشوں یعنی درویش اول اور درویش دوم نے فیلا سے وطن واپسی کا ڈنکا بجا دیا۔ میں ان کے اس یک طرفہ اعلان پر خاصہ پریشان ہوا کیونکہ ابھی ہماری چھیڑاں بھی باقی تھیں اور اپنے اصل پروگرام کے مطابق سیر و تفریغ کے لئے ممالک بھی کئی باقی تھے۔ اور پھر فیلا بھی تو پوری طرح نہیں دیکھا

سنچال کر بیٹھ گئے۔ یوں آسانی سے میرٹنے پر ہم باقائدہ فخر کر سکتے تھے۔ کیونکہ یہ ریستوران بھانت بھانت کے سیاحوں سے کچھ کچھ بھرا ہوا تھا۔ ہماری میز کے مخصوص دبلے پتے ویٹر نے ایک زمینہ نہایتوں کا روٹھیں تھما دیا۔ ریستوران کی دھیمی روشنی میں میتوں کا روٹھیں کیا خاک نظر آتا تھا۔ چنانچہ ہم نے اپنے لاغر سے ویٹر سے ریستوران کی خاص "ڈش" کے بارے میں مشورہ لیا۔ ریستوران کے ویٹروں سے خوارک کے بارے میں مشورہ لینے سے صرف وہ خطرے ہوتے ہیں۔ اول تو وہ اس خوارک کو منگانے کا مشورہ دیں گے جو کوئی گاہک نہ کھاتا ہو اور اس کے باسی اور شائع ہونے کا خطرہ ہو اور یا اس خوارک کا مشورہ دیں گے جو ان کو پسند ہو اور وہ خود نہ کھا سکتے ہوں۔ ان خطروں کے باوجود ہم نے اس چوزے کی رائے مانگی تو اس نے "لاپو لاپو" مچھلی کھانے کا مشورہ دیا۔ مچھلی گو بہت ہی مخصوص غذا ہے اور یہ حرام حلال کے چکر سے بھی بچی ہوئی ہے مگر غیر ملکوں میں اگر دران سفر غلط وقت پر غلط مچھلی کھالی جائے تو "فونڈ پو اسٹرنگ" کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے اور کوئی سیاح ہرگز یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ مگر درویش اول نے مچھلی کھانے کے بارے میں ایک محفوظ سا کیلنڈر یاد کر رکھا تھا۔ اس کیلنڈر کے مطابق جس انگریزی میں میں "آر" کا لفظ آتا ہے۔ مثلاً مارچ، اپریل، ستمبر، اکتوبر، غیرہ اس میں میں مچھلی کھانا بالکل محفوظ ہے۔ بشرطیکہ مچھلی تازہ ہو۔ جو یہ دنیا کے ہر خطے میں کوئی نہ کوئی مچھلی ضرور ہوتی ہے جو لذت کے لئے بہت مشہور ہو۔ مثلاً دریائے راوی کا کھا واقعی بہت لذیذ مچھلی ہے۔ بالخصوص کھا اگر ہمارے دوستے منور میر کے ہاتھ کا پکا ہو تو وہ کشتہ بن جاتا ہے۔ شاید اسی لئے منور میر قریبی دوستوں میں کچھ کے نام سے مشور ہے۔ سندھ کی پلا مچھلی بھی لذت میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ مگر اس مچھلی کا لطف اٹھانے کے لئے خلوص اور تحمل سے دھیرے دھیرے کائیں نکالنے پڑتے ہیں۔ اگر جلد بازی کی جائے تو یقیناً کائنات حلق میں امک جاتا ہے۔ درحقیقت صوفیوں اور سنگیتوں والی سندھ کی سر زمین کا یہی مزاج ہے۔ کہ ہاں کے باسی پیار اور محبت پر جان پچھاوار کر دیتے ہیں۔ مگر نفترت کا جواب اس شدت سے دیتے ہیں کہ وہ پلا مچھلی کے کائیں کی طرح حلق

ہم تینوں درویشوں نے اپنے اس سفر کی آخری رات یکساں لباس یعنی "بادرنگ" پہنے اور رات کی واردات پر نکل پڑے۔ "بادرنگ" گوہت ہی خوبصورت لباس ہے مگر چوتا صرف ان جسموں پر ہے جو قدرے بھر پور ہوں۔ درویش اول پر تو وہ لباس خوب بجا البتہ دروش دوم اور میں اس لباس میں خاصے چند لگ رہے تھے۔ اس کے جسم پر "بادرنگ" یوں ٹھنسا ہوا تھا کہ اسے اپنی ہر ہر سانس پر بٹن ٹوٹنے کا خطرہ لاحق تھا اور ہر میرے جسم پر یہ لباس بینگر کی طرح لٹکا ہوا تھا۔ ہوش کی لابی میں ہر شخص ہمیں یوں دیکھ رہا تھا گویا ہم نے سرے سے کچھ پہننا ہی نہ ہو۔ اس حالت میں گھومنا پھرنا تو ہمارے لئے ناممکن تھا۔ درویش اول نے ہماری حجامت کا احساس کرتے ہوئے ہمیں بتایا کہ "پیقوفو اور جا کر اپنے "بادرنگ" بدلتے آؤ۔ افراحتی میں تم لوگوں نے ایک دوسرے کے "بادرنگ" پن لئے ہیں" واقعی اس کی بات بچی تھی۔ جو نبی ہم نے "بادرنگ" بدلتے تو اس کی جان میں جان آئی۔ اور میرے جسم پر "بادرنگ" فٹ آگیا۔ اور ہم دونوں بھی درویش اول کی طرح اپنے خاصے انسان دکھائی دینے لگے۔

میو سے ملاتا تو میسی کے ایک نائیٹ کلب میں ہونا تھی۔ جس میں ابھی خاصی دیر تھی۔ چنانچہ ہم لوگوں نے اپنے ہوشیاری کے قریب رودخانی بلیوارڈ کے نائیٹ کلبوں میں جھانکا تانی کا فیصلہ کیا۔ یہاں کے نائٹ کلب "ڈسکو" مساج پارلر اور ریستوران میسی کے مقابلے میں خاصے منگے ہیں۔ مگر یہاں کی سروس کا شینڈرڈ بھی ہاں کی نسبت بہتر ہے۔ کہ یہاں کے کلبوں میں ڈائنس کرنے والی لوگیاں اکٹھ فیشن مائل اور ہلکی چکلی ایکٹر میں ہوتی ہیں جب کہ ہاں صرف وہ نو خیز لوگیاں ہوتی ہیں جو فلپائنیز کے پسمندہ علاقوں سے روزی کی تلاش میں میسلا پہنچتی ہیں۔ اس بلیوارڈ پر مڑگشی کرتے کرتے جو زفین ریستوران کے سامنے سے گزر ہوا تو میں نے درویشوں کو مشورہ دیا کہ کیوں نہ پسلے پیٹ پوچا کر لی جائے کیونکہ فاتح مسٹی میں عیاشی ہرگز رنگ نہیں دکھاتی۔ حریت کی بات ہے کہ اس سفر میں پہلی مرتبہ وہ دنوں بلا حیل و جمعت میری بات مان گئے۔ اور ہم تینوں جو زفین ریستوران میں میز

انسانی تاریخ میں پہلے کبھی نہیں ہوئی۔ اس جنسی تجارت کی فوج کا سرا سونی صد امریکنوں کو جاتا ہے کیونکہ جس ملک میں بھی امریکی فوجوں نے اپنی چھاؤنیاں ڈالی ہیں۔ انہوں نے سب سے اول اس ملک کی حیا اور آبرو پر چاند ماری کی ہے۔ کوریا، فلپائنز، تائیوان، جاپان، ویتنام اور تھائی لینڈ ایسے ممالک ہیں جن کی نسلوں پر امریکی فوجیوں کی جنسی یلغار کے بد نمائشان تا قیامت ثبت رہیں گے۔ اب امریکنوں کی زد میں عربوں کی آبرو ہے۔ اپنے بے انتہا پیرو ڈالر کے مل بوتے پر غریب ملکوں میں جا کر آبرو ریزی کرنے والے عرب، اپنی چار دیواری کا دفاع کرنے والے امریکن فوجیوں سے اسی چار دیواری کے اندر سمی حیا کو کیسے بچائیں گے یہ دیکھنا ہو گا! فائیر ہاؤس، پاپے لائن، نیو بکاک، سیکس سینٹل، ڈیشنگ گرل اور نہ جانے کس کس نام کے ڈسکو بار دیکھتے رکھتے، دلالوں نے آنکھ چراتے، دربانوں سے بازو چھڑاتے اور بیباک بیبیوں سے اپنے نئے نویلے "باروگ" بچاتے ہم روڈ ہاؤس ڈسکو بار میں پہنچے۔ اس ڈسکو کا مالک امریکن، مینچر آسٹریلین اور مال یعنی لڑکیاں سب کی سب فلپینیوں ہیں۔ اسی ڈسکو میں میرو نے ہمیں ملنے کا نامم دیا تھا۔ دھیمی روشنی سے کچھ سمجھوتہ ہوا تو ہم نے دیکھا کہ اس ڈسکو میں تو پاکستانیوں کا جمعہ بازار سجا ہوا تھا۔ ہر پاکستانی کے پلو میں ایک ایک فلپینیوں حور۔ گویا جیتے جی، دنیا میں ہی ان فرزندان اسلام نے جنت کا ایڈوانس لے لیا ہو۔ ہماری آمد سے بے خبر ہمارا میزبان میرو حوروں کی جامہ حلاشی میں الجھا ہوا تھا۔ قریب ہی ایک اونٹ سالہ بیباکستانی جھوم رہا تھا جس نے ایک ہاتھ میں ڈیڑھ فٹ لمبا دارو کا گلاس تھام رکھا تھا اور دوسرا جاپ بغل میں ایک پانچ فٹ لمبی حور دیا رکھی تھی۔ ایک اور پاکستانی موصوف نے حوروں کے جھرمٹ میں بھی سر پر ہیلٹ پن رکھی تھی۔ ایک آدھ حور تو اس چکیلی ہیلٹ پر باقاعدہ ہاتھ پھیر رہی تھی۔ موت کے کنویں میں موڑ سائیکل چلانے والوں کو حفاظتی ہیلٹ پنے تو ہم نے دیکھا تھا۔ مگر ڈسکو بار میں ہیلٹ پنے والا یہ پلا ٹھنچ تھا جو ہماری نظر سے گزرا۔ شیخ پر بھی ایک پاکستانی نے ہی رنگ جما رکھا تھا۔ سیاہ رنگ، شلوار قیص میں ملبوس، وہ پیٹا نما بندہ، نیم برمنہ ڈانسروں کے ہمراہ ناج

میں انک کر رہا جاتا ہے۔ چونکہ اسلام آباد کے ایری کنڈیش ایوانوں میں بیٹھ کر تقدیروں کے فیصلے کرنے والے سندھ کے مراجع سے نادر اتفاق ہیں۔ یقیناً اسی لئے پیار کا وہ گواہ نفرتوں کا مرکز بن گیا ہے۔

ہاں تو بات "لپو لپو" مچھلی کی ہو رہی تھی۔ جسے کھانا درویش اول کے کیلئے مطابق محفوظ تھا۔ چنانچہ ہم نے اس مچھلی کا آرڈر دے دیا۔ ہمارا لا گرسا و پیر جنوبی فلپائنز کے جزیرے مندا ناؤ کا رہنے والا مسلمان تھا۔ "باروگ" کے باوجود خدا بخروہ کیسے یہ اندازہ لگا گیا کہ ہم لوگ کسی مسلم ملک کے باشدے ہیں۔ اور جب درویش دوم نے اسے بتایا کہ ہم پاکستانی مسلمان ہیں تو اس کی مسکراہوں میں بھی اضافہ ہو گیا اور سرو سس بھی بست بستر ہو گئی۔ جب وہ ہمارا کوکا کولا کا آرڈر لے کر آیا تو خالی بو تلیں رکھنے کے لئے لکڑی کا ایک ڈالا بھی لے آیا۔ میلا میں اکثر جگنوں پر یہ رواج ہے کہ جب گاہک بیرون غیرہ پینے پہنچتے ہیں تو ہو تلیں والے ایک ڈالا بھی ساتھ رکھ دیتے ہیں تاکہ گاہک خالی بو تلیں اس ڈالے میں رکھتے جائیں اور یوں مل چکتے وقت کوئی غلط فہمی نہ ہو سکے۔ کپیورڈ ماغ درویش دوم کے ہوتے ہوئے ہمارے مل میں تو کسی قسم کی غلط فہمی کی منجاٹیشیں ہی نہ تھی۔ پھر ہم نے تو پینے ہی صرف تین کوکا کولا تھے۔ جن کی بو تلیں ہم نے مضبوطی سے تھام رکھی تھیں۔ رہی "لپو لپو" مچھلی تو اس سے ہمارے ویٹرنے اس ہنرمندی سے کائیں الگ کئے کہ ہم آنکھ بند کر کے وہ لنڈیز مچھلی کھا گئے۔

حسب وعدہ پورے نوبجے ہم میمنی پہنچنے تو اس وقت میمنی کی رونقیں پورے شباب پر تھیں۔ سڑک کے دونوں جانب ڈسکو بار ہیں۔ اور سیکنڈوں ڈسکو بار ہیں۔ جن کے رنگ برنگ، جلتے بمحنت "نیو ان سائیں" نمائشی بر قی جھارلریں، باور دی دربان اور را گکروں کو بے دردی سے ڈسکو کے اندر کھیچتے بے دردی نیساں، پھر سیاحوں کے جھنچتے اور ان جھموں کے ارد گرد منڈلاتے دلال۔ بکاک کی پیٹ پاؤ نگ روڈ کے علاوہ میں نے ایسا جسم، جس اور جوانی کا بازار کیسی نہیں دیکھا۔ جسم، جس اور جوانی کی تجارت تو زمانہ قسم سے ہوتی آتی ہے۔ مگر میلا اور بکاک جیسی کھلی نیلا می شاید

- حقیقت میں توجہ وہ بند ہوتے ہیں تو ان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں تاکہ صفائی بھی کی جاسکے اور دھوئیں کی گھنٹن بھی دور ہو سکے۔ دوپر ڈھلے ان باروں میں ہمیں آور (happy hour) یعنی خوبصورت لمحے شروع ہو جاتے ہیں۔ جو شام ڈھلے تک جاری رہتے ہیں۔ ان اوقات میں گاکبوں کو ہر شے آدمی قیمت پر ملتی ہے کیونکہ ”ہمیں آور“ کے دوران ان گاکبوں میں ناچنے والی لڑکیاں بھی یہ کام ”پارٹ نائم“ کرتی ہیں اور زیادہ تر گاہک بھی ایسے ہوتے ہیں جو دفتروں سے آنکھ بچا کر نکلتے ہیں اور تھوڑی دیر عیاشی کر کے اپنے اپنے گھروں کو شریفانہ وقت میں لوٹ جاتے ہیں۔ اس ”شارٹ نائم“ عیاشی والے لوگوں کی سولت کے لئے اس علاقے میں درجنوں ”لوڈ ہوٹل“ (love hotel) ہیں۔ جہاں کمرے دونوں کی بجائے گھنٹوں کے لئے کرائے پر ملتے ہیں۔ جو نبی رات اپنا سیاہ دامن پھیلاتی ہے تو یہاں کے گاکبوں کا کاروبار اپنے معقول پر آجاتا ہے۔ فصلی بیڑے غائب ہو جاتے ہیں اور پھر پوہ پھٹنے تک صرف انی لوگوں کا راج ہوتا ہے جو اس جنسی کاروبار کو دل و جان سے چاہتے ہیں۔ ان گاکبوں کی ”گو گو“ ڈانسر فلپائنیز کے دور دراز پسمندہ جزیروں سے میلا پہنچتی ہیں اور اپنے حسن، جسم اور جوانی کے بل بوتے پر اسی طرح شرت اور دولت حاصل کرنا چاہتی ہیں جس طرح برسوں پلے المدار کوس نے پائی۔ المالکی کمالی سندریلا کی طسمی داستان سے ملتی جلتی ہے۔ ۱۹۵۳ء میں وہ بھی (Leyte) لیٹے کے جزیرے سے صرف حسن اور جوانی کی پونچی لے کر میلا پہنچتی تھی۔ تو اس کے بے پناہ حسن نے میلا کو اپنی پیٹ میں لے لیا اور وہاں کی ملکہ حسن قرار پائی۔ نوجوان کانگریس میں، فرست مار کوس نے ملکہ حسن کو اپنی ملکہ بنا لیا۔ کچھ برس بعد جب مار کوس فلپائنیز کا صدر بنا تو پسمندہ جزیرے سے آئے والی غریب لڑکی فلپائنیز کی خاتون اول بن گئی۔ اور پھر میں (۲۰) برس تک اس نے اسی طرح فلپائنیز پر راج کیا۔ جس طرح ملکہ نور جہاں نے مغل شہنشاہ جہانگیر کے دور میں ہندوستان پر راج کیا تھا۔ ان کے دور میں ملک غریب رہا اور عوام فاقہ مست رہے گر املا نے غربت سے ایسی آنکھیں پھیریں کہ پھر پیچھے مڑ کر نہ دیکھا اور ۱۹۸۶ء میں جب انہیں جلاوطن کیا گیا تو ان کے محل سے سینکڑوں قیمتی

رہا تھا۔ گوہر تان پر وہی اوٹ پنگل بھنگڑا ناج رہا تھا۔ اس نفسانی کے عالم میں ہمارا کس کو ہوش تھا۔ مگر جو نبی میرو کی نظر ہم پر پڑی تو اس نے ایسا خوش آمدیدی نعروہ لگایا کہ لمحہ بھر کے لئے تو ڈسکو بار میں خاموشی چھاگئی اور تعارفوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ اب تک تو ہماری آنکھیں بھی مدھم روشنی سے پوری طرح مانوس ہو چکی تھیں۔ ہیئت وائلے صاحب سے تعارف ہوا تو وہ اکشاف ہوئے۔ اول تو انہوں نے سر پر ہیلمٹ نہیں پہنی ہوئی تھی۔ بلکہ وہ چیلی کی اپنی شنڈ تھی۔ جس پر وہ باقاعدہ تیل مالش کرواتے تھے۔ ان سے واقفیت ہونے کے باوجود بارہا میرا دل چالا کہ ان کی شنڈ پر تھاپ دے ماروں اور کبوں۔ گنجو عیش تیری کھوپڑی میں تیل ۔۔۔۔۔ دوسرا یہ کہ ان کا نام زاہد ہے اور وہ یقیناً دنیا کا پہلا زاہد تھا جو کھلے بندوں شراب پیتا تھا۔ یہ کماوت مشور ہے کہ برا آدمی ہر وہ کام کھلے بندوں کر گرزا تھے بھلا آدمی جس کی خواہش تو رکھتا ہے مگر کرنیں پاتا۔ زاہد کی اس صداقت سے میں بہت متاثر ہوا۔ ادھر درویش اول تو جھپٹ کراس سے بغل گیر ہی ہو گیا۔ خدا جری یہ رچکھ بچھہ دانستہ تھا یا اتفاقاً کہ یہ دونوں اتحادوں نیں دیر تک بچھہ ڈالے اپنے پرانے کالج کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ حالانکہ دونوں جانتے تھے کہ ان دونوں کے بچھے میں زاہد کے پہلو میں بیٹھی نیم برہنہ حور بھی ہے۔ میں نے بھی میرو کو جذباتی بچھہ ڈالا مگر بد قسمتی سے ہم دونوں کے بیچ نہ کوئی حور نہ لگو۔۔۔۔۔ شتر منغ محبوب سرور سے بھی ملاقات ہوئی۔ اس ظالم نے اس زور سے بچھہ ملایا کہ میری انگلیاں بے جان ہو گئیں۔ موصوف کسی امریکن آنکل کپنی میں بہت بڑے افراد تھے اور یہ اونچا عمدہ اسے اپنی دراز قاتمی کی وجہ سے نہیں بلکہ ہنرمندی کے سبب ملا تھا۔ اسی اثناء سچ پر بھنگڑا ڈالنے والا پہنچا بھی ملاقات کے لئے پہنچ گیا۔ خواجه صاحب دن بھر تو گلی گھوم، قالیں پیچتے تھے اور رات میں ڈسکو باروں میں جھوم جھوم بھنگڑا ڈالتے تھے۔ صدیوں سے میلا میں مقیم تھے۔ اور واپس لاہور لوٹنے کا ارادہ بھی نہیں رکھتے تھے۔ میلا کے ڈسکو بار چوبیں گھنٹوں میں صرف چند گھنٹوں کے لئے ہی بند ہوتے ہیں

اشیاء کے علاوہ دو ہزار جو توں کے جوڑے بھی ملے جو الٹانے اٹلی اور فرانس سے منگا رکھے تھے۔

میرے بڑا ہی فراغد میزبان ہے۔ اس کی میربانی میں کلب کی ہر شے شامل تھی۔ رہے ہم پاکستانی تو ہم تو ہیں ہی کھلے دل کے مہمان۔ یعنی مفت کے گناہ بھی نہیں چھوڑتے۔ شراب اور شباب کی تو کھلی چھٹی میرے دے رکھی تھی۔ مگر ہم تو اس فکر میں تھے کہ کسی صورت پورا ڈسکو بار ہی اکھاڑ کر پاکستان لے جائیں۔ چنانچہ درویش اول نے حسب عادت ایک مماسین سے میلا میں ڈسکو بار کھونے کی رام کمانی چھیڑ دی۔ یہ مماسین ہر ڈسکو بار اور نائنٹ کلب میں ہوتی ہیں۔ جو جوانی میں تو ڈانسر ہی ہوتی ہیں مگر رینائڑ ہونے پر دوسرا ”گو گو“ ڈانسروں کو کنٹول بھی کرتی ہیں اور ”ٹرین“ بھی کرتی ہیں۔ چونکہ وہ ڈانسروں کی اچھی بڑی خصلت سے بخوبی واقف ہوتی ہیں۔ اس نے خزانت گاہک بڑی کے انتخاب میں ہیشہ مماسین کا مشورہ لیتے ہیں۔ شاند اسی لئے درویش اول نے اس مماسین سے ناط جوڑا تھا۔ پوہ پھٹے تک ”روڑ ہاؤس“ میں پاکستانیوں کا اکھاڑہ جما رہا اور یوں ناریوں کے جھرمٹ میں درویشوں نے اپنے سفر کی آخری رات گزاری۔

